خدا اور محبت

ہاشم ندیم



فہرست

☆☆☆

پیش لفظ

سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ محبت کو آپ بیتی کیوں کہتے ہیں۔ محبت تو جگ بیتی ہے۔ دنیا کا وہ کون سا فرد ہے جو اس تجربے سے نہیں گزرا ہوگا؟ شرط صرف تسلیم کرنے کے سچ یا انکار کرنے کی منافقت کی ہے۔ مَیں نے محبت اور مذہب کو جس طرح خود پر وارد ہوتا محسوس کیا، اُسے اِن صفحات پر لفظوں کی صورت میں بکھیر دیا۔ محبت اور مذہب کی جنگ تو میرے دل نے لڑی اور میری روح نے جھیلی ہے، لیکن جیت مذہب کی ہوئی یا محبت کی۔۔۔۔ اس کا فیصلہ مَیں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ مقصد محبت یا مذہب میں سے کسی بھی ایک کی برتری ثابت کرنا کبھی نہیں رہا۔ بس کچھ سوال جواب چاہتے تھے۔ لیکن مذہب اور محبت کی اس تکرار میں کچھ نئے سوال جنم لیتے نظر آرہے ہیں۔ سو میری گزارش ہے کہ اس کتاب کو صرف وہی لوگ پڑھیں جو زندگی میں نئے سوالوں کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ جواب البتہ فرض نہیں ہے۔

ہاشم ندیم

پہلی بارش

وہ شاید ہوائی جہاز کے پہیوں کی رن وے سے رگڑ کھانے کی آواز تھی جس سے میری کچی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ جہاز لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اب دھیرے دھیرے رن وے پر چلتا ہوا پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ رہا تھا ائیر ہوسٹس کے اعلان کے مطابق لندن کا مقامی وقت صبح چھ بجے کا تھا۔

لندن شہر ایک ملگجے سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا رات بھر بارش ہوتی رہی ہے، ہلکی ہلکی سی پُھوار اب بھی میری سیٹ کی ونڈ اسکرین پر ارتعاش بکھیر رہی تھی، یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں۔۔۔۔ اور کبھی کسی کے من کو ہر لمحہ جل تھل کیے رکھتی ہیں، لیکن باہر والوں کو اس کی خبر بھی نہیں ہو پاتی۔۔۔۔ لندن کی یہ پہلی بارش بھی کچھ ایسی ہی تھی جس نے میرے وجود کو تو باہر سے بھگو دیا لیکن میرے اندر کی پیاس اب بھی میرے حلق میں کانٹے چبھو رہی تھی۔

جہاز اپنے مقررہ پارکنگ اسٹینڈ پر لگی ٹیوب سے جڑ چکا تھا اور مسافر جمائیاں لیتے ہوئے ایک ایک کر کے ٹیوب کے ذریعے ٹرمینل پر اُتر رہے تھے۔ جب تک مَیں لاؤنج میں پہنچا تب تک اُفق سے صبح کی ہلکی سی سفیدی جھانکنے لگی تھی، لیکن کالے گھنے بادلوں اور مسلسل بوندا باندی کی وجہ سے لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے باہر اب بھی کسی اداس شام کا سا زردی مائل پیلا اندھیرا باقی تھا۔

مَیں، حماد امجد، پاکستان کے معروف تاجر خاندان کا چشم و چراغ کہ جس کے آباؤ اجداد پاکستان بننے سے پہلے اور پاکستان بننے کے بعد بھی، انتہائی اہم حکومتی عہدوں پر فائز

رہ چکے تھے۔ تجارت جس کے گھر کی باندی ہے اور ملک کے اہم سرکاری عمال جس کے گھر شام کی چائے پر طلب کیا جانا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ وہ حماد امجد آج لندن کی اس بھیگتی صبح میں تنہا اور اداس ہیتھرو ائرپورٹ کے آمد لاؤنج میں کھڑا تھا، کہنے کو تو میری لندن آمد کا مقصد یہاں کی مشہور کنگسٹن (Kingstone) یونیورسٹی کے شعبۂ معاشیات سے اعلیٰ تعلیم کی دو سالہ ڈگری لینا تھا، لیکن میں خود جانتا تھا کہ یہ صرف ایک بہانہ تھا، خود اپنی ذات سے فرار ڈھونڈنے کا ایک بہانہ۔ میں خود کو اس شہر کی گہما گہمی میں اس قدر ملوث کر دینا چاہتا تھا کہ مجھے پل بھر بھی خود اپنے آپ کے ساتھ تنہا گزارنے کا موقع نہ مل پائے۔ میری ذہنی حالت ایسی تھی کہ میں دوسروں کے ناگوار وجود کو بھی جھیلنے کے لیے تیار تھا لیکن خود اپنا سامنا لمحے بھر کو بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ انسان بھی کتنا مجبور اور لاچار ہے۔ باہر آس پاس لگے بھی آئینے پھوڑ بھی ڈالے تب بھی اپنے اندر لگے آئینے کا سامنا ہر دم لازمی ہوتا ہے۔

جب تک میں کسٹم اور دیگر معمول کی کارروائی سے فارغ ہو کر ٹرمینل سے باہر پہنچا تب تک باہر کی خنک ہوا میں برف کے اکا دکا ستارہ نما گالے شامل ہو چکے تھے۔ کھلی فضا میں پہلا قدم رکھتے ہی سردی کی ایک شدید لہر نے میرے سارے وجود کو جھنجھنا سا دیا۔ بے اختیار میرے ہاتھ میرے اور کوٹ کے کالر کی طرف بڑھ گئے اور میں نے خود کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ سردی چاہے جتنی بھی شدید کیوں نہ ہو، اس کی پہلی لہر آپ کے اندر تازگی کا ایک احساس ضرور بیدار کر دیتی ہے۔ اس ٹھنڈے ہوا کے پہلے جھونکے نے میرے اندر بھی تمام احساسات کو جگا سا دیا تھا۔ میں نے اپنے بچپن کے لنگوٹیے دوست کامران کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن میری توقع کے مطابق اس کا دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

پہلے تو جی میں آیا کہ سامنے پارکنگ اسٹینڈ میں کھڑی ٹیکسی لے کر خود ہی اس کے فلیٹ پر پہنچ جاؤں۔ میں لندن پہلے بھی کئی مرتبہ آ چکا تھا اور اس شہر کے در و دیوار میرے لیے کبھی اجنبی نہیں رہے تھے۔ لیکن پھر جانے کیا سوچ کر میں ائیرپورٹ ٹرمینل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس گھسیٹتا، دور خشک گھاس کے ایک بڑے سے ویران قطعے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر لگائے گئے لکڑی کے خوبصورت بنچوں کی ایک قطار سی موجود تھی۔

میں نے یہیں بیٹھ کر کامران کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہوا میں برف کے گالوں کی آمیزش بڑھ رہی تھی اور جب تک میں اپنے منتخب کردہ بنچ تک پہنچا تب تک باقاعدہ برف باری شروع ہو چکی تھی۔ مجھے یاد ہے بچپن میں، میں اور کامران شام کو آسمان پر برف کے مخصوص دودھیا سفید بادل دیکھ کر رات بھر اپنے اپنے گھر میں بستروں میں دبکے، برف گرنے کی دُعائیں کیا کرتے تھے اور صبح جب آسمان سے برف کے ستارے گرتے دیکھتے اور شہر کو برف کی سفید چادر میں لپٹا دیکھتے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہتا۔ گھر والے ہمیں ڈھونڈتے ہی رہ جاتے اور ہم کہیں دور آتے جاتے راہ گیروں پر چھپ کر برف کے گولے برسانے میں مصروف رہتے۔ سوچتا ہوں بچپن کا وہ دسمبر اتنی جلدی کیوں بیت جاتا ہے اور جوانی کی یہ کڑی دھوپ ہے کہ جیسے صدیوں سے سر پر تنی ہوئی ہے اک ذرا بھی سرکتی نہیں۔

میں جس جگہ بیٹھا ہوا تھا زمین کا وہ ٹکڑا عام سطح سے کچھ بلند تھا اس لیے دور سے لندن شہر کی اونچی لیکن قدیم عمارتوں کی جھلک یہاں سے واضح نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں برف نے تمام شہر کو پوری طرح سے ڈھک لیا۔ خود مجھے بھی دور سے کوئی دیکھتا تو شاید برف سے بنا اک مجسمہ ہی سمجھتا۔ کامران کا ابھی تک کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ ہمیشہ کا لاپرواہ، اور صبح جلدی اٹھنے سے تو ہم دونوں کی جیسے جان ہی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے، ہم دونوں سالانہ امتحانات میں بھی بمشکل پرچے بٹنے کے بعد ہی کلاس روم میں پہنچتے تھے۔ بچپن یونہی ہنستے کھیلتے گزر گیا لیکن پھر اچانک کامران کے گھریلو حالات نے پلٹا کھایا، ماں باپ ایک ٹریفک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے، گھر میں کامران اکیلا رہ گیا کیونکہ اس کی اکلوتی بڑی بہن پہلے ہی بیاہ کر اپنے گھر سدھار چکی تھی۔ باپ کی موت کے بعد کامران کو پتہ چلا کہ اس کے باپ نے قرضوں کا بے تحاشا بوجھ اس کے لیے ورثے میں چھوڑ رکھا ہے۔ قرض خواہوں کے مطالبات بڑھتے گئے اور آخر کار اسے مجبوراً اپنا آبائی گھر اور بچی کچھی جائیداد بیچ کر لندن شفٹ ہونا پڑا۔ قرض چکانے کے بعد جو کچھ بچا اس سے کامران نے یہاں ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ کھول لیا تھا اور اب اس کی گزر بسر مناسب انداز سے ہو جاتی تھی۔ اور اب تو وہ مکمل اسی شہر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ دراصل اسے لندن ہمیشہ سے ہی بہت پسند

تھا۔ شاید ہم دونوں کے اندر ایک بے حد قدیم روح بستی تھی۔ کیونکہ قدامت پسندی اور اُداسی لندن شہر کا ہی خاصہ ہے۔ ہر شہر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ مجھے بھی کبھی چیختے، چنگھاڑتے شہر اچھے نہیں لگے۔ گرم، حبس زدہ اور بے چین۔۔۔۔ جیسے ہر لمحہ کچھ کھو جانے کا احساس دل کو جکڑے رکھے، مجھے سرد اور ٹھنڈے مزاج کے لوگ اور شہر ہمیشہ سے متاثر کرتے تھے، خاموش اور پُرسکون، انسان کا ہر غم، ہر دکھ اپنے اندر سمیٹ لینے والے شہر، لندن بھی انہی شہروں میں سے ایک تھا۔

میرے سامنے سے ایک نوجوان جوڑا ہنستے ہوئے گزرا، لڑکی نے غور سے میری جانب دیکھا، اُس کے رخسار سردی سے سُرخ انگارہ سے ہو رہے تھے اور آنکھوں میں اِک ازلی مسکراہٹ تھی۔ لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرا پڑی اور دونوں مجھے وش (Wish) کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر رکھے دوسرے بینچ پر جا کر بیٹھ گئے اور راز و نیاز میں مصروف ہو گئے۔ دونوں کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ صبح سویرے جاگنگ (Joging) وغیرہ کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ یہ موسم اور ان منچلوں کی یہ ادا، میں یہ سوچ کر مسکرا دیا۔ موسم بھی ہر انسان پر کچھ الگ ہی طور اُترتے ہیں۔ مجھے یاد ہے میرے آبائی شہر کوئٹہ میں جب رات بھر برف گرتی تھی تو صبح سویرے غریب مزدور طبقہ اپنے بال بچوں سمیت چھوٹے بڑے بیلچے اور لکڑی کے بڑے بڑے پھٹے لے کر دروازے کے سامنے سے اور چھت کے اوپر سے برف ہٹانے میں جُت جاتا۔۔۔۔ کیونکہ یہ برف ان کے کچے گھر کی چھت پر زیادہ دیر ٹکتی تو چھت کو چھلنی بنا دیتی تھی۔ ان غریبوں کی ساری سردیاں ایسے برفیلے موسم سے پناہ مانگنے میں ہی گزر جاتی تھیں۔ اور یہاں لندن میں اس برفیلی صبح میں یہ دو متوالے موسم کا لطف لینے گھر سے نکلے تھے۔ ایک ہی موسم کسی بھی دو افراد پر دو مختلف صورتوں میں کیسے وارد ہو سکتا ہے۔ موسم تو بس موسم ہی ہوتا ہے۔ اچانک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، میرے کاندھے کو کوئی زور زور سے ہلا رہا تھا۔

''اُٹھ جائیے صاحب، نارروال کا جنکشن آ گیا ہے۔''

مَیں نے چونک کر اُوپر دیکھا، کامران گرم کپڑوں میں لپٹا، صرف چہرہ باہر نکالے اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہم دونوں بغل گیر ہو گئے ''معاف کرنا میڈی یار،

کچھ دیر ہو گئی۔ لیکن تم باہر اس برف باری میں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ مَیں نے وہاں سارا ٹرمینل چھان مارا تمھاری تلاش میں۔''

میری کامران سے پورے دو سال بعد یہ پہلی ملاقات تھی۔ دو سال پہلے وہ یہیں لندن کے اسی ہیتھرو ائیرپورٹ پر مجھے آخری مرتبہ الوداع کہنے آیا تھا۔ تب زندگی کتنی حسین تھی۔ تب میں لندن صرف آوارہ گردی کرنے اور کامران کی بے تکان بکواس سننے کے لیے آتا تھا۔ بچپن کے سچے دوست بھی کسی گھنے، سایہ دار شجر کی طرح ہوتے ہیں، ان کی چھاؤں میں کتنا سکون، کتنا آرام ہوتا ہے، پل بھر کو مَیں بھی کامران کے گلے لگ کر اپنے جلتے زخموں کو بھول سا گیا تھا۔

دفعتاً اُس نے مجھے اپنے آپ سے جُدا کیا اور غور سے دیکھ کر کہنے لگا ''یار میڈی، تم کتنے کمزور لگ رہے ہو۔'' مَیں نے اپنے سوٹ کیس کا ہینڈل اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''کاش میں بھی تمھارے لیے کوئی اسی قسم کی رائے دے سکتا۔'' کامران ہنس کر ڈھٹائی سے بولا۔ ارے یار، تم تو جانتے ہو نا، بچپن سے ہی مجھ پر کھانا ذرا جلدی لگتا ہے۔ اچھا اب یہیں کھڑے رہ کر فریز ہونے کا ارادہ ہے کیا؟ گھر چلو۔ کامران نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ساتھ والے بینچ پر وہ جوڑا اَب بھی برستی برف میں دُنیا و مافیہا سے لاپرواہ ایک دوجے میں گم تھا۔ کامران نے لڑکے کو دیکھ کر ایک لمبی سی آہ بھری اور بڑبڑاتے ہُوئے اپنے آپ سے کہنے لگا ''نہ جانے یہ آج کل لندن کی گوریوں کے معیار کو کیا ہو گیا ہے۔''

کامران لمبے لمبے ڈگ بھرتا زمین پر بچھی برف کی سفید بے داغ پوشاک پر قدموں کے نشان چھوڑتا آگے بڑھ رہا تھا اور مَیں کسی معمول کی مانند اس کے نقشِ قدم طے کرتا پیچھے چلا آ رہا تھا۔ کامران کی وہی پُرانی مورس کار قریب ہی کہیں پارک تھی۔ اُس نے میرا سامان ڈکی میں رکھا اور ہم کامران کے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔

OO

پھر وہی شام

ہم گھنٹے بھر میں ہی کامران کے ساؤتھ لندن والے حصے میں موجود فلیٹ پہنچ گئے تھے۔
جب تک مَیں شاور لے کر فارغ ہوا تب تک کامران ناشتہ بنا چکا تھا مجھے کچھ خاص بھوک نہیں تھی لیکن کامران حسب معمول اپنی پُر جوش روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرنے میں کچھ زیادہ ہی محو تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد مَیں لمبی تان کر سو گیا۔ کامران بھی اپنے ریسٹورنٹ کے لیے نکل پڑا۔

شاید شام کے چار بجے ہوں گے جب میری آنکھ کسی شور سے کھل گئی کامران کا یہ فلیٹ ساؤتھ لندن کے پوش ایریا میں واقع تھا۔ یہ دراصل سُرخ اینٹوں سے بنے دو منزلہ اپارٹمنٹس کی ایک لمبی سی قطار تھی، جس میں انتہائی چوڑی سڑکوں کے درمیان یہ اپارٹمنٹس شاید آٹھ یا دس قطاروں میں بنے ہوئے تھے۔ ہر قطار میں آٹھ دو منزلہ اپارٹمنٹ اس طرح ساتھ ساتھ جڑے ہوئے تھے کہ سب مکانوں کے آگے کا باغیچہ ایک لمبی سی قطار میں سیدھا چلا گیا تھا۔ البتہ درمیان میں سب مکانوں کو علیحدہ کرنے کے لیے خوبصورت توازن سے کٹی ہوئی ہری باڑھ موجود تھی۔ ہر مکان کے باہر ایک خوبصورت سا پوسٹ بکس لگا ہوا تھا جس پر مالک مکان کا نام کندہ تھا۔ مجھے یاد تھا جب ہم چھوٹے تھے تو ڈرائنگ کی کاپی پر لکڑی کے اسی پوسٹ بکس جیسا ایک چھوٹا سا مکان ہر بچہ بناتا تھا۔ میرے کمرے کی کھڑی اپنی بالکونی سمیت پچھلی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ یہ ہلکا سا شور بھی اسی پچھلی سڑک پر بنے قطار نمبر 2 کے اپارٹمنٹس کی طرف سے آ رہا تھا۔ مَیں بالکنی میں کھلتا شیشے کا دروازہ کھول کر ٹیرس میں نکل آیا۔ برف باری تھم چکی تھی لیکن آس پاس دُور تک ہر چیز کو برف نے ڈھانپ دیا تھا، سڑک کے پار گلی کے چند بچے برف کا پتلا بنانے میں مشغول تھے، یہ شور انہی کے معصوم قہقہوں اور آپس میں تکرار کا تھا۔ ان میں سے ایک گروپ پتلے کی ناک کی جگہ گاجر لگانا چاہتا تھا جبکہ

دوسرا گروپ ناک کو لکڑی کی ایک موٹی کیل سے سنوارنا چاہتا تھا۔ بالآخر دونوں گروپوں میں گاجر پر اتفاق رائے ہو گیا اور پتلے کو ہیٹ، مفلر اور کوٹ وغیرہ بھی پہنا دیا گیا۔ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ بچوں کی اس کاوش کو رُک کر دیکھتے اور مسکرا کر آگے بڑھ جاتے۔ اب اندھیرا چھانے لگا تھا، ویسے بھی سردیوں کی شام جلد ہی اُتر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ بچوں کی ماؤں نے کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانکتے ہوئے انہیں پکارنا شروع کر دیا اور بچے ایک ایک کر کے پتلے سے رُخصت لیتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔ شاید ساری دُنیا کی مائیں اندر سے ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔ اندھیرے میں بچوں کو کھیلنے سے منع کرنے والیاں ۔۔۔۔ شام ڈھلنے سے پہلے گھر واپس لوٹ آنے کی تاکید کرنے والیاں ۔۔۔ اور بچوں کے دیر تک نہ آنے پر دروازوں، کھڑکیوں اور صحن میں کھڑے ہو کر آواز لگانے والیاں ۔۔۔

جیسے جیسے شام ہو رہی تھی، سردی کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی، سڑک کے کنارے کھڑا کافی والا ایسپریسو (Espreso) کافی کے گرما گرم مگ آتے جاتے راہ گیروں کو پیش کر رہا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتے جوڑے چلتے چلتے کچھ دیر کو رکتے اور گرم کافی حلق میں انڈیل کر آگے بڑھ جاتے۔ اس وقت بھی ایک خوبصورت نوجوان جوڑا اسٹال کے سامنے کافی پینے کے لیے رکا ہوا تھا۔ لڑکی اپنی بڑی بڑی آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے کافی کے بڑے سے مگ سے نکلتی ہوئی بھاپ کے عقب سے شرارت سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی اور باتیں کرتے ہوئے مسکرائے جا رہی تھی۔ ہم انسان بھی کس قدر ظاہر پرست، اور ظاہر پسند ہوتے ہیں۔ کافی کے مگ سے اٹھتا ہوا دھواں سب کو دکھائی دے جاتا ہے، لیکن اپنے آس پاس بستے انسانوں کے سینے سے اٹھتا ہوا دھواں سب کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اب مکمل اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑک کے کناروں پر لگے لیمپ پوسٹ جل چکے تھے۔ پھر وہی شام تھی، پھر وہی میں تھا اور پھر وہی بیتی یادوں کے مہیب سائے تھے۔ کہتے ہیں شام زوال کا وقت ہوتا ہے اور زوال صرف سورج کا ہی تو نہیں ہوتا ۔۔۔ مجھ پر تو ویسے بھی یہ وقتِ زوال بہت بھاری ثابت ہوتا تھا۔ جتنی تنہائی مَیں نے اپنی زندگی میں شام کے وقت محسوس کی ہے ۔۔۔ اتنی کسی اور پہر میں کبھی نہیں جھیلی۔

دفعتاً فلیٹ کے لاؤنج میں رکھا فون بج اُٹھا۔ دوسری طرف سے کامران کی چہکتی ہوئی

آواز سنائی دی۔ ''اے میرے اُداسیوں کے پرستان کے شہزادے۔۔۔۔ رات کے کھانے کا کیا پروگرام ہے۔ اگر باہر چلنا ہے تو تیار ہو جاؤ، مَیں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ اگر گھر پر ہی کھانا ہے تو مَیں ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ راستے سے کچھ لیتے ہوئے گھر چلے۔'' مجھے کچھ حیرت سی ہوئی ''تم نے ڈرائیور رکھ لیا ہے؟ وہ کیوں۔'' کامران کی مخصوص ہنسی کی آواز فون پر گونجی۔ ''دراصل جب مَیں اپنے کیفے کو بند کر کے نکلتا ہوں تو وہاں سے گھر تک کے راستے میں مَیں خود اپنے آپ ہی اپنا ڈرائیور ہوتا ہوں۔ دوسروں کو ڈرائیور کا بتانے میں شخصیت ذرا رُعب دار رہتی ہے۔'' میرے منہ سے اس کی شان میں کچھ الفاظ نکلے اور مَیں نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کبھی نہیں سدھر سکتے میرا گھر سے نکلنے کا موڈ نہیں ہے۔ کھانا گھر پر ہی کھائیں گے۔''

کچھ ہی دیر میں کامران رات کے کھانے کے تمام لوازمات سمیت آن موجود ہوا۔ وہ آتے ہوئے تیار کھانا ہی بازار سے لیتا آیا تھا جسے اُس نے کچھ ہی دیر میں کسی سگھڑ عورت کی طرح گرم کر کے کھانے کی میز پر لگا دیا۔ کھانے کے بعد کافی کا ایک دَور چلا اور پھر آخر کار کامران کی زبان پر وہ بات آ ہی گئی جسے میں انجانے مَیں صبح سے ہی ٹالتا چلا آ رہا تھا۔

کامران نے کافی کا ایک لمبا سا سِپ لیتے ہوئے غور سے میری جانب دیکھا ''تم اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال دو گے۔۔۔۔ ایسی اُمید مجھے تم سے ہرگز نہیں تھی میڈی۔'' میں نے دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔۔۔۔ ''جب دشمن خود مدِ مقابل کے خیمے میں آ کر فریاد کرے کہ یہی ایک جیت اِس کی زندگی کا حاصل ہے تو مجھ جیسوں کو ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں۔''

کامران کی بے چینی میرے جواب سے کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ جھنجھلا کر بولا ''مجھے تمھاری منطق آج تک سمجھ نہیں آئی۔ تم نے اس ایک لڑکی کے لیے زمانے بھر سے بغاوت مول لی تھی۔ سارے گھرانے کی مخالفت کے باوجود تم اپنی جگہ ڈٹ گئے تھے۔ کیا کچھ نہیں سہا تم نے۔ باپ نے تمھیں عاق کر ڈالا۔ ماں نے ناطہ توڑ لیا۔ گھر بار چھوٹ گیا، پھر یکا یک تم نے دست برداری کا اعلان کیسے کر دیا۔''

میرے لبوں پر کمزور سی اِک مسکراہٹ اُبھر آئی۔ ''شاید زمانے کی سختیوں نے مجھے

احساس دلا دیا کہ محبت صرف ایک بے وقوفی ہے۔ اپنے گھر کا عیش و آرام چھوڑ کر صحراؤں اور جنگلوں کی خاک چھاننے والے صرف احمق ہوتے ہیں، اور کچھ نہیں۔''

کامران صوفے سے اُٹھ کر میری جانب آیا اور میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر جھک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''مَیں تمھیں چھ سال کی عمر سے جانتا ہوں مسٹر حماد احمد رضا۔ پچھلے بیس سالوں سے ہم دونوں ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا بچپن، ہماری جوانی ایک دوسرے کے سامنے کسی آئینے کی طرح عیاں ہے۔ تمہارا شمار انہی احمقوں میں ہوتا ہے جو گھر کا نرم بستر چھوڑ کر در بدر کی تپتی ریت چھانتے پھرتے ہیں۔ اس وقت تم تھکے ہوئے ہو، جا کر سو جاؤ۔ ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔''

کامران مجھے تھپکی دیتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مَیں وہیں آرام کرسی پر کھڑکی کے سامنے بیٹھا باہر سناٹے میں درختوں کی ٹہنیوں سے، جو برف کے بوجھ سے بھاری ہو کر جھکی ہوئی تھیں برف گرنے کی مخصوص دھپ دھپ سنتا رہا۔ باہر آسمان سُرخ انگارہ سا ہو گیا تھا۔ اور یہاں اندر کمرے میں آتش دان میں جلتی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز اور دیوار پر لپکتے شعلوں کے سائے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور میرا ذہن ماضی کے دریچوں کو پھلانگتا ہُوا دو سال پہلے کی اس شام کی یادوں تک جا پہنچا تھا جب میری ایمان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

OO

محبت...... نیلا موسم

ہمارا گھرانہ شہر کے انتہائی متمول اور بااثر گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ بابا بطور کمشنر ریٹائر ہونے کے بعد باپ دادا کی وسیع و عریض زمینوں کے انتظامات سنبھالتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کبھی پکے زمین دار نہ بن سکے اور ان کے اندر چھپا ایک سخت بیوروکریٹ ان کی شخصیت پر ہمیشہ سے نمایاں اور حاوی رہا تھا۔ امی خود ایک بہت بڑے زمیں دار کی بیٹی تھیں اور ان کے اندر پڑھی لکھی جاگیردارنیوں کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ انگلش ادب میں ماسٹرز بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پایا تھا۔ ہم تین بھائی اور ایک بہن سمیت یہ خوش حال گھرانہ زندگی کی مخصوص ڈگر پر رواں دواں تھا۔ بابا کے رابطے ملک کے انتہائی اہم سیاست دانوں سے ہمہ وقت رہتے تھے اور ہمارے ڈرائنگ روم میں ہر شام بابا کی بیٹھک ملک کے موجودہ حکمران طبقے کے وزیروں سے رہتی تھی۔ مجھے بچپن سے ہمیشہ اس بات پر حیرت رہی تھی کہ ملک میں حکومتیں تو بدلتی رہتی تھیں لیکن بابا کی بیٹھک میں وہی چند مخصوص چہرے روپ بدل بدل کر موجود رہتے تھے۔ شاید بابا کی دوستی ہی ایسے سیاست دانوں سے تھی جو ہر حال میں اقتدار کے پالنے میں جھولتے رہتے تھے۔ شاید اسی لیے انہوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے سجاد اور بیٹی مدیحہ کی شادی بھی انہی حکمران خاندانوں میں کروادی تھیں۔ میری بہن مدیحہ سندھ کے ایک بہت بااثر خاندان میں بیاہی گئی تھی جو کہلاتے تو سندھ کے تھے، لیکن ان کی نئی نسل نے پاکستان کو صرف دارالحکومت سے زیادہ کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ مدیحہ بھی اسلام آباد میں ہی رہائش پذیر تھی۔ سجاد بھائی کی شادی بھی پنجاب کے امرا خاندان کی بیٹی سے ہو چکی تھی اور میری بھابھی عبرینہ کو ہر وقت اس بات کی فکر کھائے جاتی تھی کہ کہیں کسی بھی موقع پر ان کا اُونچا خاندان ہمارے خاندان سے نیچا ثابت نہ ہو جائے۔ ویسے ان کی اور سجاد بھائی کی خوب جمتی تھی، کیونکہ سجاد بھائی کو اپنے بزنس اور بیرونِ ملک دوروں سے ہی فرصت نہیں

تھی لہٰذا بھابھی اور امی خود ہی گھر کی پارٹیز اور تقریبات وغیرہ کے اہتمام میں جُتی رہتی تھیں۔

اَب رہ گئے میں یعنی حماد امجد صاحب اور مجھ سے چھوٹا اور گھر بھر کا لاڈلا عباد تو ہم دونوں ہی کو گھر کے ان ہنگاموں اور شور شرابوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے حال ہی میں ماسٹرز کیا تھا اور اب عباد بھی گریجویشن کے بعد فارغ ہو چکا تھا۔ مجھے شروع سے ہی زندگی کو باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت گزارنے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے بابا کے لاکھ کہنے کے باوجود میں ان کے کاروبار میں اب تک ان کا ہاتھ بٹانے میں اپنا دھیان نہیں لگا پایا تھا۔ اور اس بات پر بابا آج کل مجھ سے کچھ ناراض بھی رہتے تھے۔ دوسری جانب عباد تھا جو پاکستان میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اُسے ہمیشہ سے ہی باہر جا کر رہنے کا جنون تھا۔ لیکن بابا سے کوئی حتمی بات کرنے سے اس کی بھی جان جاتی تھی۔ ہمارے گھر میں آئے روز کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر پارٹی دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ ہم امیروں کے پاس خوشی منانے کے بہانے اس قدر کم کیوں ہیں۔۔۔؟ شاید کہیں پڑھی ہوئی یہ بات سچ ہی تھی کہ امیروں کا یہ خیال کہ غریب زیادہ خوش رہتے ہیں، اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ غریبوں کا یہ گمان کہ امیر ان سے زیادہ خوش ہیں۔

آج بھی ہمارے گھر میں ایک پارٹی تھی۔ بہانہ یہ تھا کہ سجاد بھائی کے اکلوتے بیٹے نے آج پہلا سپارہ ختم کر لیا تھا۔ ہم امیر گھرانوں میں دوسروں کے دیکھا دیکھی آج کل بچوں کو باقاعدہ کسی مولوی سے شام کو سپارہ پڑھوانے کا فیشن بھی زوروں پر تھا۔ یا پھر شاید اس کے پیچھے بابا کے بچپن کی سخت تربیت اور دادا کی مخصوص پرورش کا بھی ہاتھ تھا۔ انہوں نے سجاد بھائی کو باقاعدہ حکم دے کر ان کے بیٹے سَنی کے لیے کسی مولوی کا انتظام کرنے کا کہا تھا جو بچے کو شام کو آ کر قرآن کا سبق دے جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مہینے کے بیشتر دن بے چارے مولوی صاحب کو بنگلے کے گیٹ سے ہی بنا سبق دیے واپس پلٹنا پڑتا تھا کیونکہ زیادہ تر گھر میں کسی نہ کسی پارٹی یا تقریب کا ہنگامہ ہی لگا رہتا تھا۔ اَب ایسی ماڈرن پارٹیز میں بھلا ایک سیدھے سادھے مولانا ٹائپ مولوی اور اُس کی پُرانی سی سائیکل کا بھلا کیا جوڑ۔۔۔؟ خود بابا کو بھی مولوی صاحب کا یہ ننھا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، لیکن بابا کے رعب کے آگے بھلا کسی کی کب چلتی۔۔۔؟ لہٰذا بادل نخواستہ اس رسم کو نبھایا جا رہا تھا۔ جانے ہم امیر ایسی

چیزوں سے اتنی دور اور غریب ان رسومات سے اتنے قریب کیوں ہوتے ہیں۔۔۔؟ ہم مذہب کو بھی ایک رسم کی طرح نبھاتے ہیں اور غریب رسم کو بھی کسی مذہبی فریضے کی طرح نپٹاتے ہیں۔

خود میری بھی سنّی کے مولوی صاحب سے آتے جاتے ایک آدھ بار رسمی سی علیک سلیک بس راستے میں، یا پھر گھر کے مخصوص لاؤنج کے حصے میں جہاں وہ سنّی کو سبق دے رہے ہوتے تھے، ہو چکی تھی۔ مولوی علیم الدین صاحب دُبلے پتلے سے ایک سیدھے سادھے شخص تھے، جنھیں میں نے ہمیشہ سفید کپڑوں کُرتا، پاجامہ میں ملبوس ہی دیکھا تھا۔ چہرہ پُرنور، آنکھوں پر نظر کا چشمہ چُپ چاپ اور خاموش سے وضع داری ان کی چال ڈھال سے نمایاں تھی۔ ہمیشہ سر اور آنکھیں جھکا کر بات کرنے والے۔ اپنی پُرانی ریلے سائیکل پر شام چار بجے نہایت پابندی سے آن موجود ہوتے اور نوکر جہاں انہیں بٹھا دیتا وہیں چُپ چاپ خاموش بیٹھے رہتے اور سنّی کے نیچے آنے کا انتظار کرتے۔ مجھے اس بات پر بھی ہمیشہ حیرت رہی کہ سنّی جیسا شرارتی بچہ ان کے قابو میں کیسے آ گیا تھا۔ کیونکہ باقی ٹیوٹرز کی جو درگت وہ بناتا تھا۔ اس کا مظاہرہ مَیں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ لیکن خلافِ توقع مولوی صاحب کے سامنے وہ بڑا مؤدب بنا بیٹھا رہتا تھا۔ مَیں نے ایک آدھ بار آتے جاتے سنّی کو مولوی صاحب کی نظر بچا کر اُکسانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اس پر کوئی اثر ہی نہیں پڑتا تھا۔

اور شاید یہ سنّی کی ہی فرمائش تھی کہ آج کی پارٹی جو خود سنّی ہی کے پہلا پارہ ختم کرنے کے اعزاز میں منعقد کی جا رہی ہے۔ اس میں اس کے اُستاد یعنی مولوی صاحب کی شرکت لازمی تھی ورنہ اس نے گھر بھر کو دھمکی دی تھی کہ وہ خود بھی پارٹی میں نہیں آئے گا اور نہ ہی اپنی مما کے پسند کے کپڑے پہنے گا۔ امی اور بھابھی سنّی کی اس فرمائش پر کافی جذبز ہوئی تھیں۔ بھلا اس ماڈرن پارٹی میں جہاں شہر بھر کی بیگمات اپنے پالتو نما شوہروں کے ساتھ زرق برق لباسوں، نئے ڈیزائن کی جیولری سے لدی پھندی، لمبی لمبی کاروں اور عالی شان گاڑیوں میں تشریف لائیں گی، ایک لمبی سی سفید داڑھی والے اس غریب سے بزرگ کی جگہ کہاں بنتی تھی۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔۔۔ ہونہہ۔۔۔

لیکن سنّی کی ضد کے آگے آج تک کسی کی چلی ہے جو اس دن چل پاتی۔۔۔؟ آخر گھر

کی خواتین کو ہی ہار ماننا پڑی۔ لیکن اَب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ گھر کے خاص نوکروں نے کل ہی مولوی صاحب کو اس تقریب کی وجہ سے آج کوٹھی آنے سے منع کر دیا تھا لہٰذا ان کے آنے کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ سنّی کے آنسو پھر سے ٹپکنے لگ گئے تھے۔ آخر بابا کے خاص ڈرائیور شاکر سے پتہ چلا کہ اُسے مولوی صاحب کے گھر کا پتہ معلوم ہے، کیونکہ پہلے وہ بھی شہر کے اسی پُرانے محلے میں رہتا تھا جہاں مولوی علیم الدین اب تک رہائش پذیر تھے۔ طے یہ پایا کہ شاکر جا کر مولوی صاحب اور ان کی فیملی کو بھی باقاعدہ تقریب میں آنے کی دعوت دے آئے۔ سنّی کو شاید شاکر پر زیادہ اعتماد نہیں تھا لہٰذا وہ خود بھی شاکر کی گاڑی میں سوار ہو کر مولوی صاحب کو لینے چلا گیا کیونکہ اب تقریب کا وقت تو سمجھو ہو ہی چکا تھا، مولوی صاحب کے انتظار میں دیر بھی ہو چکی تھی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر پڑا سستی سے سامنے رکھے ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا جب چھوٹے (عباد) نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا۔

''ہے بگ بی، کیا نیچے آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ پارٹی شروع ہو چکی ہے۔'' عباد ہمیشہ کی طرح آج بھی شام کی پارٹی کے لیے باقاعدہ سوٹ اور میچنگ بو (Bow) میں ملبوس تھا۔ اُسے دیکھ کر میری بے ساختہ ہنسی نکل پڑی۔

''تم تو اس طرح تیار ہو کر نیچے جا رہے ہو جیسے آج ہی تمھارے رشتے کا بھی فائنل اعلان کر دیا جائے گا۔''

''عباد نے میری بات سن کر بُرا سا منہ بنایا۔'' کم آن بگ بی، آپ بھی نہ۔۔۔ یو نو آئی آل ویز ریمین ویل ڈریسڈ (You know I always remain well dressed)'' میں نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور تکیہ عباد کی طرف پھینکا۔

''خوب جانتا ہوں مَیں تمھاری اس خوش لباسی کو۔۔۔ ضرور کسی نئی محبت کے استقبال کے لیے یوں بن ٹھن کر ہال میں جا رہے ہو۔۔۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سارے شہر کی لڑکیاں کیا آشوب چشم کی بیماری سے دو چار ہیں۔۔۔!۔۔۔ ورنہ بھلا کوئی تمھاری جانب دیکھتی ہی کیوں۔۔۔''

عباد ہنسا۔''۔۔ گھر کی مرغی دال برابر۔۔۔ آپ سب گھر والے بھلا میری قدر کیا جانیں۔۔۔ بہر حال۔۔۔ اب آپ بھی دیر نہ کریں۔۔۔ کمشنر صاحب کا حکم ہے کہ

سب لوگ نیچے موجود ہونے چاہئیں۔"

مَیں اور عباد تنہائی میں بابا کو کمشنر صاحب کے نام سے پکارتے تھے۔ مَیں جھنجھلا سا گیا "۔۔۔اف۔۔۔کیا مصیبت ہے یار۔۔۔ایک بچے کی معصوم سی رسم کشائی کو اس قدر دکھاوا اور بڑھاوا دینے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں بچے روزانہ پورا قرآن ختم کرتے ہیں، حفظ کر لیتے ہیں۔ لیکن کہیں بھی یوں اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا، اور پھر ایسے موقع پر اس طرح کی پارٹی۔۔۔ مَیں تو فیڈ اپ Fed UP ہو گیا ہوں۔"

عباد سمجھانے کے انداز میں بولا "کم آن بگ بی۔۔۔ بی اے سپورٹ۔۔۔ میں جانتا ہوں یہ صرف دکھاوا ہے۔ لیکن کسی اور کی نہیں تو صرف سَنی کی خوشی کے لیے ہی آجائیں، آپ جانتے ہیں وہ آپ سے کس قدر اٹیچ ہے۔" عباد دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مَیں سَنی کی خوشی کے لیے پارٹی میں ضرور شرکت کروں گا چاہے اوپری دل سے ہی سہی۔

شاید ہماری زندگی کے نوے فیصد فیصلوں میں ایسے ہی کسی اپنے، کسی لاڈلے کا بھرم رکھنا بنیادی شرط ہوتی ہے۔ ہم بہت تھوڑی زندگی خود اپنے آپ کے لیے جی پاتے ہیں، زیادہ تر تو دوسروں کا بھرم رکھنے میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔

OO

پھر وہی محبت

شہر کی کنٹونمنٹ میں جہاں علاقے کے بڑے امراء کی کوٹھیاں کئی کئی ایکڑوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی علاقے میں دو رویہ درختوں سے ڈھکی ایک سڑک کے اختتام پر ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کی عظیم الشان حویلی آج پھر برقی قمقموں سے جھلملا رہی ہے۔ دھوپ ڈھل چکی تھی لیکن شام کے پَر ابھی پوری طرح پھیلے نہیں تھے۔ دُور سے کمشنر صاحب کی پُرانی مرسڈیز گاڑی، جو اَب زیادہ تر گھر کے کام کاج کے لیے استعمال ہوتی تھی، فراٹے بھرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ گاڑی کو گھر کا سب سے پُرانا ڈرائیور شاکر چلا رہا تھا اور سَنی میاں چہرے پر ان جانی خوشی کے تاثرات لیے یوں بیٹھے تھے جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے کر لوٹے ہوں۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر سفید چادروں میں ڈھکی، دو چھوٹی موٹی سی لڑکیاں سمٹی ہوئی بیٹھی تھیں البتہ مولوی علیم کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ گاڑی نے حویلی کے بڑے بڑے جنگلوں والے گیٹ کے سامنے پہنچنے سے پہلے ہی مخصوص انداز میں دو مرتبہ ہارن بجا دیا تھا لہٰذا آہنی جنگلوں والے گیٹ کے ساتھ ہی بنے ہوئے لکڑی کے کیبن سے دو ملازم تیزی سے نکلے اور انہوں نے گاڑی کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیا۔ کمشنر صاحب کی نیلی مرسڈیز تیزی سے گھر میں داخل ہو گئی۔

OO

جب تک میں تیار ہو کر نیچے حال میں پہنچا تب تک تقریباً سبھی مہمان آ چکے تھے۔ سَنی نے مجھے دیکھتے ہی دور سے یوں ہاتھ ہلایا جیسے وہ مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہتا ہو۔ لیکن اس وقت وہ خود سفید کرتا پاجامہ پہنے اپنے دوستوں اور کزنز وغیرہ میں اس قدر گھرا ہوا تھا کہ اس کا فوری طور پر مجھ تک پہنچنا ممکن تھا۔ عباد صاحب حسب معمول بیگمات کے ساتھ آئی ہوئی ان کی بیٹیوں اور دوسری لڑکیوں کو متاثر کرنے کی حتی الوسع کوششوں میں مصروف تھے۔ ایک

طرف بابا اور سجاد بھائی ہمیشہ کی طرح اس پارٹی میں آئے ہوئے چند بڑے ناموں کے ساتھ بزنس ڈیلز کے چکر میں لگے ہوئے تھے۔ بابا ایسے موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

ہال میں کافی چہل پہل تھی، ہر طرف جیسے رنگ ونور کی برسات ہو۔ ایک طرف امی اور عریبہ بھابھی بیگمات کو متاثر کرنے کا ہر حربہ استعمال کر رہی تھیں۔ جیولری کی باتیں تھیں۔ نئے آنے والے فیشن کی باتیں تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں فرانس یا سوئٹزرلینڈ میں گذارنے کی باتیں تھیں۔ رنگین آنچل ہر طرف لہرا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے سنی کے پہلے پارے کی رسم نہ ہو بلکہ اس کے نکاح کی تقریب ہو۔ میرے سیڑھیوں سے اُترتے اُترتے بہت سی خواب ناک نگاہوں کے سلام مجھ تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن بقول کامران میں اس معاملے میں انتہائی ناشکرا واقع ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔ مجھے محبت وغیرہ قسم کی چیزوں کا سوچ کر ہی ہنسی آجاتی تھی۔ مجھے عورت کبھی برتنے کی حد تک بھی اس طرح پسند نہیں آئی تھی جیسا کہ عام رومانوی داستانوں میں بیان کیا جاتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے بچپن سے ہی مخلوط اداروں میں تعلیم (Co-education) حاصل کی تھی۔ بچپن سے ہی میری بہترین دوست صرف لڑکیاں ہی رہی تھیں۔ میں انہی کے ساتھ بچپن میں انہی کے کھلونوں کے کمروں سے لے کر نوجوانی کے اسٹڈی رومز اور پھر جوانی میں بیڈرومز تک ساتھ ساتھ رہا تھا۔ میرے لیے اس محفل کی تمام لڑکیاں بس لڑکیاں ہی تو تھیں۔ جیسے کسی ہاسٹل میں رہتے ہوئے بہت سے کلاس فیلوز۔۔۔۔ سبھی مجھے اور میں سبھی کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ ان میں سے کئی ایک کا خاص راز دار بھی رہ چکا تھا۔ لیکن میں نہ جانے کبھی اس بات کو کیوں محسوس نہ کر پایا تھا کہ یہ سب اب بچپن اور نوجوانی سے نکل کر اس عمر میں پہنچ چکی ہیں جہاں اب کوئی ایک نامحرم ہی ان کا راز دار ہو سکتا ہے۔ یہ سب بابا کے ساتھ کے ریٹائرڈ بیوروکریٹس اور امراء کی بیٹیاں تھیں جن کے ماڈرن حُسن کے ایک دیدار کے لیے شہر اور کالج کے عام لڑکے سارا دن چھاؤنی کی سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے گزار دیتے تھے۔ لیکن میں اس حسن کے اس قدر قریب رہا تھا کہ اب میرے لیے اس کا نظارہ ایک معمول کی بات تھی۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی جیسی ہی ایک جنس کے لیے اس قدر بے تابی کا مطلب۔۔۔۔ مجھے تو زیادہ تر حسین لڑکیاں بے وقوف ہی ملی تھیں، وہی ان سب کا ایک ہی جیسا انداز، لڑکوں کے سامنے سنجیدہ

اور معتبر نظر آنے کی کوشش اور تنہائی میں آپس کی لڑکیوں سے ویسی ہی گفتگو جیسے ہم لڑکے آپس میں ان لڑکیوں کے بارے میں کرتے تھے۔

سب سے پہلے مجھے بیگم عشرت کی صاحبزادی لبنیٰ نے سیڑھیوں سے اُترتے ہی اچک لیا۔ ''اف میڈی۔۔۔ کہاں رہتے ہو آج کل۔۔۔۔۔ بے رخی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔۔۔۔''

میں نے اسے چھیڑا۔۔۔۔ ''سنا ہے حسینوں سے دور کی صاحب سلامت ہی اچھی ہوتی ہے۔'' وہ مسکرائی، ''یو ناٹی۔۔۔۔ اچھا بتاؤ اس جمعرات کو آ رہے ہو نا ہماری طرف۔ سلمیٰ کی انگیجمنٹ (Engagement) پارٹی ہے۔''

سلمیٰ لبنیٰ سے ایک سال چھوٹی بہن تھی۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''سلمیٰ کی منگنی ہو رہی ہے۔۔۔؟ لیکن اس نے تو میرے ساتھ بھی کچھ وعدے کیے تھے۔''

''لبنیٰ نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ ''تمہارے وعدوں کے انتظار میں بوڑھی ہونے کے لیے میں جو بیٹھی ہوں۔ بتاؤ نا۔۔۔۔ آؤ گے نا۔'' اتنے میں دوسری طرف سے ماریہ اور حمیرہ مختلف سمتوں سے لپکیں۔ انہیں میرا لبنیٰ کے ساتھ یوں تنہا کھڑا ہونا قطعاً پسند نہیں تھا۔ حمیرہ جانتی تھی کہ مجھے کالا لباس بہت پسند ہے لہٰذا وہ آج خصوصی طور پر سیاہ ساڑھی پہن کر آئی تھی۔ اور سچ ہے کہ اس کا گورا رنگ کالی ساڑھی میں سج بھی خوب رہا تھا۔ ماریہ حسب معمول فلیپر اور نئے انداز کی چست سی شرٹ میں ملبوس تھی۔ وہ اٹھلا کر بولی ''میڈی۔۔۔۔ تم نے یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ بس تم کل شام مجھ سے مل رہے ہو۔۔۔۔ مجھے تمہیں بہت سی باتیں بتانی ہیں۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' وہاں ذرا دور کھڑی نائلہ اور پنکی مجھے ماریہ سے باتیں کرتا دیکھ، غصے سے مجھے گھور رہی تھیں اور لوگوں کی نظر بچا کر کچھ ایسے اشارے کر رہی تھیں کہ میں جب اکیلے میں ان سے ملوں گا تب وہ میری خوب خبر لیں گی۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ سبھی لڑکیوں کے راز، ان کے گلے شکوے اور ان کی باتیں تنہائی میں ایک جیسی ہی ہوتی تھیں۔ شائد ساری دنیا کی عورتیں ایک ہی جگہ اور ایک ہی قسم کی مٹی سے بنائی گئی ہیں۔ تنہائی میں سبھی مجھ سے شکوہ کرتیں کہ پڑھائی ختم ہونے کے بعد اب میں ان پر توجہ ہی نہیں دے رہا، کسی نہ کسی بہانے میرا ہاتھ تھام لیتیں۔ مجھ سے روٹھتیں اور پھر

خود ہی من بھی جاتیں۔ سبھی کا یہ گلہ ہوتا کہ میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں ان کے لیے کیا معنی رکھتا ہوں۔۔۔۔اور یہ کہ سبھی نے میری بچپن اور لڑکپن کی یادوں کو کس قدر سینت سینت کر اور سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ سبھی کا رومان ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے اس بات پر بھی بہت حیرت ہوتی تھی کہ ان لڑکیوں کے دماغ میں بچپن کی یادیں اور بچپن کا رومان اس قدر گہرا اثر لیے ہوئے کیوں ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بچپن میں لڑکیاں وہ معصوم دوستی ہی اس لیے کرتی ہیں کہ بڑے ہو کر جوانی میں اسی دوست کو اپنے خوابوں کا شہزادہ بنالیں۔۔۔۔؟

بہرحال۔۔۔۔اس وقت میں اس رومان سے بالکل بے خبر تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کسی کا محبوب ہونا کس قدر اعزاز کی بات ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ لوگوں کا محبوب بننے میں عمریں بیت جاتی ہیں لیکن تب بھی یہ مسند کسی ایک آدھ خوش نصیب کا ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔ ہماری ساری عمر دوسروں کو اپنا محبوب بنانے میں ہی صرف ہو جاتی ہے۔ کیونکہ خود کسی کا محبوب بننا ہمارے اختیار میں ہوتا ہی کب ہے؟ یہ اعزاز تو صرف آسمان سے ہی وارد ہوتا ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ اس اعزاز کو پانے والے خود اس اعزاز، اس رتبے کی حرمت سے بے خبر ہوتے ہیں۔

میں سبھی سے ملتا ملاتا، ان نازنینوں کو چھیڑتا اور ان سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ محبت کا نیلا موسم میرے بہت قریب یوں بکھر رہا ہے جیسے وہ صدیوں سے بس میری ہی تاک میں ہو۔ اور تبھی دفعتاً میرے قدم جیسے ہال کے لکڑی سے بنے فرش پر جم سے گئے۔ میرے آس پاس کا سبھی شور، وہ نقرئی قہقہوں کا جلترنگ تھم سا گیا۔ فضا ساکت سی ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کسی خودکار ریموٹ کے ذریعے اس ساری محفل کو چند ساعتوں کے لیے جامد (Pause) کر دیا ہو۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈری سی، سہمی سی۔۔۔ بڑے سے سفید دوپٹے کی آڑھ لے کر۔۔۔ آس پاس سے گزرتے مردوں کی نظر سے بچنے کی کوشش میں اس کا سونے جیسا رنگ گلابی آمیزش سے اور بھی تپنے لگا تھا۔ ایک ساعت کے لیے اس کی گھنی کالی پلکیں اُٹھیں اور میں ہمیشہ کے لیے ان آنکھوں میں غرق ہو گیا۔ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔۔۔؟ اگر لوگ اسی کو کیوپڈ کا وار کہتے ہیں تو

اس سے زیادہ بے رحم اور سفاک وار آج تک میں نے اپنی تمام زندگی میں نہیں جھیلا تھا۔۔۔۔ جانے وہ لڑکی کون تھی۔ سفید کرتے اور تنگ پاجامے میں ملبوس۔۔۔۔اس کے نازک سے سراپے نے جیسے اُس پوری محفل کو ٹاٹ کا بنا دیا تھا۔۔۔۔اور وہ خود اس ٹاٹ میں مخمل کے ایک پیوند کی طرح لگی بیٹھی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس لڑکی کے علاوہ اس محفل میں دوسری کوئی حسین موجود نہ تھی۔ وہاں تو نازنینوں کی بھرمار تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک عشوہ طراز، نازک اندام مہہ جبینوں کا جھرمٹ موجود تھا وہاں۔۔۔۔ لیکن اس لڑکی میں جو ایک کونے میں اپنے جیسے ہی حلیے میں ملبوس ایک نسبتاً کم عمر کی لڑکی کے ساتھ چُپ چاپ خاموش سی بیٹھی تھی، جانے ایسی کیا بات تھی، وہ سر کے بالوں سے نکلی ایک لمبی سی شریر لٹ سے لے کر پاؤں میں پہنے نازک سے کھسّوں تک پورا ایک جہاں ہی تو تھی۔ آس پاس سے گزرتے مرد اور عورتیں حیرت سے ان دو لڑکیوں کو دیکھتے جو کسی بھی طرح اس پارٹی سے اور اس کے ماحول سے میل نہیں کھا رہی تھیں۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی ننھا سا ہاتھ میرے کوٹ کی آستین کھینچ رہا ہے۔ میں اپنے خیالات کی رو سے باہر نکل آیا۔ سنّی جانے کب سے مجھے آوازیں دے رہا تھا ’’چاچو۔۔۔۔میری بات تو سنیے۔۔۔۔میڈی چاچو‘‘۔۔۔۔

میں اس کی طرف متوجہ ہوا لیکن میرا دھیان اب بھی اسی لڑکی میں اٹکا ہوا تھا۔ سنّی مجھ سے کچھ ناراض تھا۔ ’’جائیے چاچو۔۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کروں گا۔ آج سب نے مجھے گفٹ دیے ہیں لیکن آپ نے ابھی تک۔۔۔۔‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر پاس پڑی میز پر بٹھا دیا۔ ’’ارے یار۔۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمھارا میڈی چاچو تمھیں آج کوئی گفٹ نہ دے۔ بولو کیا چاہیے۔ سنّی کے چہرے پر معصوم سی خوشی لہرائی اور وہ باقاعدہ سوچ میں پڑ گیا۔ ’’ہوں۔۔۔۔ نیا پلے اسٹیشن۔۔۔۔ دو جا کیز Jokies کے ساتھ۔۔۔‘‘

میں نے ہامی بھر لی۔ ’’چلو منظور ہے۔۔۔۔ کل تک تمھارے روم میں موجود ہو گا۔ اب خوش۔۔۔‘‘ سنی نے خوشی سے نعرہ لگایا، ’’اوہ چاچو۔۔۔۔ یو آر گریٹ‘‘ ’’اب میں اپنے مطلب کی بات پر آیا۔‘‘ لیکن یار۔۔۔۔ آج تمھاری پارٹی میں کچھ نئے لوگ بھی نظر آ رہے

ہیں۔تم نے تعارف بھی نہیں کروایا ان سے‘‘ میں نے دور بیٹھی دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔

’’اوہ وہ دونوں۔۔۔۔وہ تو ایمان آپی اور حیا باجی ہیں۔وہ جو ہیں نا میرے مولوی صاحب۔۔۔انہی کی بیٹیاں ہیں۔صرف میرے لیے آج یہاں آئی ہیں۔‘‘ سنی میاں بڑے فخر سے بتا رہے تھے اور میری نظر بس اُسی قیامت کے سراپے کا طواف کر رہی تھیں۔ پتہ یہ چلا کہ جب ڈرائیور شاکر سنّی کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب تو گذشتہ رات سے بخار میں تپ رہے تھے۔ان کا تقریب میں شرکت کرنا ناممکن تھا۔لیکن سنّی میاں مچل گئے کہ اگر مولوی صاحب کی طرف سے اس کی رسم کشائی کی تقریب میں کوئی شریک نہ ہوا تو سنّی وہ تقریب ہی ملتوی کروا دے گا۔دراصل سنّی پہلے بھی ڈرائیور کے ساتھ کئی مرتبہ مولوی صاحب کو ان کے گھر ڈراپ کروانے جا چکا تھا۔کبھی خراب موسم کی وجہ سے اور کبھی مولوی صاحب کی اکلوتی سائیکل کی کسی خرابی کی وجہ سے،اور جب کبھی بھی مولوی صاحب سنّی کے ساتھ کمشنر صاحب کی کسی گاڑی میں گھر آتے تو سنّی کا گھر کا بنا ہوا خاص شکنجبیں پلوائے بناء، جانے نہ دیتے۔جو خود سنّی کا بھی خاص پسندیدہ مشروب تھا۔اور یہ مشروب بنانے والی ہوتیں سنّی میاں کی ایمان آپی،یوں سنّی مولوی صاحب کے تمام گھر والوں سے خوب گھل مل چکا تھا۔مولوی صاحب کی بیوی اور بیٹیاں بھی سنّی سے بہت مانوس ہو چکی تھیں۔شاید اسی لیے اس دن سنّی کی ضد کے سامنے مولوی صاحب کو ہار ماننا ہی پڑی۔ان کی بیوی تو ایسی تقاریب میں جانے کے نام سے ہی ہول کھاتی تھی۔سو انہوں نے دبے الفاظ میں چھوٹی بیٹی حیا کو سنی کے ساتھ بھیجنے کی تجویز دی۔عام طور پر مولوی صاحب ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے لیکن جانے کیا سوچ کر انہوں نے کچھ دیر کے لیے حیا کو جانے کی اجازت دے دی۔لیکن حیا نے اکیلے جانے سے صاف منع کر دیا تب کوٹھی کا پرانا ڈرائیور شاکر جو بہت دیر سے گھر کے دروازے پر گاڑی لیے سنّی کے انتظار میں کھڑا تھا۔دروازے پر آیا اور تمام معاملے کی سن گن ملنے کے بعد اس نے بخار سے لرزتے کانپتے مولوی صاحب کو تسلی دی کہ حیا اور ایمان دونوں ہی اس کی اپنی بچیاں ہیں اور اسی کے ہاتھوں میں کھیل کر جوان ہوئیں۔اُس نے مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ دونوں بچیوں کو سنّی میاں کی

خوشی کے لیے چاہے تھوڑی دیر کو ہی سہی،تقریب میں جانے کی اجازت دے دیں۔شاکر خود انہیں رسم کشائی کے فوراً بعد واپس گھر چھوڑ دے گا۔حیا کی حد تک تو مولوی صاحب اپنے دل کو منا چکے تھے لیکن ایمان نے تو جوانی کے بعد گھر کی دہلیز سے تنہا قدم باہر نہیں دھرا تھا،جانے کس بھاری دل سے انہوں نے شاکر کی یہ تجویز مان لی۔جانے شاکر سے پُرانی محلے داری کا پاس تھا یا پھر وہ سنّی کا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے،لیکن جب تک دونوں لڑکیاں گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ نہیں گئیں وہ بے چینی سے گھر کے صحن اور باہر گلی میں کھڑی گاڑی تک کے چکر کاٹتے رہے۔اور گاڑی کے چلتے چلتے بھی انہوں نے شاکر کو کئی مرتبہ کی دھرائی ہوئی ہدایات پھر سے دوبارہ یاددہانی کے طور پر دُہرا دیں۔

ہماری زندگی میں کب،کس موڑ پر کون سا حادثہ ہماری تاک میں ہے۔یہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔میری اپنی دانست میں محبت سے بڑا کوئی اور حادثہ ایسا نہیں جو ہماری زندگیوں میں وارد ہوتا ہو۔اور ہم انسان اتنے مجبور اور لاچار ہوتے ہیں کہ ایسے ہر حادثے کا الزام لفظ’’کاش‘‘ کو ہی دیے جاتے ہیں۔کاش میں اس دن گھر پر ہی نہ ہوتا،کاش مولوی صاحب اس دن بیمار نہ ہوتے،کاش سنی انہیں لینے خود ان کے گھر نہ جاتا اور اگر چلا بھی گیا تھا تو ایمان اس کے ساتھ نہ آتی۔۔۔کاش۔۔۔کاش۔۔۔۔۔

اس کے بعد اس تقریب میں کیا ہوا۔مجھے کچھ یاد نہیں۔شاید میں اپنے ہوش وحواس ہی کھو بیٹھا تھا۔دوسری بار جب میں نے اس طرف نظریں دوڑائیں جہاں ایمان اور حیا سمٹی بیٹھی تھیں تو وہ جگہ خالی تھی۔میں نے بے چینی سے تمام محفل چھان ماری لیکن ایمان جا چکی تھی۔پتہ یہ چلا کہ شاکر چونکہ مولوی صاحب سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ مغرب کی اذان سے قبل ان دونوں کو گھر واپس پہنچا دے گا۔اس لیے ان دونوں نے تقریب کے خاتمے سے قبل ہی شاکر کو واپسی کا پیغام بھجوا دیا تھا۔اور جانے کس لمحے وہ وہاں سے چلی بھی گئیں اور میں اپنی قسمت کو کوستا ہی رہ گیا۔

لیکن جاتے جاتے وہ لڑکی جیسے میرا بہت کچھ اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔کچھ دیر پہلے تک وہ پارٹی،وہ محفل جس میں چاروں طرف رنگوں کی برسات تھی،نور کا بسیرا تھا،قہقہے تھے۔مسکراہٹیں تھیں۔۔۔۔یکا یک یوں ویران ہو گئی تھی جیسے اچانک کسی نے اس محفل سے سب

رنگ نچوڑ لیے ہوں۔ یہ من سے من کا کیسا ناطہ ہوتا ہے کہ سینکڑوں کی بھیڑ کسی ایک کی وجہ سے اپنی سی لگنے لگتی ہے۔ اور پھر یہاں تو قصہ ہی یک طرفہ تھا، جو بھی طوفان اٹھ رہے تھے وہ صرف میرے من میں تھے۔ ایمان تو اس سب سے بالکل بے خبر تھی۔ اگر لوگ جسے محبت کہتے ہیں، وہ اسی جذبے کا نام تھا جو اس وقت میرے خون کے ساتھ گردش کر رہا تھا تو کیا یہ محبت اس قدر زور آور ہو سکتی تھی کہ وہ صرف یک طرفہ ہو کر بھی کسی انسان کی زندگی کے سبھی انداز ۔۔۔ سبھی اطوار بدل کر رکھ دے۔۔۔؟

OO

لندن اُداس ہے

کہتے ہیں نیند سب سے بڑی چور ہوتی ہے، وہ انسان کی آدھی عمر چرا لیتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھ سے میری یہ چور بھی روٹھی ہوئی تھی۔

جانے رات کے کس پہر کامران نے لاؤنج میں جھانکا اور مجھے وہیں آتشدان کے پاس آرام کرسی پر آنکھیں موندھے لیٹے دیکھ کر مجھ پر کمبل ڈال گیا۔ رات یونہی ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے جانے کب بیت گئی اور اس کی جگہ صبح کے اُجالے نے لے لی۔ رات بھر برف باری کے بعد آسمان صاف ہو چکا تھا۔ کامران نے ناشتے کے دوران مجھے آفر کی کہ وہ مجھے ریسٹورنٹ جاتے ہوئے ''کنگسٹن (Kingstone)'' یونیورسٹی چھوڑتا جائے گا۔ لیکن میں نے اُسے بتایا کہ میں تنہا ہی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک گھر سے نکل جاؤں گا، وہ ریسٹورنٹ چلا جائے۔ ویسے بھی اُسے صبح جلدی پہنچ کر اپنے کاروبار کا آغاز کرنا ہوتا تھا۔ اور میرا اتنی صبح گھر سے نکلنے کا قطعی کوئی موڈ نہ تھا۔ اور پھر لندن میرے لیے کبھی اجنبی نہیں رہا تھا۔ ایک عجیب سی اُنسیت اور اپنا پن تھا میرے لیے اس شہر میں، شاید اس کی ایک وجہ اس کے موسم کی میرے آبائی شہر کوئٹہ کے موسم سے مماثلت بھی ہو سکتی تھی۔ نہ صرف موسم بلکہ پُرانے لندن میں جہاں اب تک تقسیم ہند سے پہلے وقتوں کی عمارتیں اور تعمیرات موجود تھیں ان میں سے بعض کی بناوٹ تو ہو بہو 1935ء کے زلزلے سے پہلے والے کوئٹہ کی عمارات کی طرح ہے۔ بنیادی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ کوئٹہ تقسیم ہند سے قبل خود برٹش ایمپائر کی بہت بڑی چھاؤنی رہ چکا تھا اور اسے آباد کرتے وقت انگلش ہنر کاروں نے فنِ تعمیرات میں اینٹ کا رخ، عمارت کی بیرونی اُٹھان اور طویل اور چوڑی سڑکوں کی کشادگی دیتے وقت شائد لندن ہی کو ذہن میں رکھا ہوگا۔ اور پھر صرف میرے شہر پر ہی کیا منحصر ہے ۔۔۔ تقسیم سے قبل انگریز جن علاقوں میں بھی رہا (خاص کر سرد علاقے) وہاں کی طرز تعمیر

ایک مخصوص روایت کو ہی جنم دیتی محسوس ہوتی ہے۔ وہی ٹین کے سُرخ چھت، وہی مخصوص بالکونیاں اور انگیٹھیاں، وہی ایک جیسے آتش دان اور ان پر بنے کارنس، ایک جیسے لکڑی کے بڑے بڑے دروازے جن پر انگلش کے نمبر سات کی شکل کے بڑے بڑے تختے کنندہ ہوتے تھے۔ وہی اُونچے اُونچے چھت اور ان میں بنے بڑے بڑے روشن دان جنھیں کھولنے اور بند کرنے کے لیے رسی یا ڈوری ٹنگی ہوتی تھی۔ اس لیے آج بھی اگر آپ پُرانے لندن کی گلیوں سے گزریں تو آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ برصغیر کے دور کی کسی بڑی چھاؤنی میں آ گئے ہیں۔

مَیں جب تک گھر سے نکلا تو اچھی خاصی دھوپ نکل چکی تھی۔ برف صاف کرنے والی مشین نے سڑکوں سے برف ہٹا کر کناروں پر کر دی تھی۔ برف باری کے بعد نکلنے والی دھوپ بے حد چمک دار ہوتی ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قدرت کے ان دیکھے ہاتھ نے آس پاس کی سب چیزوں پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ مخصوص رنگ کی پکی اینٹوں سے بنی سڑک تمتما سی رہی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر بھی ایک خاص سی چمک تھی۔ یہ موسم بھی ہم انسانوں کی طبیعت پر کس کس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اچھے بھلے انسان کو پل میں خوش یا اُداس کر دیتے ہیں۔ بلا کسی بھی وجہ کے، لیکن میرے لیے تو جیسے ہر موسم میں اُداسی ہی اتر آئی تھی۔ سو لندن بھی مجھے اُداس لگ رہا تھا، چمکتی دھوپ کے باوجود، آس پاس کھلے ہوئے سے چہروں کی موجودگی میں بھی ایک گہری اُداسی تھی۔

گھر سے نکل کر میں پیدل ہی تیسری گلی کے سب وے کی جانب چل پڑا۔ دھوپ کی چمک نے مجھے آنکھوں پر گہرا کالا دھوپ کا چشمہ پہننے پر مجبور کر دیا۔ کاش انسان ایسے گہرے رنگوں کے چشمے بھی بنا پاتا جو دکھوں کی آنکھوں کو خیرہ کرتی دھوپ کو بھی روک سکتے۔۔۔

گلی کے اختتام پر ایک اسپینش (Spanish) لڑکی گٹار پر کوئی دھن بجا رہی تھی۔ اس کے سامنے اسی گٹار کا بڑا سا کالا کیس Case رکھا ہوا تھا جس میں آتے جاتے لوگ چند لمحے گٹار کی دل کو چھو لینے والی دھن سننے کے بعد چند سکے ڈال کر آگے بڑھ جاتے، مانگنے کا کس قدر آبرومندانہ طریقہ تھا یہ۔ کچھ لوگ مانگتے بھی یوں ہیں کہ دینے والے کو ان کا حق لگتا ہے، اور کچھ لوگ اپنا حق بھی کچھ ایسے انداز میں وصول کرتے ہیں کہ دینے والا بھیک کی طرح

دیتا ہے۔

لڑکی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور سَر کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ وہ اس وقت گٹار پر ایک مشہور ہسپانوی گیت کی دھن بجا رہی تھی جس کے بول کچھ یوں تھے کہ ”میرے محبوب۔۔۔ اک تمھارے جانے کے بعد۔۔۔۔ ہر منظر اُداس ہے۔۔۔۔ ہر شہر ویران ہے۔“

میں نے حیرت سے اس گٹار بجانے والی لڑکی کو دیکھا۔۔۔ اُسے میرے دل کے حال کا کیسے پتہ چل گیا۔۔؟۔۔ شائد محبت کو کھو دینے کے تجربے سے گزرنے والے سبھی چہروں کی تحریر ایک سی ہی ہوتی ہے۔ میرا ہاتھ جیب میں گیا اور واپسی پر جتنے بھی سکے اس ہاتھ میں آئے، وہ سبھی مَیں نے لڑکی کے گٹار میں ڈال دیے اور خود آگے بڑھ گیا۔

سب وے میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ زمین دوز ریلوے اسٹیشن مختلف روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اور اکا دکا لوگ ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے، بھیڑ نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور یہ وقت دفتری اوقات کار کا نہ تھا۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر ایک مخصوص سی گرج کے ساتھ سب وے میں داخل ہوئی۔ خودکار دروازے کھل گئے اور ہم سب مسافر اس میں داخل ہو گئے۔ کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں کہ انسان نے انسان کی آسانی کے لیے کیسی کیسی ایجادات کی ہیں۔ ہماری زندگی کا شاید ننانوے فیصد سکھ دوسروں کی تیار کردہ ایسی ہزاروں چیزوں کا مرہون منت ہوتا ہے، سوئی سے لے کر ہوائی جہاز تک سبھی کچھ جو ہمارے روزمرہ کے استعمال میں آتا ہے۔ وہ سبھی کوئی اور ہمارے لیے بنا کر گیا ہے۔ ہم صرف چند سکے خرچ کر کے ان ایجادات کے آرام و سکون کے حق دار بن سکتے تھے۔ شاید اسی بات نے ان سکوں کے حصول کو اس قدر مشکل بنا دیا ہے۔۔۔

لیکن سکون کا حصول صرف ان سکّوں سے ہی تو مشروط نہیں ہوتا۔۔۔ دل کا سکون کائنات کی ایک ان مول کیفیت ہے۔ اور اس بات کا صحیح اندازہ صرف وہی لگا سکتا ہے، جس کے اپنے دل کا سکون لُٹ چکا ہو۔ ہم انسان بھی کتنے نادان ہوتے ہیں، جب تک دل کا قرار اپنے قابو میں ہوتا ہے۔ ہم اسے بازاروں میں لُٹ جانے کے لیے پھرتے ہیں، ہر طرف اُٹھتی نگاہ کا بس ایک ہی حاصل ایک ہی منزل ہوتی ہے۔۔۔ کوئی دلبر۔۔۔ کوئی محبوب۔۔۔ اور جب وہی دلبر ہم سے ہمارا چین و سکون لے اُڑتا ہے تو پھر ہم اس کی ہی دُھائی

دیتے پھرتے ہیں۔

انہی اُلٹے سیدھے خیالات کی یورش میں مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ٹیوب ٹرین میرے مطلوبہ سب وے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ اور کب رکی۔ یہ تو اچھا تھا کہ آخری چند لمحوں میں سامنے جگمگاتے ہوئے نیون سائن پر میری نظر پڑ گئی جس پر 17 ڈاؤننگ سٹریٹ کا ہندسہ جگمگا رہا تھا۔ مجھے جیسے ہوش سا آ گیا اور میں ٹرین کے دروازے بند ہونے سے قبل ہی نیچے اُتر آیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر کی سڑک تک پہنچا۔ اب یہاں سے 9 نمبر کی لندن کی مشہور و مخصوص سُرخ ڈبل ڈیکر بسوں میں سے ایک بس مجھے سیدھا یونیورسٹی کے گیٹ تک پہنچا سکتی تھی۔

لندن بالکل ویسا ہی تھا جیسے میں اسے دوسال پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس بس اسٹاپ کے بالکل سامنے بوڑھا برگد کا درخت اب بھی ویسے ہی کھڑا مسکرا رہا تھا جیسے مجھے پھر سے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ انگریز ایسی باتوں کا بہت دھیان رکھتے ہیں۔ صرف اس درخت کو بچانے کے لیے انہوں نے چند سال پہلے اپنے ماسٹر پلان کے نقشے میں یہاں سے گزرتی سڑک کا رخ موڑ دیا تھا کیونکہ اگر سڑک لندن ماسٹر پلان کے تحت بنتی تو اس درخت کا کٹنا لازمی تھا، لیکن انگلش ایک روایت پرست اور ماضی پرست قوم ہے۔ وہ اپنی یادوں کو، اپنی تاریخ کو اتنی آسانی سے مسخ نہیں ہوتے دیتے، بلکہ اُسے بچانے کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قوم نے برسوں اس دنیا پر راج کیا ہے۔ سچ ہے۔۔۔ قومیں یونہی نہیں بن جاتیں، اس کے پیچھے صدیوں کی تربیت اور حوادث کا عمل دخل ہوتا ہے۔

کچھ ہی لمحوں میں میری مطلوبہ سرخ ڈبل ڈیکر بس دھیمی سی رفتار سے چلتی ہوئی بس اسٹاپ پر آ کھڑی ہوئی اور مَیں بس میں سوار ہو گیا۔ یونیورسٹی کے راستے میں میرا پُرانا دوست، میرا ہم راز اور میرا مہربان دریا، دریائے ٹیمز (River Thames) پڑتا تھا۔ میرے لڑکپن کی کئی شامیں اور جوانی کی کئی راتیں اس دریا کے کنارے لگے ہوئے خوبصورت لکڑی کے بینچوں پر گذری تھیں۔ وہ پَل، جنھیں اب میں یاد کر رہا تھا تو جیسے سب اک خواب سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ پک نکس وہ نئے نئے فلرٹ، وہ کچی محبتیں، ٹیمز کا پانی مجھے دیکھ کر مستی میں ہلکورے لے رہا تھا جیسے وہ میری لندن آمد سے

بہت خوش ہو۔ بس دریا کے ساتھ بنی ہوئی چوڑی سی سڑک پر بڑھ رہی تھی اور دریا ہمارے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی پُرانے محلے میں جب کوئی چمچماتی کار یا بڑی گاڑی داخل ہوتی ہے تو محلے کے بچے اس گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ ہمارے آس پاس کے موسم، درخت عمارتیں اور اس جیسے دریا، یہ ہمیں کس کس روپ میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ہنستے ہوئے۔۔۔۔ کبھی روتے ہوئے۔۔۔۔ خوشی، غم۔۔۔۔ غرض ہماری زندگی کا کون سا پہلو ہے جو ہمارے اردگرد بستے اس ماحول سے پوشیدہ ہوتا ہے، شاید اسی لیے ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی خوش ہوتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی روتے ہیں، شائد ہر موسم ہمارے اندر کے موسم سے جڑا ہوتا ہے۔

بس یونیورسٹی کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ میرا اسٹاپ آ گیا تھا۔ میں یونیورسٹی کے عظیم الشان آہنی جنگلے کے گیٹ سے اندر بنی اینٹوں کی سڑک پر آ گیا۔ یہ بہت بڑے گھاس کے دالانوں پر مشتمل ایک ایسی عمارت تھی جس کے اندر سے دریائے ٹیمز کی ایک چھوٹی سی شاخ گھاس کے عظیم میدانوں کو سیراب کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ دور دور تک بہت بڑے بڑے اور اونچے درخت ایستادہ تھے، جو اس وقت رات کی برف باری کی وجہ سے دور سے سفید لباسوں میں ملبوس بوڑھے بزرگوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دریا کے پانی کے اوپر شفاف برف کی ایک سل نما تہہ بچھی ہوئی تھی جس کے نیچے دریا کا پانی بہتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سفید سنگ مرمر سے بنی ہوئی تھی اور برف کے اس ماحول میں اس کے اونچے لمبے ستون اور باقی عمارت بھی برف ہی سے بنی دکھائی دے رہی تھی۔

ایڈمن ڈیپارٹمنٹ سے فارم لے کر میں نے بھر دیے تھے اور میری کلاسز دو دن کے بعد سے شروع ہونا تھیں۔ پتہ چلا کہ ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ایک یہودی نژاد مسٹر آئزک ہیں جو خود یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہیں۔ میں ان سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن پتہ چلا کہ وہ صبح گیارہ بجے کی کلاس کے بعد شہر میں ہونے والی کسی تعلیمی تقریب میں چلے گئے ہیں جس میں وہ بطور مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔ میرا اب یونیورسٹی میں مزید ٹکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہٰذا میں اسی راستے سے واپسی کی بس لے کر سب وے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کے ڈھائی بج چکے تھے اور یہ

دفتری اوقات کے مطابق دن کے کھانے کا وقت تھا۔ لہٰذا سب وے میں بھی صبح کی نسبت زیادہ چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے فی الوقت بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی میں کافی اور ایک سینڈوچ کا لنچ کرنے قریبی ریستوران میں داخل ہو گیا۔ قدرت نے ہم انسانوں کو ان کی کم مائیگی اور بے بسی کا احساس دلانے کے لیے اس دنیا میں جن اور بہت سی چیزوں کا اہتمام کر رکھا، وہیں بھوک بھی ان مجبوریوں میں سے ایک ہے، بڑے سے بڑا قد آور اور شہہ زور اس مجبوری کے آگے بے بس ہے۔

اور عزیز سے عزیز ترین رشتہ بھی بھوک کے اس احساس کو مٹا نہیں سکتا۔ ہم اپنے آس پاس روز کیسے کیسے دلداروں کو جان سے زیادہ عزیز رشتوں کو خود سے جدا ہوتا اور مرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ ان سے جڑے بے بس انسان جو اس لمحے خود کو بھی مٹتا محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ جن کی بھوک پیاس سب ختم ہو چکی ہوتی ہے، جنھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس بے جان جسم کے ساتھ ان کا لاشہ بھی قبر میں اُتار دیا گیا ہے اور اب وہ کبھی اس جیتی جاگتی دنیا کے ساتھ چل نہیں پائیں گے۔ جن کا ہر احساس اس لمحے مٹی ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن 24 یا 48 گھنٹوں کی مختصر مدت کے بعد ہی یہ معدہ انسان کو اس کی کم ظرفی، بے بسی اور مجبوری کا احساس دلانے کے لیے جاگ اٹھتا ہے، بھوک اسے ستانے لگتی ہے۔

انسان اپنے اندر اپنے آپ سے ہی نفرت اور شرمندگی محسوس کرنے لگتا ہے کہ ابھی چند گھنٹوں پہلے ہی تو وہ اپنے اندر کتنے بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔ مٹی کے ساتھ مٹی میں مل جانے کے دعوے، سب تیاگ دینے کے دعوے، لیکن سچ یہ ہے کہ انسان سے زیادہ بے بس مخلوق بھی دوسری اور کوئی نہیں۔ ہاں البتہ ایسے موقعوں پر اسی کے جیسے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے خود ساختہ اصول اس کے کام آ جاتے ہیں اور شرم کا کچھ پردہ رہ جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے ''میت کے گھر تین دن تک کھانا نہیں پکے گا، بھلا اس سوگ میں ان بے چاروں کو کھانے پینے کا ہوش ہی کہاں ہوگا؟ دوسرا کہتا ہے، ہاں ہاں ٹھیک ہے، پہلے دن کا کھانا تو ہمارے گھر سے ہی آئے گا، دوسرا دوسرے دن کا اور کوئی تیسرا تیسرے کا وعدہ کر کے وہاں سے اُٹھ آتے ہیں۔ وہ سب جانتے ہیں کہ کل جب ان کے گھر میں یہ ماتم ہوگا تو تب بھی یہی سب اس کی دلجوئی کو وہاں موجود ہوں گے۔ اس کی شرم کا پردہ رکھنے میں اس کی مدد کریں

گے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ انسان بہترین معاشرتی جانور ہے۔

OO

گھر واپس پہنچنے تک شام ہو چکی تھی۔ سورج ڈھل رہا تھا، گلی کے پچھواڑے وہی کل والے شرارتی بچے پھر سے جمع تھے اور اپنے کل کے بنائے ہوئے برف کے پتلے کی باقیات سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ سردیوں کی شام کی دھوپ پلک جھپکتے ہی کسی ستم گر محبوب کی طرح آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ ہوا میں خنکی کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی، لوگوں نے اپنے اوور کوٹس کے کالر اوپر چڑھا لیے تھے اور سانس لیتے اور بات کرتے وقت ان کے ہونٹوں سے بھاپ نکلتی دکھائی دیتی تھی۔ گٹار بجانے والی لڑکی نے اپنا گٹار اپنے بکس میں رکھ دیا تھا اور اَب وہ بھی روانگی کے لیے تیار تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مانوسیت کی ایک چمک لہرائی۔ وہ ہلکے سے مسکرائی اور میں سر کے اشارے سے اسے سلام کرتا آگے بڑھ گیا۔ رات کامران بھی جلد ہی واپس آ گیا تھا اور ہم نے سڑک کے کنارے دوسرے بلاک کے ایک چھوٹے مگر پُرسکون سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اور اب ہم اسی ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں اپنی ٹیبل کے گرد بیٹھے سوپ کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کامران نے آس پاس بیٹھی لڑکیوں اور خواتین کا بغور جائزہ لینے کے بعد اپنی حتمی رائے صادر کر دی تھی۔ اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ بولا ''مرد عورتوں سے اس اُمید پر شادی کرتے ہیں کہ وہ ہمیشہ ویسے ہی رہیں گی جیسے وہ شادی کے وقت ہوتی ہیں۔ اور عورتیں مردوں سے اس اُمید میں شادی کرتی ہیں کہ شاید وہ شادی کے بعد بدل جائیں گے۔ لیکن افسوس، بعد میں دونوں کو ہی مایوسی ہوتی ہے۔

میں نے غور سے اُسے دیکھا ''شاید اسی لیے تم نے اب تک شادی نہیں کی۔'' کامران مسکرایا ''خیر میری بات چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ آج یونیورسٹی میں دن کیسے گزرا۔'' میں نے نیپکن میز سے اٹھا کر اپنے ہونٹ خشک کیے۔ ''کچھ خاص نہیں۔ بس فارم ہی بھر سکا، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ موجود نہیں تھے۔''

کامران بولا۔ ''تم مسٹر آئزک کی بات کر رہے ہو۔ آج کل اخبارات میں اس کا بڑا تذکرہ رہتا ہے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اس جیسے کٹر یہودی نے ایک پاکستانی

مسلمان کو اپنی یونیورسٹی میں داخلہ کیسے دے دیا اس سے ذرا بچ کر ہی رہنا۔'' مجھے کامران کی بات سن کر ہنسی آ گئی۔ ''کیوں۔۔۔۔ کیا وہ آدم خور ہے جو مجھے کھا جائے گا؟''

کامران سنجیدہ تھا، ''تم ان یہودیوں کی طبیعت سے واقف نہیں ہو شاید۔ یہ کبھی بھی دل سے مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہوئے۔ اور اس کا اندازہ ہم جیسے دیارِ غیر میں بھٹکتے ہوئے مسلمان ہی ٹھیک لگا سکتے ہیں۔ جنھیں ہر بزنس کے معاملے میں ان یہودیوں کی نفرت اور مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فی الحال ان یہودیوں نے ہمیں بزنس کے معاملے میں مکمل مات دے رکھی ہے۔''

مَیں نے سوال کیا، ''لیکن تم لوگوں نے اور یہاں کی دوسری بزنس کمیونٹی نے کبھی ان وجوہات پر غور کیا ہے جو ان یہودیوں کی تجارتی کامیابیوں کا راز ہیں۔''

کامران نے گہری سی سانس لی۔ ''بات بالکل صاف ہے۔ یہودی کبھی تلخ کلامی سے کام نہیں لیتا، اور بزنس کا پہلا اُصول ہی خوش اخلاقی ہے۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے ہونٹوں سے چپکی مخصوص مسکراہٹ کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ دوسری اہم وجہ ہے ایک یہودی کا دوسرے یہودی تاجر کا خیال رکھنا چاہے دو یہودی تاجر آپس میں بدترین اور جانی دشمن بھی کیوں نہ ہوں، لیکن اگر ان کا کلائنٹ کوئی ایسی چیز طلب کرتا ہے جو پہلے یہودی کی دوکان پر میسر نہ ہو، تب بھی وہ خود پیدل چل کر اس خریدار کو اس جانی دشمن یہودی کے پاس لے کر جاتا ہے جہاں اسے وہ ضرورت کی چیز مل سکتی ہو۔ یہودی کبھی کسی غیر یہودی کو متعارف نہیں کرواتا۔ یہی اس یہودی تجارت کے پنپنے کا راز بھی ہے۔''

میں کامران کے خیالات سے کسی حد تک متفق بھی تھا لیکن میرے خیال میں اس نے یہودی تاجروں کی سب سے بڑی معصومیت کا تذکرہ اب تک نہیں کیا تھا۔

''تم سب سے اہم خصوصیت کا تذکرہ کرنا بھول گئے ہو۔ وہ ہے ایمان داری۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے تاجر اتنے خوش اخلاق اور ٹھنڈے مزاج کے نہیں ہوتے۔۔۔۔ یہ بھی درست ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے سے بھی کبھی باز نہیں آتے۔ ہمارا اُصول ہے کہ اپنا فائدہ ہو نہ ہو۔۔۔۔ لیکن دوسرے کا نقصان ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن ان سب سے زیادہ بڑی وجہ ہے بے ایمانی۔ اور یہودی تجارت میں بے ایمان نہیں ہوتے۔۔۔۔ میرے

خیال میں ان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے۔''

ہم دونوں کھانا کھا چکے تھے اور اَب پیدل ہی واپس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ تھے۔ کرسمس کا تہوار قریب آ رہا تھا لہٰذا آس پاس خریداروں کی چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ جا بجا کرسمس کے نمائشی درخت مخصوص جلتے بجھتے قمقموں سے سجے جھلملا رہے تھے۔ لوگ سردی سے بے نیاز ہو کر خود کو گرم کپڑوں سے ڈھکے ہوئے۔ آس پاس کی جگمگ کرتی دوکانوں سے خریداری کر رہے تھے۔ شاید دنیا کا ہر تہوار ایک سا ہی ہوتا ہے۔ سبھی تہواروں کا تعلق دل کی خوشی سے ہوتا ہے۔ اور سبھی تہواروں کے اصل شوقین بچے ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس وقت بھی لندن کے اس بارونق بازار میں زیادہ تر تعداد بچوں کی ہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب ہم چھوٹے تھے تو عید کی رات یا چاندرات سے کئی راتیں قبل ہی ہماری نیند جیسے اڑ ہی تو جاتی تھی۔ اور عید کی رات تو آنکھوں ہی آنکھوں میں صبح ہو جاتی تھی۔ عیدی ملنے کی خوشی اور پھر اس سے بھی زیادہ اس عیدی کو خرچ کرنے کی خوشی۔ لیکن عید کا پورا دن ہاتھ سے یوں نکل جایا کرتا تھا جیسے بند مٹھی سے ریت۔ شاید چیزوں یا تہواروں کی خوشی کا تعلق ان کی کمیابی اور تھوڑے ہونے سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ آس پاس پھرتے لوگوں کے چہروں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ یہ چہرے بھی کیسا آئینہ ہوتے ہیں۔

گھر پہنچتے ہی کامران بستر میں گھس گیا کیونکہ اسے اگلی صبح جلد نکلنا تھا، آج اس نے ایمان کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کی عادتوں سے خوب واقف تھے۔۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ میں جب سنبھل جاؤں گا تو خود ہی اُسے سب بتا دوں گا، اس سے پہلے مجھ سے کچھ پوچھنا فضول ہے۔ میں نے لائٹ بند کرنے سے پہلے بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھے رسالوں کی ورق گردانی کی ناکام کوشش کی لیکن پھر آخر کار بتی بجھا دی، لیکن کمرہ اندھیرا ہوتے ہی دماغ کے دریچے روشن ہو گئے۔ یادیں بُری ہوں یا بھلی، دونوں صورتوں میں یادِ ماضی عذاب ہی تو ہے۔

OO

ایمان

سنی کے پہلے پارے کی دُعائیہ تقریب تو گزر گئی لیکن اس کے بعد جیسے میرے شب و روز ہی بدل گئے۔ مَیں خود جان نہیں پا رہا تھا کہ یہ بے چینی کیسی ہے۔؟۔۔۔ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود میں اس قدر تہی دست اور بے بس سا کیوں ہوتا جا رہا ہوں۔ دل کہیں بھی تو نہیں ٹک پاتا تھا۔ بھیڑ میں ہوتا تو لوگوں سے دور بھاگتا، تنہا ہوتا تو گھبرا کر نیچے لاؤنج میں جا بیٹھتا۔ مولوی صاحب کی بیماری نے بھی طول پکڑ لیا تھا۔ پتہ چلا کہ اس دن کی بے آرامی کی وجہ سے بخار زور پکڑ گیا تھا۔ لہٰذا اگلا پورا ہفتہ وہ سنی کو درس دینے نہ آسکے۔ اور جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا جیسے ان کے نہ آنے سے میری کوئی بہت اہم اور بہت قیمتی چیز مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔

یہ اسی ہفتے کی ایک گرم سہ پہر کی بات ہے۔ میں گھر کے دالان میں پیڑوں کے نیچے ڈلی ہوئی آرام کرسیوں میں سے ایک پر آنکھیں موندھے پڑا ہوا تھا۔ گرمیوں کی دوپہریں بھی کتنی لمبی ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سورج ایک ہی جگہ ٹک کر رہ گیا ہے یا شاید مجھ جیسے شوریدہ سروں کو ہی ان کی بے جا طوالت سے اختلاف تھا، جن کے دلدار کہیں بستے ہوں گے شاید وہ ان سے لمبی ملاقات کے لیے ایسی سہ پہروں کی دُعائیں مانگتے نہ تھکتے ہوں۔۔۔

مَیں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اندر سے سنّی میاں شاکر ڈرائیور کے ساتھ شور مچاتے اور اُچھلتے کودتے برآمد ہوئے۔ شاکر کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے تھرماس تھے اور سنی کے ہاتھوں میں پھلوں سے بھری ٹوکری۔ سنی نے مجھے دالان میں دیکھا تو بھاگ کر میرے پاس آیا۔

"چاچو۔۔۔ دیکھیں میں نے کتنی بہت سی آئس کریم جمع کی ہے۔" سنّی نے شاکر کے ہاتھوں میں پکڑے جہازی سائز کے تھرماسوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے سنّی کے کان

پکڑے۔ "ہوں۔۔۔ تو یہ بات ہے۔ دوپہر کو مما سے چُھپ کر پکنک منائی جا رہی ہے۔"

سنّی ہنسا "نہیں چاچو۔ مما تو دادی کے ساتھ کب کی شاپنگ کے لیے جا چکی ہیں۔ یہ سب کچھ تو ہم مولوی صاحب کے لیے لے جا رہے ہیں۔" مولوی صاحب کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیا مطلب؟ کیا مولوی صاحب کو ڈاکٹر نے بخار میں پیٹ بھر کر آئس کریم کھانے کا کہا ہے؟"

سنّی ہنس پڑا، "افوہ۔۔۔ چاچو آپ بھی۔۔؟۔۔ مولوی صاحب کے لیے تو ہم یہ پھل لے کر جا رہے ہیں۔ آئس کریم تو ایمان آپی اور حیا باجی کے لیے ہے۔۔۔ اب سمجھے۔" اتنے میں شاکر گڑگڑایا۔ "حماد بابا۔۔۔ اب آپ ہی سمجھاؤ نا سنی میاں کو۔۔۔۔ اگر سجاد میاں کو پتہ چلا تو وہ بہت ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن یہ سنی میاں تو مستقل ضد کیے جا رہے ہیں۔ گھر میں اس وقت کوئی دوسرا بڑا بھی نہیں، جس سے ہم اجازت لے سکیں۔"

سنّی نے منہ بسورا "مولوی صاحب نے ہمیں پڑھایا ہے کہ جب کوئی بیمار ہو تو اس کی عیادت کے لیے جانا چاہیے۔ اس سے ثواب ملتا ہے۔ پھر ثواب کے کام کے لیے کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت؟۔۔۔ ہے نا میڈی چاچو۔"

پھر جیسے کسی خیال سے سنی کی آنکھیں اپنے آپ ہی چمکنے لگیں۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں نا میڈی چاچو۔ ہم جلدی واپس آجائیں گے۔" میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ یوں لگا جیسے سنی نے میرے دل کی بات پڑھ لی ہے۔ شاکر نے بھی فوراً سنی کا ساتھ دیا۔ "ہاں حماد بابا۔۔۔۔ آپ ساتھ چلیں گے تو میری بھی کچھ بچت ہو جائے گی۔ ورنہ آپ سجاد میاں کے غصے سے تو واقف ہیں۔"

اب تو سنی نے باقاعدہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ نتیجتاً ہم تینوں گاڑی میں سوار ہو گئے اور جاتے ہوئے گیٹ پر دربان کو شاکر نے بتا دیا کہ سنی اپنے میڈی چاچو کے ساتھ کہیں گھومنے جا رہا ہے۔ گھنٹہ بھر میں واپس آجائیں گے۔ شاکر نے جان بوجھ کر شاید مولوی صاحب کے گھر کا تذکرہ نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے گھر والے ایسی باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ وہ امیروں اور غریبوں کے درمیان فاصلے کے قائل ہیں۔ لیکن سنی کا معصوم ذہن ابھی تک زمانے کی ان منافقانہ ترکیبوں سے کوسوں دور تھا۔ رہی میری بات، تو مجھے

شاکر اس عمر سے جانتا تھا جس میں اب سنی تھا۔ خود میں بچپن میں اسکول سے واپسی پر شاکر سے ایسی ہی بے جا فرمائشیں کرتا تھا۔ کبھی اسکول کے سامنے کھڑے ہوئے ٹھیلے سے برف کے ٹھنڈے گولے کھانے کی فرمائش، کبھی ایک مخصوص ریڑھی کے بکس میں نمک اور برف میں جمی دودھ کی قلفیاں کھانے کی ضد، تو کبھی سر پہ فالسوں کی ٹوکری رکھے، آواز لگاتے بوڑھے بابے سے فالسے دلوانے کی فرمائش، شاکر گھر والوں سے چھپ کر میری ضدیں پوری کرتا جاتا اور جب کبھی میرا گلا خراب ہوتا تو امی حیرت سے بڑبڑاتیں۔ ''اس نے تو کبھی باہر کی کوئی چیز چکھی بھی نہیں۔'' اور تب میں اور شاکر امی اور گھر کے فیملی ڈاکٹر سے نظریں چرا کر مسکراتے۔ گھر میں واحد میں ہی تھا جس سے شاکر اپنے دل کی بات کھل کر کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے گاڑی مولوی صاحب کے گھر سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ ویسے ویسے میرا دل جیسے دھڑکنا بھولتا جا رہا تھا۔ جانے یہ کیسی کیفیت تھی۔ مجھے زندگی میں پہلی بار شاعروں کے وہ سارے شعر اور قصیدے جو انہوں نے اپنے کسی محبوب کے گھر کے راستے کے بارے میں کہے تھے، یکا یک یاد آنے لگے تھے، سچ تو یہ ہے کہ اگر اس وقت میں ذرا سی کوشش کرتا تو ایک آدھ شعر تو میں خود بھی کہہ ڈالتا۔ شائد ہم سب کے اندر کہیں نہ کہیں ایک شاعر چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ بس اُسے ذرا اِک تحریک ملنے کی بات ہے۔ لفظ خود بخود ذہن و دل میں وارد ہونے لگتے ہیں۔ قافیے جڑنے لگتے ہیں، ردیفیں خود بخود ڈھلتی جاتی ہیں اور شعر سرزد ہونے لگتے ہیں۔

گاڑی شہر کے پُرانے حصے میں واقع ایک چھوٹے سے محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ حسب معمول محلے کے میدان میں چند بچے گھر والوں سے نظر بچا کر سہ پہر کو اپنا گیند بلا لے آئے تھے اور کرکٹ کا میچ جاری تھا۔ گاڑی کے داخلے پر سب بچوں کی توجہ گاڑی کے جانب مبذول ہوگئی۔ چند ایک بارہویں اور تیرہویں کھلاڑی نما بچوں نے کچھ دیر تک گاڑی کے ساتھ دوڑ لگائی۔ گاڑی کچھ مکانوں کی دو رویہ قطاروں کے سامنے سے گزرتی ہوئی بائیں کو مڑ گئی اور دوسری گلی میں کونے کے ایک مکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ جانے کیوں میرا حال کچھ ایسا تھا کہ جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو۔ کیسا عجیب سا احساس تھا۔ صرف ایک دیوار کی دوری پر وہ نازنین کہیں چل پھر رہی تھی۔ اور یہ جو سامنے لکڑی کا پُرانا سا دروازہ

تھا، جانے کتنی بار اس کے کومل ہاتھوں نے اس کے کواڑوں کو تھاما ہوگا، اور یہ گلی ---- یہ راستہ --- جانے کتنے بار اس کے نازک قدم ان راہوں پر پڑے ہوں گے --- اس فضا میں اس کی باتیں --- اس کی جلترنگ جیسی ہنسی جانے کتنی بار گونجی ہوگی --- یہ چھوٹا سا محلہ --- یہ پکی اینٹوں سے بنی گلی یک دم ہی مجھے دنیا کی سب سے حسین جگہ کیوں لگنے لگی تھی --- کسی ایک اجنبی کی موجودگی آس پاس کے پھیکے نظاروں کو اس قدر رنگین کیسے بنا سکتی ہے؟

میں انہی خیالات میں گم تھا۔ سنی اور شاکر گاڑی سے اُتر کر مولوی صاحب کے گھر کے اندر جا چکے تھے۔ شاکر نے مجھے بھی اُترنے کی درخواست کی تھی لیکن میں تو جیسے گاڑی میں ہی جم کر رہ گیا تھا۔ میری حالت اس وقت ایک ایسے سوالی کی سی تھی جو صدیوں سے ایک ہی در کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہو --- پر وہ دَر اس کے لیے کبھی نہ کھلے ---

اچانک دھڑ سے لکڑی کا دروازہ کھلا اور اُس میں سے آگے آگے بوکھلائے ہوئے اور ٹپٹائے سے مولوی صاحب اور ان کے پیچھے پریشان شاکر تیزی سے باہر نکلے۔ میں بھی ہڑبڑا سا گیا۔ مولوی صاحب نے آتے ہی شدت سے معذرت اور شرمندگی کا اظہار شروع کر دیا کہ یہ شاکر کی نالائقی ہے کہ اس نے میری باہر گاڑی میں موجودگی سے انہیں آتے ہی مطلع نہیں کیا ورنہ وہ اتنی دیر مجھے گاڑی میں یوں بیٹھے رہنے کی زحمت کبھی نہ دیتے۔ تو کیا مجھے باہر گاڑی میں بہت دیر ہوگئی تھی؟ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ میں ابھی چند لمحے پہلے ہی یہاں آیا تھا۔

مولوی صاحب کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی اور وہ مجھے گھر کے اندر لے گئے۔ یہ ایک چھوٹا لیکن بے حد صاف ستھرا مکان تھا۔ صحن کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا جس کے وسط میں ایک بڑا سا برگد کا درخت شاخیں پھیلائے کھڑا تھا۔ درخت کے اردگرد پکا چبوترہ سا بنا دیا گیا تھا۔ درخت کی شاخوں سے ایک جھولا بھی لٹکا ہوا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گلابوں کی چھوٹی چھوٹی سی کیاریاں تھیں جن میں سلیقے سے پھول اگائے گئے تھے۔ صحن کے سامنے ہی ایک لمبا سا برآمدہ تھا جسے لکڑی کی جافریوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ برآمدے کے پیچھے شاید گھر والوں کے رہائشی کمرے تھے، اور شاید وہی زنان خانہ بھی تھا۔ برآمدے کے

آخری حصے میں لکڑی کی جالیوں (جافریوں) کی پارٹیشن میں ایک دروازہ کھلتا تھا۔ مولوی صاحب مجھے اسی طرف لیے بڑھ گئے۔ شاید یہی اس چھوٹے سے گھر کا مہمان خانہ یا بیٹھک بھی تھی۔ بیٹھک والے برآمدے کے حصے کو اندر سے بھی لکڑی کی جالی نما پارٹیشن سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ میں بے خود اور سحر زدہ سا مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ اندر سے سنّی کے زور زور سے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں، انہی آوازوں میں ایک آدھ نسوانی ہنسی اور باتوں کا جلترنگ بھی شامل تھا۔ میری تو جیسے سانسیں ہی رکنے لگی تھیں۔ وہ مختصر سی بیٹھک یا ڈرائنگ روم گھر والوں کی نفاست کی آئینہ دار تھی۔ مختصر سا پُرانا فرنیچر، سلیقے سے کڑھے ہوئے پوش (کورز) سے ڈھکا ہوا تھا۔ سامنے کارنس پر غالب کا دیوان اور چند دوسرے مشہور مصنفین کی کتابیں اور نقوش رسالے کے چند ایڈیشن سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ لگتا تھا گھر کے مکینوں کو اُردو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ میرا ذہن پھر سے بھٹکنے لگا۔ جانے کتنی بار اس کی مخروطی انگلیوں نے ان کتابوں کے ورق پلٹے ہوں گے؟ دن میں جانے کتنی بار وہ یہاں آتی ہوگی۔ اور کون جانے وہ گھنٹوں یہاں اسی جگہ بیٹھی ان کتابوں کی ورق گردانی کرتی ہوگی جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے لہجے میں اَب بھی معذرت تھی۔

''میاں یہ آپ نے بڑی زیادتی کر دی۔۔۔ پہلی مرتبہ اس غریب خانے پر تشریف لائے اور یوں دروازے پر ہی کھڑے رہے۔۔۔ یہ گھر آپ کے قابل تو نہیں لیکن۔۔۔''

میں نے جلدی سے ان کی بات کاٹ دی۔

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو بس یونہی۔۔۔'' شاکر نے جلدی سے بات بنائی۔ ''حماد بابا کا خیال تھا کہ ہم دروازے سے ہی سامان دے کر لوٹ آئیں گے۔''

مولوی صاحب نے ناراضگی سے شاکر کی طرف دیکھا۔

''بھئی تم تو ہم سے کوئی بات نہ ہی کرو شاکر بھیا۔ پہلی مرتبہ صاحبزادے اس گھر تک آئیں اور ہم انہیں دروازے سے ہی لوٹا دیں۔ یہ کہاں کی روایت ہے بھلا۔'' مولوی صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہمارے لیے بچھ بچھ جائیں۔ جانے یہ پُرانے طرز کی روایتی وضع داری ہم جیسے امیروں کی بڑی بڑی کوٹھیوں اور حویلیوں سے کہاں غائب ہوتی جا رہی تھی۔

ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے جانے اندر جا کر کیا کھسر پھسر کی کہ چند لمحوں میں ہی باہر کسی طرف بنے نعمت خانے سے مختلف اشتہا انگیز خوشبوؤں اور مہک کے ساتھ ساتھ چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک اور برتنوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے مولوی صاحب کو روکا۔

''آپ کوئی تکلف نہ کریں، ہم بنا بتائے ہی گھر سے نکل آئے ہیں وہاں سنی کی مما پریشان ہوتی ہوں گی۔''

مولوی صاحب پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ ''میاں غریب کی مہمان نوازی کیا اور اس کا تکلف کیا؟''

معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کی دو ہی صاحبزادیاں ہیں۔ کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ البتہ ان کے مرحوم بڑے بھائی کا ایک بیٹا تھا جو بچپن سے مولوی صاحب کے یہاں ہی پلا بڑھا تھا، عبداللہ صرف نام کا ہی عبداللہ نہ تھا۔ بلکہ اپنے اعمال سے بھی اس نے اپنے آپ کو مولوی علیم کا صحیح معنوں میں جانشین ثابت کیا تھا۔ وہ انہی کی تربیت کا نقشِ ثانی تھا۔ مولوی صاحب جس مسجد میں نماز پڑھاتے تھے۔ وہیں عبداللہ ہی ہمیشہ ان کی تکبیر دیتا تھا۔ بلکہ اب تو زیادہ تر مولوی صاحب کی طبیعت خراب رہنے کے باعث عبداللہ ہی محلے کی مسجد میں اذان دیا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ مجھے آس پاس کہیں دکھائی نہ دیا۔ کچھ دیر بعد اندر کے دروازے کی طرف سے ہلکی سی آہٹ ہوئی جیسے کوئی دروازے پر آ کر رکا ہو۔ مولوی صاحب جلدی سے اٹھ کر دروازے سے اندر چلے گئے۔ کچھ چوڑیاں کھنکنے کی آواز اور دبی سی چند سرگوشیاں سنائی دیں اور مولوی صاحب ایک ایک کر کے تین چار خوان اندر اٹھا لائے۔ میں اور شاکر بس ''ارے، ارے'' ہی کرتے رہ گئے۔ چند منٹوں میں ہی ان لوگوں نے کیا کچھ اہتمام کر ڈالا تھا۔ شام کی چائے کے ساتھ جو کچھ بھی لوازمات ہو سکتے تھے۔ وہ سب کے سب حاضر تھے۔ گھر کا بنا ہوا پنیر کیک، سموسے، املی کی چٹنی، زعفران سے سجی بالائی، گاجر کا حلوہ اخروٹ سے بنی ہوئی مٹھائی اور جانے کیا کیا۔۔۔؟

میرے ساتھ بچپن سے ہی ایک عجیب سا مسئلہ تھا، میں کسی کے سامنے کچھ کھاتے ہوئے بے حد شرم محسوس کرتا تھا۔ اور خاص طور پر اگر کوئی اجنبی سامنے بیٹھا ہو تو مجھ سے کچھ

نگلنا محال ہو جاتا تھا۔ جانے میرے دل میں بچپن سے یہ بات کیوں بیٹھ سی گئی تھی کہ کھاتے ہوئے انسان کچھ معزز دکھائی نہ دیتا ہوگا۔ وہی مسئلہ اس وقت بھی درپیش تھا لیکن مولوی صاحب کے پُرخلوص اصرار کے سامنے میرے اندر کی اس ازلی کمزوری کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ مجھے مجبوراً سب کچھ تھوڑا تھوڑا چکھنا پڑا۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ جس کے ہاتھ کا بھی ہنر تھا۔ لاجواب تھا۔ میری زبان اس ذائقے کو کبھی نہیں بھلا پائے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب گھر ہی کا بنا ہوا تھا کیونکہ اتنی جلدی بازار سے یہ سب کچھ منگوانا اور یہ سب اہتمام ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ کون ہوسکتا تھا۔۔؟۔۔ گھر میں تین عورتیں موجود تھیں۔ مولوی صاحب کی بیوی اور ان کی دو بیٹیاں۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور اس کے ہاتھ کا جادو بھی شامل ہوگا ان سب لوازمات میں۔۔۔۔ یہی سوچ کر میں ہر چیز اٹھا کر چکھتا رہا۔۔۔۔ اور پھر شاکر نے جیسے میرے دل کی آواز کو زبان دے دی۔ وہ مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے بھابھی کی مولوی صاحب۔۔۔ کمر کا درد کچھ کم ہوا یا نہیں۔''

مولوی صاحب پریشانی سے بولے، ''کہاں شاکر میاں۔۔۔۔ بڑھاپا خود ہی سب سے بڑی بیماری ہوتا ہے۔ اُوپر سے یہ نت نئی بیماریاں۔۔۔ اب تو زیادہ تر آرام ہی کرتی ہیں۔ گھر کا سارا کام کاج بھی بچیوں نے ہی سنبھال رکھا ہے۔''

تو گویا میرا اندازہ درست تھا۔ یہ سب کچھ اسی عشوہ طراز کے ہاتھوں اور نگرانی کا کمال فن تھا۔

چائے پینے کے بعد شاکر نے میری طرف سے اجازت چاہی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں حسب معمول اور حسب عادت ان کی مہمان نوازی سے اکتا چکا ہوں گا۔ شاکر کے لیے تو یہ بات بھی باعث حیرت ہوگی، کہ میں اتنی دیر سے بنا کچھ کہے یہاں کیسے بیٹھا رہ گیا۔ جب کہ مجھے اس وقت یوں لگا کہ جیسے ابھی چند لمحے پہلے ہی تو ہم یہاں آئے تھے۔ ابھی تو میں نے کھل کر اس گھر کی فضا میں سانس بھی نہیں لیا تھا۔ آخر شاکر کو کس بات کی جلدی تھی؟ کچھ دیر تو اور بیٹھا رہتا۔ بہرحال اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ شاکر جانے کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ مولوی صاحب ہماری آمد پر نہایت ممنون تھے۔ نہ شکریہ ادا کرتے کرتے ان کی آنکھیں ہی بھر آئیں۔ میں نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر

انہیں تسلی دی اور انہیں احساس دلایا کہ وہ ہم سب کے لیے کس قدر قابلِ احترام ہیں۔

ہم سب کمرے سے نکل کر صحن میں آگئے۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھیوں میں پکڑ کر بھینچ لیا ہو۔ ہم واپس جارہے تھے۔ جانے پھر کبھی دوبارہ یہاں آنا ہو یا نہ ہو۔ کاش میں اس کی ایک جھلک دیکھ پاتا، کاش۔۔۔۔

اچانک چلتے چلتے شاکر صحن میں رک گیا اور اُس نے سَنی کو آواز دی جو ابھی تک زنان خانے میں ہی تھا۔ بے اختیاری طور پر میری اور مولوی صاحب کی نگاہ بھی اسی طرف اٹھ گئی جہاں سے سَنی کے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم سب ہی صحن میں رک گئے تھے۔ اور پھر اچانک ہی سنی دوڑتا ہوا اندر برآمدے سے برآمد ہوا۔ چند لمحے کو لکڑی کی جالیوں کے پرے دروازے پر ڈلی ہوئی ایک چلمن ذرا دیر کو ہٹی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے میری تمام زندگی کا مقصد ہی آج پورا ہو گیا ہو۔ ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے مسکراتے ہوئے سنی کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہتی ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چھوٹی بہن اس سے چپکی کھڑی تھی۔ اور وہ بھی سنی کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ یہ اوپر تلے والی بہنوں کا رشتہ بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ دونوں کے بس جسم ہی علیحدہ ہیں، ورنہ دونوں کا ذہن اور دل ایک ہی ہے۔ ایک سا سوچنا، ایک سا بولنا، ایک سا پہننا۔۔۔۔ میں نے تو ایسی بہنیں بھی دیکھیں ہیں جو بیک وقت ایک ہی ہستی کی محبت میں مبتلا بھی رہی ہیں۔

اس نازنین کا یہ جلوہ بھی بس چند ساعتوں کا ہی تھا۔ جیسے ہی اُسے احساس ہوا کہ ہم سب صحن میں کھڑے سنی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ فوراً گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ لیکن اسی ساعت قدرت مجھ پر شائد اپنی ہر مہربانی لٹانے پر تُلی تھی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی اس کی نگاہ میری بے قرار نگاہوں سے ٹکرا ہی گئی۔ ایک لمحے میں چند چنگاریاں اٹھیں اور میرے پہلے سے تار تار ہوئے دامن کو جلا کر خاکستر کر گئیں۔ کیا کیا تھا اس ایک نظر میں۔۔۔۔؟ بیگانگی، خوف، شرم وحیا، اپنی لاپرواہی کی جھنجھلاہٹ۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔۔۔۔

دنیا میں شاعر اور ادیب بہت سے رشتوں کو بیان کرتے سنے گئے ہیں۔ لیکن نظر سے نظر کے رشتے کو اس وقت جتنی شدت سے میں بیان کرسکتا تھا یہ میں ہی جانتا تھا۔ زمانے بھر کی بے چینیاں، کسک اور بے بسی میرے اس ایک پل کے نظر کے رشتے میں مقید تھی۔

ہم اس کے گھر سے تو باہر نکل آئے لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں اپنی روح وہیں اس چلمن کے پیچھے کہیں چھوڑ آیا ہوں۔ سنی نہ جانے راستے بھر مجھے اور شاکر کو کون کون سے قصے سناتا رہا۔ لیکن میں سوائے ہوں ہاں کے اور کچھ جواب نہ دے پایا۔ ہم نے گھر والوں کے سامنے مولوی صاحب کے یہاں جانے کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر روانہ ہوگئی لیکن شاید میری زندگی کا زاویہ اسی دن سے مکمل بدل گیا تھا جس دن ہم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔

مَیں گھنٹوں ایک ہی جگہ گم سم بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن مجھے پہروں کے ڈھلنے کا اک ذرا احساس بھی نہ ہوتا۔ دوستوں کی سنگت اور محفل چھوٹ گئی تھی اور مجھے سب کچھ ایک دم ہی بے معنی سا لگنے لگا تھا۔ میرے اندر کی اس تبدیلی کو سب گھر والوں نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ امی ایسے موقعوں پر فوراً ایلوپیتھی، پھر ہومیوپیتھی اور پھر روحانی علاج کی طرف متوجہ ہو جاتی تھیں۔ بابا نے حسب معمول ایک لمبی سی ہنکاری بھری اور مجھے آب و ہوا بدلنے کا مشورہ دے کر پھر سے اپنا پائپ پینے میں مشغول ہو گئے۔ عبرینہ بھابھی نے فوراً امی کو مشورہ دیا کہ ان کی چھوٹی بہن کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا جائے کیونکہ میری تنہائی دُور کرنے کا یہ واحد اور بہترین حل وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ امی کو دے چکی تھیں۔

میرے ساتھ بچپن سے ایک اور مسئلہ بھی درپیش تھا۔ مسئلہ کیا تھا اک عجب معمہ ہی تھا۔ بچپن میں، مَیں مہینے کی ہر پہلی جمعرات کو شدید بخار میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ دنیا کے علاج کروائے گئے، زمانے بھر کے ڈاکٹرز مجھے دیکھ گئے پر یہ بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ پھر میری چہیتی خالہ جو دوسرے شہر میں رہتی تھیں اور امی سے چھوٹی تھیں، انہوں نے امی کو کسی نظر اُتارنے والے عامل سے ملنے کا کہا۔ ہمارے ماڈرن گھر میں بھلا ایسی دقیانوسی باتوں کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ کمشنر صاحب کو فوراً جلال آ گیا اور امی کو ٹھیک ٹھاک لیکچر سننے کو مل گیا۔ لیکن پھر خالہ خود ہی ہمارے گھر آ دھمکیں اور بابا سے چھپ کر وہ مجھے اور امی کو کسی بزرگ کے پاس لے گئیں جنھوں نے بغور میرا معائنہ کیا اور امی کو بتایا کہ مَیں روحانی طور پر اندر سے بے حد کمزور ہوں لہٰذا مجھے ساری زندگی نظرِ بد کا خطرہ لاحق رہے گا۔ انہوں نے مجھ پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور ایک کالا دھاگا مجھے گلے میں پہننے کے لیے دیا۔ ساتھ ہی امی کو تاکید کی کہ ہر مہینے کی

پہلی جمعرات کو چاہے خود یا چاہے کسی اور کے ذریعے کچھ صدقہ اور نذر و نیاز وغیرہ دے دیا کریں۔ خود ان بزرگ نے کوئی نذرانہ قبول نہیں کیا۔ ایک آدھ ماہ تک تو امی کو یہ سب یاد رہا، پھر انہوں نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے شاکر کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ کچھ بانٹ دیا کرے۔ شاکر اب تک یہ ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ حالانکہ امی شاید میرے بچپن کی وہ بیماری بھول بھال چکی تھیں۔ البتہ مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد میری جو حالت رہنے لگی تھی اس نے انہیں میرے بچپن کی بیماری کی یاد دلا دی تھی۔ فوراً خالہ سے رابطہ کیا گیا اور خالہ نے فوراً ہی فون پر ہی تین چار تیر بہدف نسخے تجویز کر دیے۔ لیکن میرے دل کی حالت کوئی نہیں جانتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میری زندگی کی ہر خوشی، ہر حاصل کا محور صرف اور صرف ''ایمان'' بنتی جا رہی تھی۔

OO

یہودی

ایک پُرانی کہاوت ہے "جو یاری کرے گا، وہ شب بیداری بھی کرے گا۔" سو لندن میں میری یہ دوسری رات بھی شب بیداری کی نظر ہوگئی۔ صبح کامران کسی ہڑتال کی وجہ سے فارغ تھا، لہٰذا اس نے مجھے یونیورسٹی کے گیٹ پر ڈراپ کر دیا۔ نوٹس بورڈ سے پتہ چلا کہ آج سر آئزک ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ نئے آنے والے اسٹوڈنٹس سے ہال نمبر تین میں بذریعہ لیکچر خطاب کریں گے۔ سو بھی نئے آنے والوں کا رخ ہال نمبر تین کی طرف ہی تھا۔

بچپن میں ایک ٹی وی سیریل ہم سب بچے بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ نام تھا "آخری چٹان" اس میں ایک یہودی کریکٹر کا نام ڈیوڈ تھا۔ بچپن سے میرے دل میں یہودی شخص کی یہی ایک شبیہہ چھپ سی گئی تھی۔ جب بھی کوئی کہیں سی یہودی کی بات کرتا تو وہی بچپن سے دل میں نقش ہوئی صورت نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی۔ جس دن سے مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارا ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بھی ایک یہودی تھا تب سے اس کی بات کرتے وقت ایک مخصوص حُلیے کا یہودی میری نظروں کے سامنے آجاتا۔ دبلا پتلا سا، چہرے پر یہودیوں کی خاص مشابہت والی داڑھی، سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، لمبا سا چغہ، تیز تیز آنکھیں گھمانے والا اور بہت تول کر بولنے والا تسبیح گھماتا شخص۔۔۔

لیکن سر آئزک کو دیکھنے کے بعد میرے تخیلات کو بہت زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ٹھیس ضرور لگی۔ یہ تو ایک ماڈرن حلیے کا شخص تھا۔ عمر پچاس سے اوپر، تن پر بہترین اور قیمتی سوٹ، آنکھوں پر نظر کا باریک سا چشمہ، بے حد نرم گفتار سا شخص۔ اس دن میرے ذہن میں سے میرے بچپن والی یہودی کی شبیہہ نکل گئی اور اس کی جگہ اس نئی تصویر نے لے لی۔ البتہ ایک مماثلت ضرور تھی کہ سر آئزک کے ہاتھ میں بھی ایک چھوٹی سی تسبیح موجود تھی جسے وہ شائد اپنی عادت کے مطابق کبھی ہاتھ میں گھماتے اور کبھی جیب میں ڈال رہے تھے۔ معاشیات کی اس

کلاس میں تقریباً پینتیس کے قریب طالب علم تھے جن میں لڑکوں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ سر آئزک کے ابتدائی لیکن پُر اثر سے لیکچر کا آغاز ہوا۔ شروع میں انہوں نے اپنا تعارف کروایا اور پھر معاشیات سے متعلق چند بنیادی باتیں بتائیں۔ کچھ یونیورسٹی کے ڈسپلن کے بارے میں بیان کیا اور آخر میں ہم سب سے تعارف کروانے کو کہا۔ مجھے رول نمبر 17 الاٹ ہوا تھا اور اسی دن مجھے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس پوری کلاس میں ایک مَیں ہی اکیلا مسلمان طالب علم ہوں۔ مَیں نے اپنی باری پر اٹھ کر جب اپنا نام پکارا اور مذہب اسلام بتایا تو مجھے محسوس ہوا کہ کچھ دیر کے لیے تمام کلاس پر سناٹا سا چھا گیا ہے۔ شائد یہ میرا وہم ہی ہو لیکن پھر سر آئزک نے مجھ سے میری پچھلی تعلیم اور ڈگریوں وغیرہ کا پوچھ کر سلسلہ آگے بڑھا دیا۔ آخر اسٹوڈنٹس کے تعارف کا سلسلہ ختم ہوا اور سر آئزک نے ان اختتامی جملوں کے ساتھ اپنا پہلا لیکچر ختم کیا۔

"مائی ڈیئر اسٹوڈنٹس۔۔۔۔ ازل سے لے کر اب تک۔۔۔۔ اور پھر شائد ابد تک ہمیشہ دنیا کے اعلیٰ ترین نظریات کو اوسط درجے کے ذہنوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یاد رکھیے۔۔۔۔ جس نے کبھی غلطی نہیں کی۔۔۔۔ اس نے کبھی کچھ نیا کرنے کی بھی کوشش نہیں کی ہوگی۔۔۔۔ اس لیے نظریہ بنانے اور نیا نظریہ پیش کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیجئے گا، ہمیں غلطی اور اوسط درجے کے ان ذہنوں کی مخالفت کے ڈر سے بہت آگے نکلنا ہوگا۔ مَیں ایک بار پھر آپ سب کو اس ادارے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔۔۔۔ کل سے ہم باقاعدہ کلاسز کا آغاز کریں گے، گڈ ڈے۔"

سر آئزک اسٹیج سے اُتر کر چلے گئے۔ ساری کلاس نے ڈیسک بجا کر ان کی تقریر اور خیالات کا خیر مقدم کیا۔ سچ یہ ہے کہ سر آئزک کی باتوں نے مجھے بھی خاصا متاثر کیا تھا۔ مجھے کامران کی ان سے بچ کر رہنے کی بات یاد آگئی اور میرے لبوں پر خود بخود ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ کامران نے دوپہر کو واپسی پر مجھے پک کرنے کا کہا تھا اور ابھی اس کے آنے میں پورے دو گھنٹے باقی تھے۔ سو ہال سے باہر نکل کر مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کس طرف کو نکلا جائے۔ پھر میری نظر دُور پڑے ان بینچز پر گئی جو یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی نہر (جو کہ دریائے ٹیمز کی ہی ایک شاخ تھی) کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر لگائے

گئے تھے۔ اس طرف آبی پرندوں کے غول بھی موجود تھے، جو اُڑتے ہوئے آتے دریا کنارے بیٹھے اسٹاف اور دیگر طالب علموں کے ہاتھوں پھینکی گئی اپنی مخصوص خوراک کو چگتے اور پھر اُڑ جاتے۔ مجھے بھی یہی گوشۂ تنہائی وقت گزاری کے لیے بہتر لگا اور مَیں انہی لکڑی کے بینچوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا اور سامنے بہتے پانی اور ان پرندوں کی آپس میں ہوتی اٹھکیلیاں دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک بوڑھا شخص سر پر ہیٹ پہنے، لمبے سے اوورکوٹ اور مفلر میں ملبوس آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پرندوں کو ڈالنے والے دانے کا ایک بڑا سا کاغذی لفافہ پکڑا ہوا تھا۔ اس نے کچھ ہی دیر میں مٹھیاں بھر بھر کے دانے پرندوں کی طرف اچھال کر وہ لفافہ خالی کر دیا اور اسے قریب بنے ہوئے کوڑے دان میں ڈال کر وہ جانے کے لیے پلٹا۔ پھر اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ میری طرف چلا آیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر بولا۔

''جوزف۔۔۔ کیا تم نئے آنے والے طلبا میں سے ایک ہو۔'' میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''حماد۔۔۔ فرسٹ سمسٹر۔۔۔ معاشیات۔'' اُس نے گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور مسکرا کر بولا۔۔۔

''اوہ آئی سی۔۔۔ لیکن ینگ مین۔ تم یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہو۔۔۔ کیا سینئر اسٹوڈنٹس کی ریگنگ (Raging) سے ڈرتے ہو۔''

مَیں بھی مسکرا دیا۔ ''نہیں۔۔۔ مجھے ڈر صرف اپنے آپ سے لگتا ہے۔ لیکن اس وقت میں خود اپنے آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس طرف آ بیٹھا۔'' جوزف نے دلچسپی سے میری طرف دیکھا۔

''خوب۔۔۔ اپنے آپ سے باتیں۔۔۔ بھئی اس ملاقات کی طرف تو کبھی اپنا دھیان ہی نہیں گیا، خود سے خود کی ملاقات۔۔۔''

مَیں نے کھسک کر اس کے لیے تختے پر جگہ خالی کی، جوزف بیٹھ گیا۔ مَیں نے اُسے جواب دیا۔ ''اس ملاقات کے لیے کسی خاص توجہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان عمر بھر میں اپنے آپ ہی سے سب سے زیادہ باتیں کرتا ہے اور اپنے آپ کو ہی سب سے زیادہ جھیلتا

ہے۔ شاید کسی اور میں اسے اس قدر جھیلنے کی تاب بھی نہیں ہوتی۔ انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دوست اور سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ باقی اس کی اپنی ذات سے باہر ہونے والی دوستیاں اور بھی دشمنیاں عارضی اور ناپائیدار ہوتی ہیں۔''

جوزف غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا ''خود سے بہت ناراض لگتے ہو۔ یہ تلخی بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی۔ لگتا ہے کوئی بھٹی تمہارے اندر سلگ رہی ہے۔''

میں نے باتوں کا رخ کسی اور طرف موڑنا چاہا۔ ''لیکن آپ۔۔۔ آپ نے نام کے علاوہ اپنا کوئی دوسرا تعارف نہیں کروایا۔''

جوزف نے گہری سی سانس لی۔ ''نام تو تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ یہیں اسی یونیورسٹی میں فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوں۔''

مَیں نے جلدی سے معذرت پیش کی۔ ''معاف کیجئے۔۔۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ آپ کا انداز دراصل اساتذہ والا نہیں ہے ورنہ میں اتنی بے تکلفی۔۔۔''

جوزف نے ہنس کر میری بات کاٹ دی۔ ''اس معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ دراصل میں جان بوجھ کر یہاں کو نوجوانوں کو پہلی دفعہ اپنا پورا تعارف نہیں کرواتا۔ ایسا کرنے سے وہ مؤدب یا محتاط ہو جاتے ہیں اور مَیں ان میں گھلنے ملنے کا موقع کھو دیتا ہوں۔ مَیں یہی چاہوں گا کہ ہم ہمیشہ اسی بے تکلفی سے ملتے اور بات کرتے رہیں۔ تم ایک مختلف نوجوان ہو۔ تم سے ملنا واقعی ایک انوکھا تجربہ ہے میرے لیے۔'' جوزف جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

''میری کلاس کا وقت ہو رہا ہے حماد۔ مجھے اُمید ہے بہت جلد ہماری ایک دوسری ملاقات ہو گی جو اس جیسی کئی ملاقاتوں کا ایک پیش خیمہ ثابت ہو گی۔'' جوزف گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ کچھ دیر میں کامران کے آنے کا بھی وقت ہو گیا۔ میں بھی سامنے بہتے شفاف پانی اور پرندوں سے رخصت لے کر یونیورسٹی کی لمبی لمبی راہداریوں سے ہوتا ہوا باہر گیٹ پر آ گیا۔ باہر کامران کی گاڑی پہلے سے موجود تھی۔ میں نے کامران کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، موصوف کچھ دور ایک پاپ کارن کی مشین کے قریب کھڑی دو نوجوان میموں کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھے اور انہیں یقین دلا رہے تھے کہ بہت

جلد ان کی زندگی میں ایک خوبرو ایشیائی نوجوان آنے والا ہے جس کے آتے ہی ان کی زندگیوں میں انقلابی تبدیلیاں آجائیں گی۔ مجھے کامران کی اس صلاحیت پر ہمیشہ سے ہی رشک آتا تھا۔ مجھے کسی اجنبی لڑکی تو کیا، کسی اجنبی مرد سے بھی پہلی مرتبہ بات کرتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہوتی تھی تاوقتیکہ وہ اجنبی خود ہی بات کرنے میں پہل نہ کردے۔ جب کہ کامران راہ چلتے اُٹھتے بیٹھتے، سوتے کسی بھی وقت کسی کو بھی روک کر گھنٹوں باتیں کرسکتا تھا۔ شاید میرے اندر ٹھکرائے جانے کا ڈر ہمیشہ سے موجود رہا تھا اور کامران ایسے کسی خوف سے بالکل ناآشنا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے میری طرف ہاتھ ہلایا۔ ان گوری میموں کو اپنا کارڈ دیا۔ ان کے فون نمبرز لیے اور مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھ آیا۔ ہم گاڑی میں سوار ہوگئے۔ مَیں نے کامران کو گھورا، ''تم کبھی نہیں سدھرو گے۔۔۔۔ ہے نا۔''

کامران ہنسا، ''ارے یار بور ہو رہا تھا پندرہ منٹ سے یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑا۔ سوچا ان کا ہاتھ ہی دیکھ لوں۔''

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ میں نے تمہاری پچھلی سات نسلوں میں کسی دست شناس کا تذکرہ تک نہیں سنا۔''

کامران کے ہونٹوں پر اب بھی وہی شریری مسکراہٹ تھی۔ ''جانے دے نا یار۔۔۔۔ یہ بتاؤ کہ لنچ کا کیا پروگرام ہے۔ میرے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہیں۔'' میں نے سیٹ بیلٹ کچھ ڈھیلی کی۔ ''ہوں۔۔۔۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ کہیں بھی لے چلو۔''

کامران نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ ''پکاڈلی کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ کافی تعریف سنی ہے۔''

ہماری گاڑی لندن کی دورویہ اور چار رویہ بڑی بڑی شفاف سڑکوں سے ہوتی ہوئی بگ بین (Big Ban) کے سامنے سے دائیں کو مڑ گئی۔ لندن کے مشہور بُرجوں والے پُل سے ہوتے ہوئے ہم پکاڈلی کی طرف مڑ گئے۔ مجھے لندن کی یہ چوڑی چوڑی سی سڑکیں ہمیشہ سے بہت بھلی لگتی تھیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اٹھارویں کے آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں یورپین حکام نے عوام کی بغاوتوں اور بلووں کو روکنے کی حکمت عملی کے طور پر ان تمام شاہراہوں کو چوڑا کروا دیا تھا تاکہ حکومت اور فوج کا عملہ آسانی کے ساتھ ہجوم کو ایک ہی

جگہ قابو میں رکھ سکے۔

پکاڈلی سرکس سے بائیں مڑتے ہی دورویہ درختوں کی لمبی سی قطار سے ڈھکی ایک خاموش اور سنسان سی سڑک شروع ہوگئی۔ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چوڑی سی نالی میں پگھلتی ہوئی برف کا پانی ایک انجانے سے سُر کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں اور کامران اس سڑک پر مڑتے ہی ایک دم سے خاموش سے ہوگئے۔ جیسے قدرت کی اس بے پناہ خوبصورتی نے ہماری زبانیں ہی سلب کرلی ہوں۔ سڑک پر درختوں سے گرے ہوئے سرخ اور زرد پتوں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ جو زور کی ہَوا چلنے سے اس بھیگی ہوئی سڑک پر کچھ اس طرح لہراتے تھے جیسے کوئی ریشمی کپڑا بچھائے کوئی کابلی پٹھان بیٹھا ہو، جو اپنی گٹھڑی سے رنگ برنگے نئے تھان نکال کر ہَوا میں لہرا رہا ہو۔

کبھی کبھی ہم چند پلوں میں ہی اپنی ساری زندگی پھر سے جی لیتے ہیں، درختوں اور ان سے خزاں رسیدہ پتوں سے گھری ہوئی اس سڑک پر ہم دونوں کا یہ سفر بھی زندگی کے انہی چند پلوں میں سے ایک تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم یہ بھول ہی گئے تھے کہ ہم اس سڑک کے اختتام پر بنے ایک نئے ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کے لیے نکلے تھے۔

بالآخر دنیا کی ہر اچھی چیز کی طرح اس سڑک کا بھی اختتام ہو ہی گیا۔ ہم نے لکڑی کے بنے ہوئے اس چھوٹے سے خوبصورت ریسٹورنٹ میں اپنی پسند کا لنچ کیا۔ کامران مجھ سے یونیورسٹی کے بارے میں پوچھتا رہا اور مَیں نے اُسے سر آئزک کے لیکچر اور اپنے تعارف پر کلاس روم کی خاموشی کے بارے میں بتایا۔ کامران ایسے موقعوں پر بالکل پینڈو ہوجاتا تھا۔ اسے اپنے غصے پر بالکل کنٹرول نہیں رہتا تھا۔ اس نے زور سے گلاس میز پر مارا۔۔۔۔'' یہ سالے گورے کہیں کے۔۔۔ ان کی تو۔۔۔'' بڑی مشکل سے مَیں نے اُسے قابو کیا۔ کامران کا موڈ اب بھی خراب تھا۔ مَیں نے اسے موڈ میں لانے کے لیے ایک لطیفہ سنایا۔۔۔

''ایک گوری میم پر کسی کتے نے کاٹنے کے لیے حملہ کردیا۔ پاس سے گزرتے ایک شخص نے جان پر کھیل کر اس کتے سے میم کی جان بچائی۔ اگلے دن کے اخباروں میں کتے سے میم کو بچاتے ہوئے اس شخص کی تصویر چھپی اور ہیڈ لائن لگی۔ ''انگلش ہیرو نے عورت کو کتے سے بچا لیا۔''

اس شخص نے اخبار کے دفتر فون کر کے کہا، ''میں انگریز نہیں ہوں۔'' دوسرے دن اخبار نے پھر سرخی لگائی ''غیر ملکی ہیرو نے عورت کو جان پر کھیل کر کتے سے بچایا۔'' اس شخص نے پھر اخبار کے دفتر فون کیا اور بتایا کہ میں غیر ملکی نہیں، ''پاکستانی اور مسلمان ہوں۔''

تیسرے دن اخبار نے اسی تصویر کے نیچے یہ سرخی لگائی، ''خطرناک دہشت گرد نے پالتو کتے پر حملہ کر دیا۔''۔۔۔

کچھ دیر تک تو کامران حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر ہم دونوں کے منہ سے بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ وہ چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہمارے قہقہوں سے گونج رہا تھا اور آس پاس کے لوگ ہمیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

OO

گھائل

بچپن میں جب کبھی مجھے کھیلتے ہوئے دوڑ بھاگ میں کوئی چوٹ لگ جاتی تھی تو مَیں کبھی دوسروں کے سامنے نہیں روتا تھا نہ شدید سے شدید درد میں بھی میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ لوگوں کے سامنے میرے آنسو نہ نکلیں۔ ایسی صورت میں مَیں فوراً کسی گوشۂ تنہائی کی طرف بھاگتا اور وہاں دل کھول کر روتا۔ دراصل مجھے بچپن سے ہی سب کے سامنے رونا بہت معیوب لگتا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ہم دوسروں کے سامنے رو کر اپنی عزت ان کی نظروں میں کھو دیتے ہیں۔

مولوی صاحب کے گھر سے واپسی کے بعد بھی میری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ رونا چاہتا تھا لیکن رونے کے لیے جگہ میسر نہ تھی۔ عجیب بے بسی تھی۔

مولوی صاحب صحت یاب ہونے کے بعد دوبارہ سے سَنی کو درس دینے کے لیے آنے لگے تھے۔ ان دنوں میں کسی بھی بہانے سے سنی اور مولوی صاحب کے آس پاس ہی چکر کاٹتا رہتا تھا۔ اس اُمید میں کہ شاید سنی ان سے ایمان کی کوئی بات کرے۔۔۔ یا پھر مولوی صاحب ہی اپنے گھر کا کوئی تذکرہ چھیڑ دیں۔ لیکن میری یہ اُمید بھی ہمیشہ ٹوٹتی ہی رہی۔

پھر میرے جنوں نے ایک اور روپ دھارا۔ میں مولوی صاحب کے آنے کے انتظار میں رہتا اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوتے مَیں گاڑی نکال کر ان کے محلے کے گیٹ کے سامنے اور کبھی کبھار تو بالکل ہی ان کی گلی کے پاس لے جا کر گاڑی لگا دیتا اور مولوی صاحب کے واپسی تک گاڑی میں ہی بیٹھا ٹکٹکی لگائے اس نازنین کی راہ تکتا رہتا۔ اس امید پر کہ کبھی نہ کبھی تو وہ گھر سے باہر نکلے گی۔ لیکن یہ حسرت بھی ہمیشہ ناکام ہی رہی۔ میں نے کبھی کسی کو اس گھر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ ہاں البتہ آس پاس سے گزرتے محلے کے مکین میری گاڑی سے اچھی طرح سے واقف ہو چکے تھے۔ البتہ ان میں سے کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ

مولوی صاحب کے گھر کئی مرتبہ شاکر کو ایسی بڑی گاڑیوں میں آتا جاتا دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اسے بھی کچھ اسی طرح سے تعبیر کیا ہوگا۔ البتہ یہ خیریت رہی کہ ان میں سے کسی نے بھی مولوی صاحب سے تذکرہ نہ کیا۔ ورنہ میرے لیے جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا۔

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے اور میرا جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر جیسے قدرت کو مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ ایک ایسی ہی گرم سہ پہر کو جب مولوی صاحب سنی کو درس دے رہے تھے۔ شاکر انہیں ڈھونڈتا ہوا اسی گول کمرے کی طرف آ نکلا جہاں میں بھی یونہی بلاوجہ بیٹھا کب سے رسالے کے ایک ہی صفحے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ شاکر نے آتے ہی مولوی صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ اس کی بڑی بیٹی کی منگنی طے ہوگئی ہے اور اگلے جمعے کی سہ پہر مولوی صاحب بمع خاندان کے اس کے گھر مدعو ہیں۔ مولوی صاحب نے منگنی طے ہونے پر شاکر کو بے حد مبارک باد دی اور خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن انہوں نے شاکر سے معذرت کی کہ جمعے کے دن کا تو وہ پہلے ہی کسی تبلیغی جماعت سے وعدہ کر چکے ہیں کہ ان کے ساتھ علاقے کے گشت پر چلیں گے اور اب اس وعدے کو ٹالنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ البتہ انہوں نے یہ وعدہ ضرور کیا کہ وہ اپنے بھتیجے عبداللہ کے ساتھ باقی گھر والوں کو منگنی کی تقریب میں ضرور بھیج دیں گے۔ مجھے یوں لگا جیسے برسوں کسی ویران بیابان صحرا میں پھرتے پھرتے اچانک کوئی نخلستان دور سے مجھے نظر آ گیا ہو۔ میں جانتا تھا کہ شاکر یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے اس امارت زدہ گھر میں سے کوئی بھی اس کی اس خوشی میں شریک ہونے نہیں آئے گا، ہم سب کو دعوت ضرور دے گا۔ شائد قدرت نے مجھے اس کی ایک جھلک دکھانے کے لیے ہی یہ سب انتظام کیا ہو اور پھر ہوا بھی یونہی۔ بابا نے حسب معمول ایک لمبا سا ہنکارا ابھرا، اور جیب سے پرس نکال کر چند بڑے نوٹ شاکر کے حوالے کر دیے۔

''میری طرف سے بیٹی کے لیے کچھ لے لینا۔''

امی نے بھی گھر میں کام کرنے والیوں کو پُرانے صندوق اور الماریاں کھنگالنے کا کہا اور کپڑوں اور پُرانے زیورات کی ایک گٹھڑی شاکر کے حوالے کر دی گئی، شاکر نے سب کی طرف سے مایوس ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''میں ضرور آ جاؤں گا۔ وعدہ رہا۔''

بابا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے، جواُن کے پائپ کے دھویں کے پیچھے کھو گئے۔ امی اور بھابھی نے بھی ناک بھوں چڑھائی لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس مرتبہ شاکر کی خوشی میں شرکت کرنے میں میری اپنی شدید غرض بھی شامل تھی، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر بات ایمان کی ایک جھلک کی نہ بھی ہوتی تو میں ضرور شاکر کے گھر جاتا۔ اس کا اور میرا رشتہ نوکر اور مالک سے بہت بڑھ کر تھا اور تمام گھر والے بھی بچپن سے میری شاکر سے اس اُنسیت سے اچھی طرح واقف تھے۔

شاکر بہت پہلے مولوی صاحب کے اس چھوٹے سے محلے میں ہی رہتا تھا، اُسے بہت چھوٹی عمر میں دادا جان نے گھر کی ڈرائیوری پر رکھ لیا تھا۔ بابا کی شادی بھی اس کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ بعد میں کچھ سالوں کے بعد شاکر کی بھی شادی ہوگئی تو دادا نے ان دونوں میاں بیوی کو اپنے بنگلے کے پیچھے بنے سرونٹ کوارٹرز میں رہنے کی جگہ دے دی۔ سرونٹ کوارٹرز کیا تھے اچھے خاصے بڑے مکان تھے جو ہماری پُرانی حویلی کے پچھواڑے بنے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں دادا جان کے ہاں ان کے گاؤں کے رشتے داروں کا بہت آنا جانا تھا۔ سو انہوں نے پچھلے حصے میں یہ تین چار کوارٹرز ڈلوا لیے تھے۔

دادا کی وفات کے بعد بابا نے اپنی کمشنری کے تقاضوں کے مطابق اس جدید علاقے میں یہ کوٹھی بنوائی تھی۔ البتہ ہماری پُرانی حویلی شہر کے مضافات میں اب بھی موجود تھی۔ شاکر اور اس کا خاندان ہی اب بھی اس حویلی کی رکھوالی کرتا تھا اور ان کی رہائش اب بھی وہیں تھی۔ شاکر کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک چھوٹی بیٹی شامل تھی۔ دونوں بیٹے محنت مزدوری کے سلسلے میں شہر سے زیادہ تر باہر ہی رہتے تھے۔ بابا کی خاص دعوتیں اور اجلاس وغیرہ اب بھی اسی حویلی میں ہی منعقد کیے جاتے تھے۔ بلکہ آج کل تو بابا اس پُرانی حویلی کو اپنا کیمپ آفس بنانے کا سوچ رہے تھے۔

شاکر تو اپنی بیٹی کی منگنی کا نیوتا دے کر واپس چلا گیا تھا لیکن اَب میرے لیے ایک ایک پل کاٹنا کس قدر دشوار تھا۔ یہ بس میں ہی جانتا تھا۔ دن پہر گھنٹے اور لمحے۔۔۔۔ مجھے اس قدر طویل کبھی محسوس نہیں ہوئے تھے جتنے ان چار دنوں میں، آخر خدا خدا کر کے جمعے کا دن بھی آ ہی گیا۔

مجھے یاد ہے اس دن میرا دل کر رہا تھا کہ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی میں پُرانی حویلی کے گیٹ سے ملحق باغ میں جا بیٹھوں جہاں سے تمام مہمانوں کو داخل ہونا تھا۔ وہ بھی تو وہیں سے گزرے گی۔ جانے وہ کیسا لمحہ ہوگا جب مَیں پھر اُسے ایک مرتبہ دیکھ پاؤں گا۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ تقریب کا وقت شام 4 بجے کا رکھا گیا تھا اور ابھی تک تو ٹھیک سے صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔

مَیں سہ پہر تک کسی کھوئے ہوئے مسافر کی طرح اپنے ہی گھر کی راہداریوں میں اور روشوں میں کٹی پتنگ کی مانند ڈولتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ لمبے گھنٹوں کی طرح کیسے گزرتے ہیں۔ نہ جانے کب دن کے دو بجے اور مَیں اس بچے کی طرح گاڑی نکال کر اپنی پُرانی حویلی کی طرف بھاگا جو اپنے روزے کے دن عصر کے وقت سے ہی روزہ کھلنے کے انتظار میں دسترخوان پر جا بیٹھتا ہے۔

شاکر مجھے اس قدر جلدی وہاں پا کر بے حد خوش اور کچھ پریشان بھی ہوا۔ کیونکہ ابھی تک تو وہ اور اس کے بیٹے انتظامات میں ہی مشغول تھے۔ بڑی مشکل سے مَیں نے شاکر کو اس بات پر راضی کیا کہ وہ میری فکر چھوڑ دے۔ وہ اپنے کام جاری رکھے۔ تب تک مَیں حویلی کا ایک چکر لگا لوں گا۔ شاکر کو دکھانے کے لیے کچھ دیر تک میں اپنی آبائی حویلی میں گھومتا پھرتا رہا اور جیسے ہی شاکر کا دھیان دوسری طرف ہوا مَیں نظر بچا کر گیٹ کے پاس والے باغیچے میں لگی کرسیوں میں سے ایک پر آ بیٹھا۔ تمام مہمانوں کو اسی مرکزی گیٹ سے ہی اندر آنا تھا کیونکہ شاکر کے کوارٹر کے لیے حویلی میں دوسرا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ساڑھے تین بجے سے مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی اور میری دھڑکن کی اتھل پتھل بھی۔۔۔۔ جب بھی کوئی پردہ نشیں دور سے گیٹ کی طرف آتی نظر آتی۔ میری سانسیں تھمنے لگ جاتیں۔ لیکن جس کے انتظار میں مَیں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا تھا اس کا اب تک دور دور تک کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ نہیں آئے گی۔ کہیں مولوی صاحب نے ہی منع نہ کر دیا ہو؟ کہیں کوئی اور مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟ ہزار وسوسے تھے جو ایک ایک پل میں دل میں آتے اور میری وحشت کو بڑھا کر واپس چلے جاتے۔

پھر اچانک اس ٹھنڈی سڑک کے موڑ سے، جس کے کنارے ہماری حویلی موجود تھی۔

ایک تانگہ اپنی مخصوص ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ نمودار ہوا۔ میری نظریں آخری اُمید کے ٹمٹماتے دیے کی طرح اس تانگے کی مخصوص رفتار پر جم سی گئیں۔ تانگہ حویلی کے بڑے چوبی گیٹ کے سامنے آخر رک گیا۔ اس میں اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ ایک پُرنور چہرے اور ہلکی سی داڑھی والا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ سفید شلوار کرتے میں ملبوس اس نوجوان نے اُتر کر کوچوان کو کرایہ دے کر فارغ کیا اور پچھلی سیٹ سے سیاہ برقعوں میں ملبوس دو لڑکیاں نیچے اُتریں۔ فضا تھم سی گئی، ہوا ساکت ہوگئی اور درختوں کے سبھی پرندے چہچہانا بھول گئے۔ وہ وہی تھی۔ میں ان نازک قدموں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ یقیناً اس کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں لڑکیوں کی صرف آنکھیں نقاب سے باہر تھیں۔ اف۔۔۔۔ پھر وہی آنکھیں۔۔۔۔ اس نوجوان نے حیرت سے پہلے اس عظیم الشان حویلی کو دیکھا اور پھر لڑکیوں سے جیسے ایک مرتبہ دوبارہ تصحیح چاہی کیونکہ ایک ڈرائیور کی ایسی رہائش گاہ کا اسے تصور بھی نہ ہوگا۔ پھر شاید جیسے چھوٹی والی نے اُسے کچھ سمجھایا۔ وہ نوجوان انہیں لیے جیسے کسی شش و پنج میں جھجکتے ہوئے گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ شاید وہ سب پہلی مرتبہ شاکر کے گھر آئے تھے۔

دفعتاً اس نوجوان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اور یہ کیا؟ وہ تینوں تو میری جانب ہی بڑھ رہے تھے۔ مَیں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹی والی کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر شناسائی کی ایک چمک لہرائی اور اس نے سرگوشی میں ایمان سے کچھ کہا۔ شاید چھوٹی مجھے پہچان گئی تھی۔ ایمان نے ایک نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک بجلی سی چمکی۔۔۔۔ یہ اس کی دوسری نظر تھی جو میری نظر سے ٹکرائی تھی۔ بے خودی کی ایک لہر مجھ پر طاری ہوگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی پہلی نظر سے لے کر اس دوسری نظر تک کے فاصلے کے درمیان مجھ پر جو بھی گزری، میری تڑپ، میری کسک، میری وحشت اور میری دربدری۔۔۔۔ سب کو قرار مل گیا ہو۔

میرے قریب آ کر لڑکے نے مجھے سلام کیا۔ ”جناب۔۔۔۔ یہ شاکر صاحب۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جن کی بیٹی کی آج منگنی ہے، اُن کا گھر۔۔۔۔؟“

مَیں نے جلدی سے کہا۔ ”جی جی۔۔۔۔ آپ ٹھیک جگہ پر آئے ہیں۔ یہاں سے اس راستے سے ہوتے ہوئے آپ پیچھے چلے جائیے۔ تقریب وہیں ہو رہی ہے۔“

لڑکا میرا شکریہ ادا کر کے اور ہاتھ ملا کر انہیں لیے آگے بڑھ گیا۔ مَیں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی ایمان کی طرف براہِ راست دیکھنے سے روکے رکھا۔ لیکن نہ دیکھنے کے باوجود اس کے قرب کا ایک عجیب اور لطیف سا احساس میرے ساتھ رہا۔ چھوٹی والی ایمان البتہ کچھ چلبلی سی لگتی تھی۔ وہ جاتے ہوئے پھر سے مجھے غور سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ یوں لگا جیسے زندگی پھر سے حرکت میں آ گئی ہو۔ ہَوا پھر سے چلنے لگی، پرندے پھر سے چہچہانے لگے۔ مَیں وہیں کرسی پر نڈھال ہو کر جیسے گر سا گیا۔ زندگی میں چند لمحے ایسے ہوتے ہیں جنھیں ہم بار بار جینا چاہتے ہیں۔ یہ پل میری زندگی کے انہی چند لمحوں میں سے ایک تھا۔ لیکن افسوس ہر بُری بات کی طرح ہر اچھی بات بھی گزرنے کے بعد صرف ایک یاد بن کر رہ جاتی ہے۔ میں کافی دیر وہیں بیٹھا خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ سب خواب نہیں تھا اور ابھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ یہیں موجود تھی۔ میرے سامنے، میرے اتنے قریب۔

اندر سے عورتوں کے ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کی آوازیں آنے لگی تھیں اور پھر اندر سے شاکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آ نکلا۔

''ارے حماد بابا۔۔۔ آپ ادھر بیٹھے ہیں۔۔۔ وہاں تقریب میں سبھی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آیئے نا۔۔۔''

شاکر زبردستی میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر مردانے میں لے گیا۔ وہاں سبھی مجھے دیکھ کر مؤدب سے ہو گئے اور ان کا ہنسنا بولنا اور باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ مَیں اسی لیے اس ہجوم میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی آپ کا اپنا تعارف ہی آپ کے لیے سب سے بڑا روگ بن جاتا ہے۔ یہاں پر سب مجھے شاکر کے مہمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کے بیٹے کی حیثیت سے پہچان رہے تھے۔ لہٰذا میں جلد ہی اس محفل سے اکتا گیا، ویسے بھی میرا دھیان ہی کہاں تھا ان سب باتوں کی طرف۔ پھر شاکر کو اندر کسی نے زنانے میں بلوا لیا اور مجھے وہاں سے باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ میں نے شاکر کو خصوصی تاکید کی تھی کہ مہمانوں کو بٹھانے کا اور ان کے طعام کا انتظام کھلی جگہ پر کرے، اس مقصد کے لیے میں نے اصرار کر کے اُسے حویلی کا بڑا ہال بھی استعمال کرنے کا کہا تھا۔ اُسے بابا کی ناراضگی کا ڈر تھا لیکن میری

ضد کے سامنے اُسے ہمیشہ ہی ہار ماننا پڑی تھی، اسے بڑے ہال کو اب مردانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ اور اس ہال کے پچھلے دروازے کے بالکل سامنے شاکر کے کوارٹر کا چھوٹا سا باغیچہ اور اس کے پیچھے شاکر کا گھر تھا، جیسے ہی مَیں ہال سے باہر نکلا وہی نوجوان جو ایمان اور حیا کے ساتھ آیا تھا۔ کچھ مضطرب سا مجھے ہال کے دروازے کے باہر کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔ ''معاف کیجیے۔۔۔ مَیں اس وقت آپ کو پہچان نہیں پایا۔۔۔ میرا نام عبداللہ ہے۔ مَیں مولوی علیم الدین صاحب کا بھتیجا ہوں چچا اکثر آپ کی باتیں کرتے ہیں۔''

خوشگواری کی ایک لہر سی میرے تمام وجود میں پھیل گئی، تو گویا کسی بہانے ہی سہی ۔۔۔ میرا ذکر نا چیز بھی اس چار دیواری میں ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے کبھی میرا نام اس مہ جبیں کے ہونٹوں پر بھی آیا ہو۔ اُس وقت جانے کیوں، زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے نام پر خود بخود پیار آنے لگا۔ مَیں نے اس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اس دن آپ کے گھر آنا ہوا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی لیکن آپ یہاں باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلیے۔ کچھ ہی دیر میں چائے کا اہتمام ہونے والا ہے۔''

عبداللہ نے کچھ تذبذب سے کہا، ''دراصل مغرب کا وقت ہونے والا ہے۔ آپ تو چچا کی طبیعت سے واقف ہیں۔ ہمیں اب نکلنا چاہیے۔ مَیں اس انتظار میں یہاں کھڑا ہوں کہ اندر سے کسی کو بھیج کر گھر کی خواتین کو بلوالوں تو چلوں۔''

اتنے میں شاکر اندر زنانے سے برآمد ہوا۔ ہم دونوں کو باہر کھڑا دیکھ کر وہ جلدی سے ہماری طرف بڑھا۔۔۔ ''حماد بابا۔۔۔ خیر تو ہے۔۔۔ آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔''

مَیں نے مسکرا کر اُسے عبداللہ کی طرف متوجہ کیا۔

''میری طرف سے تو سب خیر ہی ہے۔ لیکن عبداللہ میاں واپسی کی فکر میں ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ دیر ہو رہی ہے۔''

شاکر نے حیرت اور کچھ شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''ابھی سے۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ ابھی تو انگوٹھی بھی نہیں پہنائی گئی۔ اور پھر مغرب

کے بعد کھانا کھائے بناء میں ہرگز کسی کو نہ جانے دوں گا۔ ناممکن۔''۔۔۔ عبداللہ انکساری سے گویا ہوا۔

''شاکر چچا۔۔۔ مغرب کے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ہماری طرف کی سواری ملنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اور پھر چچا۔''

''بھئی مولوی صاحب سے تو میں خود نمٹ لوں گا۔۔۔ وہ جانتے ہیں کہ میری اکلوتی بچی کی خوشی ہے، ایسے میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔۔۔ رہی بات سواری کی۔۔۔ تو میں خود تم لوگوں کو واپس چھوڑ دوں گا۔۔۔ بس طے ہو گیا۔''

شاکر نے حتمی فیصلہ دے دیا۔ عبداللہ کے پاس بھی مزید بحث کی اب کوئی گنجائش نہ تھی، اس نے شاکر سے مغرب کی نماز کے لیے اجازت چاہی اور قریبی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ شاکر نے اُسے جلد واپس لوٹنے کی تاکید کی۔ پھر جیسے اچانک شاکر کو کچھ یاد آیا۔ اس نے زور سے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

''ارے حماد بابا۔۔۔ دیکھو اب واقعی بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔۔۔ اندر نگہت کی امی تمھیں بلاتی ہیں۔''۔۔۔ نگہت شاکر کی بیٹی کا نام تھا۔ بچپن میں میری ساری کتابیں سال ختم ہونے کے بعد نگہت کے پاس ہی جاتی تھیں۔ شاکر کو اپنی بیٹی کی تعلیم کی بڑی فکر لگی رہتی تھی۔ نگہت جب چھوٹی تھی تو وہ اپنے ابا کے ساتھ کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آتی تھی۔ وہ خاموش سی چھوٹی بچی مجھے اب تک یاد تھی۔ شاکر کی بیوی کو بچپن سے خالہ کہتا تھا جس پر میری اصل خالائیں خاصی جز بز ہوتیں تھیں اور ان سے میں خاصا مانوس بھی تھا۔ جیسے آج کل سنی مولوی صاحب کے لیے گھر سے چھپ چھپ کر چیزیں لے جاتا تھا اسی طرح میں بچپن میں نگہت اور خالہ کے لیے اپنے اسکول بیگ میں چاکلیٹس، کتابیں اور دیگر چیزیں لے جایا کرتا تھا۔ اسکول سے واپسی پر میں شاکر سے ضد کر کے چند لمحوں کے لیے پُرانی حویلی رکتا اور اپنے چھوٹے چھوٹے معصوم تحفے خالہ اور نگہت کو دے آتا۔ خالہ اس بات پر مجھ سے ہمیشہ ناراض بھی ہوتیں لیکن میرا یہ معمول تمام اسکول لائف میں جاری رہا۔۔۔ جب تک کہ مجھے بورڈنگ نہیں بھیج دیا گیا۔ البتہ بورڈنگ سے بھی جب میں چھٹیوں میں گھر واپس آتا تو اس خاندان سے ملنے ضرور جایا کرتا۔

میں جانتا تھا، خالہ شاکر سے میرے بارے میں ضرور پوچھیں گی اور مجھے اندر ضرور بلوائیں گی۔ لیکن جانے کیوں میں اس پل سے گھبرا رہا تھا، کترا رہا تھا۔ میں اس وقت اندر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں سب ہوں گے۔ اور پھر سب نہ بھی ہوں تو کیا ہے وہ تو ہوگی۔ پتہ نہیں اس کے سامنے میں خالہ سے یا نگہت سے ڈھنگ سے بات بھی کر پاؤں گا یا نہیں۔ پہلے وہ یہاں آتے وقت گیٹ پر میری ہڑبڑاہٹ ضرور محسوس کر چکی ہوگی۔ لیکن بہر حال، اس وقت شاکر کو ٹالنے کا یا انکار کرنے کا کوئی موقع بھی مجھے میسر نہ تھا۔ شاکر میرے سر پر ہی کھڑا تھا اور مجھے ساتھ لے کر ہی وہ وہاں سے ٹلتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں تنہا کبھی بھی اندر نہیں جاؤں گا۔ شاکر کے ساتھ بھی میرا عجیب رشتہ تھا۔ میں نے کبھی اسے چچا، بابا یا کسی اور احترام کے نام سے پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جب کبھی مجھے اسے پکارنا ہی پڑ جاتا تو میں شاکر کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ بچپن سے ہی میرا یہی معمول تھا۔ میں نے کبھی کسی روایتی طریقے سے اپنے دل میں موجود احترام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ شاید ہمارے بیچ موجود اس رشتے کو کسی روایتی نام یا احترام کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

شاکر مجھے لپٹے ہوئے اندر زنانے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر سے عورتوں کے ہنسنے بولنے، ڈھولکی اور شادی بیاہ کے گیتوں کا شور سنائی دے رہا تھا، صحن میں، برآمدے میں اور اندر کمروں میں ہر طرف عورتیں ہی عورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سب میری جانب متوجہ ہو گئیں۔ کچھ ہنسیں، کچھ نے سرگوشیوں میں ایک دوجے سے نہ جانے کیا کہا، میں اسی لیے اس طرح کے نسوانی ہجوم میں جانے سے ہمیشہ جھجکتا تھا، جب بہت سی عورتیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو وہ بہت بے باک ہو جاتی ہیں اور پھر معاملہ کسی ایسی منگنی یا شادی بیاہ کی تقریب کا ہو تو یہ بے باکی مردوں کو بھی مات دیتی ہے۔

خالہ مجھے دیکھ کر آگے بڑھی اور جلدی سے اُس نے میری بلائیں لے لیں۔ نگہت جو سر جھکائے گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی، اُس نے میری آمد کا شور سن کر ہلکے سے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا اور اشارے سے اپنے پاس بلایا، شاکر نے میرے لیے بمشکل راستہ خالی کروایا۔ میں نے نگہت کے سر پہ ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

''میں جانتا تھا۔ یہ ساری شرارت تمھاری ہی ہوگی، کم از کم اپنی منگنی کے دن تو چپ کر

کے بیٹھی رہتیں۔۔۔‘‘

نگہت گھونگھٹ تلے مسکائی۔

’’حماد بھیا۔۔۔ابا نے منگنی کے بعد مجھے کالج جانے سے منع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں سُسرال والے بُرا مناتے ہیں۔ آپ ابا سے بات کیجئے نا۔۔۔ میری خاطر۔‘‘ لو بھلا ۔۔۔لڑکیاں مہندی اور منگنی والے دن جانے کیا کیا سوچتی ہیں کہ ان کا ہونے والا دولہا کیسا ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ اور ان محترمہ کو آج کے دن بھی اپنی پڑھائی کی ہی سوجھ رہی ہے۔ مجھے زور کی ہنسی آ گئی۔ مَیں نے دھیرے سے نگہت کے کان میں کہا۔

’’تمھارے سُسرال والوں کی تو ایسی کی تیسی۔۔۔۔ بے فکر ہو جاؤ۔۔۔ کوئی تمھیں مزید پڑھنے سے نہیں روک سکتا۔ نہ تمھارے ابا اور نہ تمھارا چھ مہینے بعد ہونے والا میاں۔ مَیں خود بات کرلوں گا۔ اب خوش۔‘‘

اور واقعی خوشی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو ہی تو آ گئے۔ یہ لڑکیوں کا دل اتنا چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ ذرا ذرا سی بات پہ رو دینے والا، اور پھر خوش بھی کتنی چھوٹی سی بات پر ہو جاتی ہیں۔ دل کا شیشہ اتنا صاف کیسے رکھ لیتی ہیں یہ سب لڑکیاں۔۔۔؟

دفعتاً میری نظر چھوٹی حیا پر پڑی۔ وہ اسی کمرے میں موجود تھی جہاں نگہت کو بٹھایا گیا تھا۔ حیا پاس بیٹھی کسی عورت سے ہلکی آواز میں کچھ بات کر رہی تھی، لیکن ایمان مجھے اس کمرے میں کہیں دکھائی نہ دی۔ مَیں اَب یہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن شاکر عورتوں کے اس ہجوم میں مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بچپن سے اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ سوچا ساتھ والے کمرے سے ہوتا ہوا پچھلے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا کیونکہ سامنے برآمدے میں تو خواتین کی ایک بڑی تعداد نیچے فرش پر ہی دری ڈالے دھرنا جمائے بیٹھی تھیں۔ البتہ ساتھ والا کمرہ چونکہ رہائشی تھا اس لیے اس طرف کسی کے ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ اس دوسرے کمرے کا ایک دروازہ پچھلے صحن میں کھلتا تھا، جہاں اس وقت دیگیں وغیرہ چڑھائی جا رہی تھیں۔

مَیں نے نگہت کو اشارہ کیا کہ مَیں بعد میں اس سے ملتا ہوں اور دونوں کمروں کو ملانے والے درمیان کے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں شام کے وقت کی

وجہ سے ملگجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کمرہ سنسان تھا۔ مَیں اپنی ہی دھن میں پچھلے صحن کی طرف کھلنے والے جالی کے دروازے کی طرف بڑھا، اچانک دیوار کے ساتھ بنی ہوئی لکڑی کی بڑی سی الماری کے عقب سے کوئی جلدی میں اپنا آپ سنبھالتے ہوئے نکلا، اس الماری میں زیادہ تر گھر کی کراکری اور شیشے کے برتن وغیرہ پڑے ہوتے تھے۔ وہ سایہ اپنی ہی جھونک میں مجھ سے ٹکرایا اور اُس کے ہاتھ سے شیشے کی تین چار پلیٹیں پھسل کر فرش پر گر گئیں۔ ایک دبی سی نسوانی چیخ فضا میں اُبھری، سچ تو یہ ہے کہ مَیں خود بھی بوکھلا سا گیا، مجھ سے ٹکرا کر وہ سایہ لڑکھڑا سا گیا لیکن اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا تھا، لیکن اس تمام معاملے میں سنبھلتے سنبھلتے آنچل ڈھلک کر کاندھوں پر آ چکا تھا۔ وہ ایمان تھی، قیامت کی گھڑی کا تذکرہ تو سب نے ہمیشہ سنا ہوگا لیکن وہ قیامت کی گھڑی ہوگی کیسی؟ اس کا شاید کسی کو مجھ سے بہتر اندازہ کبھی نہ ہوگا۔ اُس کا حسن بے حجاب تھا اور مجھ سے اس قدر قریب تھا کہ اس کی اُلجھی ہوئی سانسوں کی مہک مَیں اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا، اس کی مخصوص اُلجھی ہوئی سی لٹ بکھر کر اس کے چہرے پر آ پڑی تھی اور اس کا گلابی دودھ جیسا ملیح چہرہ اس وقت شرم، خوف اور حیا کے مارے انگارہ سا ہو رہا تھا۔

کیا کسی کی دُعاؤں کا ثمر قدرت نے اس قدر جلد اور اس قدر اعلیٰ انعام کے طور پر بھی دیا ہوگا۔۔۔؟ شاید کبھی نہیں۔

وہ ہڑبڑا کر بولی۔۔۔۔ ’’معاف کیجئے۔۔۔۔ وہ مَیں۔۔۔۔ مَیں یہاں برتن لینے آئی تھی؟‘‘

مجھ سے جواب میں کچھ بھی نہ بولا گیا۔ شاید میری زبان ہمیشہ کے لیے سلب کر لی گئی تھیں۔۔۔۔ اتنے میں برتن گرنے کی آواز سن کر پاس کے کمرے سے خالہ اور ایمان کی چھوٹی بہن حیا ہڑبڑائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئیں اور فرش پر بکھرا کانچ اور مجھے اور ایمان کو وہاں کھڑا دیکھ کر جیسے خود ہی سب سمجھ گئیں۔ ایمان جلدی سے خالہ کی طرف بڑھ گئی۔ خالہ ہنس کر بولی۔ ’’ڈر گئیں کیا؟۔۔۔ ارے یہ اپنا ہی بچہ ہے، حماد۔۔۔ نگہت کا تیسرا بھائی ہی سمجھو۔‘‘

حیا نے ہنسی روکنے کے لیے پلّو منہ میں لے لیا تھا۔ اَب ایمان بھی سنبھل چکی تھی۔ اس

نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر ماتھے تک لے جا کر جیسے مجھے آداب کیا۔ خالہ ہنستے ہوئے بولی۔

''اچھا تم جاؤ۔۔۔۔ میں اور حیا یہ کانچ اٹھا لیں گے۔ وہاں نگہت اکیلی ہے۔'' ایمان جلدی سے سٹ پٹائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ خالہ نے پھر سے مجھے کھانا کھائے بغیر واپس نہ جانے کی ہدایت کی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں اس کمرے سے کب اور کس طرح باہر نکلا تھا۔ یہ ایک پل میں کیا ہو گیا تھا۔ کیا آج قدرت نے ایک ہی دن میں میرے اس حقیر جنم میں کی ہوئی چند گنی چنی نیکیوں کا صلہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ میرے کس قدر قریب تھی۔۔۔۔ میری شہ رگ سے بھی قریب۔۔۔۔ سچ یہ ہے کہ اُس دن مجھے خدا پر جس قدر ٹوٹ کر پیار آیا، اتنا پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ ہم انسان بھی کتنے ناشکرے ہوتے ہیں۔ آس پاس کی چیزوں سے، رشتوں سے، خدا کی بانٹی ہوئی نعمتوں سے دن میں جانے کتنی مرتبہ پیار جتاتے ہیں۔ ان کے پیار کا ذکر کرنے سے ہی ہماری آنکھیں تک بھیگنے لگتی ہیں۔ لیکن ہمیں اس خدا پر کبھی پیار نہیں آتا جو ہمارے جینے کے یہ سب بہانے پیدا کرتا ہے۔

مجھے بھی پہلے کبھی نہیں آیا تھا، لیکن اس دن آیا اور بہت ٹوٹ کر آیا، مجھے میری توقعات سے کہیں بڑھ کر نوازا تھا اس نے، میں بے خود سا کسی مے کش کی طرح آس پاس سے بیگانہ وہیں کسی گوشے میں بیٹھا رہا۔ کھانا لگ چکا تھا۔ شاکر نے اسی گوشے میں مجھے کچھ لا دیا۔ جانے کب تقریب ختم ہوئی اور لوگ دھیرے دھیرے رخصت ہونے لگے۔ میں تب چونکا جب میرے سامنے سے عورتوں کی آخری ٹولی بھی جلدی جلدی اپنی چادریں اور برقعے سنبھالتی گزر گئی۔ مجھے اپنی بے خودی پر غصہ آیا۔ کتنی دیر بیت گئی تھی۔ وہ ضرور واپس چلی گئی ہوگی۔ میں جلدی سے اٹھ کر گیٹ کی طرف آیا، وہاں عبداللہ کو شاکر کے ساتھ کھڑے دیکھ کر میری جان میں جان سی آ گئی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے قریب پہنچا۔ شاکر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''لو۔۔۔۔ حماد بابا بھی آ گئے۔ اب مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

پتہ چلا کہ مہمانوں کو واپس پہنچانے کی غرض سے جو گاڑی کرائے پر منگوائی گئی تھی۔ اُسے شاکر کا بڑا بیٹا لے کر گیا تھا لیکن اس کی واپسی میں دیر ہو گئی تھی۔ عبداللہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ میں نے جھجکتے ہوئے شاکر کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو

میں گھر جاتے ہوئے انہیں مولوی صاحب کے یہاں چھوڑتا جاؤں گا۔

''یہی تو میں عبداللہ میاں کو کہہ رہا ہوں بابا۔۔۔۔ لیکن یہ حضرت کچھ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔''

''اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔ میں ویسے بھی بس نکل ہی رہا تھا۔ راستے میں آپ لوگوں کو گھر چھوڑتا جاؤں گا۔''

عبداللہ کے پاس میری تجویز ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی اور اس وقت کسی دوسری سواری کا ملنا بھی اس علاقے میں محال تھا۔ جب تک میں گاڑی لے کر حویلی کے مرکزی گیٹ تک پہنچا، شاکر اندر سے دونوں لڑکیوں کو بھی بلا لایا تھا۔ ایک ہی دن میں اتنے معجزے رونما ہو جائیں گے۔ یہاں آنے سے پہلے، ایسا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ شاکر سے رخصت ہو کر وہ سب گاڑی میں سوار ہو گئے۔ عبداللہ میرے ساتھ آگے بیٹھ گیا اور ایمان اور حیا پچھلی سیٹ پر۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ یا خدا۔۔۔۔ یہ کوئی خواب تو نہیں تھا۔ نہیں۔۔۔۔ ضرور یہ کوئی خواب ہی ہوگا۔ وہ میرے ساتھ، میری ہی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر موجود تھی بیک ویو مرر میں میری نظریں اس کے سراپے کا طواف کرتی رہیں۔ گو وہ مکمل پردے میں تھی اور صرف اس کی آنکھیں ہی اس کے نقاب سے باہر تھیں لیکن اس کا اس قدر قریب ہونا ہی کس قدر جاں فزا احساس تھا۔ میں کسی خواب کے عالم میں ہی گاڑی چلاتا رہا۔ عبداللہ خود بھی خاموش طبیعت اور کم گو تھا کچھ میں بھی اپنے خیالات کی رو میں بھٹکا ہوا تھا۔ راستے بھر ہم خاموش ہی رہے۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے سڑکوں کے خالی ہونے اور رات کی وجہ سے رش نہ ہونے پر بے حد غصہ آیا۔ فاصلہ بہت تیزی سے طے ہو رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر وہ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ ایمان مسلسل کھڑکی سے باہر گزرتے نظاروں کو ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر سامنے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور میں سب کی نظر بچا کر مسلسل شیشے میں اسی کو دیکھے جا رہا تھا۔ جانے اس انجانی سی لڑکی نے مجھ پر یہ کیسا جادو کر ڈالا تھا کہ میں دھیرے دھیرے اپنے اوپر اپنا تمام اختیار ہی کھوتا جا رہا تھا۔۔۔۔

پلک جھپکنے میں ہی مولوی علیم کا محلہ آ گیا۔ رات کی وجہ سے محلہ بھی بالکل سنسان پڑا

تھا۔ مَیں نے مولوی صاحب کی گلی میں موڑ کر گاڑی کھڑی کر دی۔ عبداللہ نے نہایت ممنونیت سے میرا شکریہ ادا کیا اور رسماً اندر آنے کو بھی کہا۔ مَیں نے شکریہ کہا کہ رات بہت بیت چکی ہے۔ پھر کبھی سہی، ایمان اور حیا بھی گاڑی سے اُتر چکی تھیں۔ ایمان تو خاموش رہی البتہ حیاء نے اُترتے اُترتے دھیرے سے شکریہ کہا، مَیں صرف سر ہلا کر رہ گیا، مَیں نے گاڑی واپس موڑی اور عبداللہ کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھا دی۔ گلی سے نکلتے نکلتے مَیں نے بیک ویو مرر میں دیکھا کہ دروازہ کھل چکا تھا اور وہ تینوں اندر داخل ہو رہے تھے۔ پھر جانے کب مَیں گھر پہنچا اور کس طرح مَیں نے خود کو اپنے بستر تک پہنچایا۔ لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس ساری رات میں مَیں ایک پل کے لیے بھی پلکیں نہیں جھپک پایا تھا۔ اس رات مجھے احساس ہوا کہ عشق کا ڈنگ اپنا وار کر چکا ہے اور اب زہر دھیرے دھیرے میرے جسم کی تمام رگوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔

OO

پہلی کلاس

اچانک میری آنکھ الارم کلاک کی تیز گھنٹی سے کھل گئی۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ شور کیسا ہے۔ مَیں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ آج لندن کا آسمان پھر سے سفید بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور شاید ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آج سے میری باقاعدہ کلاسز شروع ہو رہی ہیں اور مجھے نو بجے والی پہلی کلاس کے لیے آٹھ بجے تک ہر حال میں سب وے پہنچ جانا چاہیے کیونکہ اگر آٹھ بج کر دس منٹ والی ٹرین نکل گئی تو سمجھو پہلا پیریڈ بھی گیا۔

انسان کی بہت عجیب فطرت ہے۔ جس چیز کا اسے پابند بنا دیا جائے، اُسے رفتہ رفتہ وہ پابندی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ عام حالات میں مَیں اگر پوری رات بھی شب بیداری کر کے اٹھتا تو مجھے تب بھی کبھی اتنا بُرا نہیں لگا جتنا اس دن مجھے یونیورسٹی پہنچنا لگ رہا تھا۔ بادل نخواستہ مَیں نے نیم گرم پانی سے شاور لیا اور گرما گرم کافی کا ایک مگ حلق میں انڈیلا، کامران جا چکا تھا۔

لباس تبدیل کر کے مَیں نیچے اُترا، کسی بھی شہر کی صبح، اس کے عام دن کے مقابلے میں بہت مختلف اور کبھی کبھی بے حد خوشگوار ہوتی ہے۔ سبھی لوگ نیند سے جاگ کر اپنے اپنے روز مرہ کے معمولات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ جیسے اس وقت وہ اسپینش گٹار بجانے والی لڑکی سامنے سے گزرتی ٹرام سے بس اُتری ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا وہی مخصوص گٹار کیس تھا۔ سچ یہ ہے کہ صبح صبح اُس کے چہرے پر جو تازگی تھی اور آنکھوں میں نیند کا ہلکا سا جو خمار تھا، اس نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ ہم دونوں میں اب کافی شناسائی ہو چکی تھی۔ میں نے جیب سے چند سکے نکال کر اُسے دینا چاہے، لیکن اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا۔ مَیں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھے بتایا کہ وہ پیسے صرف اپنی گٹار کی دھنوں کے عوض لیتی ہے، اور

اس نے تو ابھی تک مجھے کوئی دھن سنائی ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ یہ پیسے قبول نہیں کر سکتی۔ مجھے اس کی یہ بات جانے کیوں بہت اچھی لگی۔ مَیں نے ہنس کر اُسے کہا کہ یہ آج کی دھن کے پیسے نہیں ہیں۔ دو دن پہلے مَیں کافی فاصلے پر کھڑا اس کی دھن بہت دیر تک سنتا رہا تھا لیکن تب میری جیب میں سکے نہیں تھے۔ یہ اُسی دن کا اُدھار ہے۔ یہ سن کر وہ بھی ہنس پڑی اور پھر اس نے انکار نہیں کیا اور میری ہتھیلی پر پڑے سکے اٹھا لیے۔ اس دن پہلی مرتبہ اس نے مجھے اپنا نام بتایا۔ ''جینی'' اور مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میرا نام دُہرانا اُس کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔

''آ۔۔۔ماذ''۔۔۔ مجھے ہنسی آگئی۔ اس نے بالکل ایسے کہا تھا کہ جیسے ہمارے ہاں کوئی کہے ''آ۔۔۔بیل۔۔۔مجھے مار۔۔۔'' میں نے اُسے اپنے نام کا مختصر صورت بتائی۔ ''میڈی''۔۔۔ اس نے خوشی سے دہرایا۔ سینور۔۔۔ میڈی۔'' میں ہنس کر آگے بڑھ گیا۔ جب تک میں یونیورسٹی پہنچا۔ تب تک بوندا باندی باقاعدہ بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ کلاس میں سبھی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔ پہلی کلاس سر آئزک کی ہی تھی۔ ان کے کلاس میں داخل ہوتے ہی کلاس میں سناٹا چھا گیا اور واحد آواز صرف کلاس کی اُونچی اُونچی بڑی شیشے کی کھڑکیوں پر پڑتی بارش کی بوچھاڑ کی تھی۔ کبھی کبھی یہ آواز باقاعدہ ایک جلترنگ کی سی کیفیت اختیار کر لیتی تھی۔ سر آئزک نے پہلے پیریڈ میں معاشیات کی چند موٹی موٹی باتیں بتائیں جن میں سے آدھی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ بہت دنوں سے میں کتابوں سے بہت دُور رہا تھا اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ میرا دھیان کلی طور پر لیکچر کی طرف نہیں تھا۔ جب ہمیں ٹائم ٹیبل بانٹا گیا تھا تو اس میں ایک سبجیکٹ (Subject) میرے لیے قطعی طور پر نیا اور انجانا تھا۔ اس مضمون کا نام ٹائم ٹیبل شیٹ میں ''ہیومینیرنگ'' (Humaneering) دیا گیا تھا۔ آج اِس مضمون کا پہلا لیکچر ساڑھے گیارہ بجے ہال نمبر سات میں تھا۔

مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب سر آئزک پھر سے کالا گاؤن پہنے کلاس میں داخل ہوئے۔ پتہ یہ چلا کہ یہ خاص مضمون خود سر آئزک کی ہی فرمائش پر کورس میں شامل کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر لفظ ہیومینیرنگ دو لفظوں کا مرکب تھا نمبر ایک ہیومن اور نمبر ۲ انجینئرنگ یعنی ''ہیومن انجینئرنگ'' یا دوسرے لفظوں میں آپ اسے انسانی نفسیات کی تعمیر

بھی کہہ سکتے ہیں۔

سر آئزک کے خیال میں ان کی یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلباء کو نہ صرف اپنے شعبوں میں کامیابی سے داخل ہونا چاہیے بلکہ انہیں نفسیاتی طور پر بھی اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پوری قوت کے ساتھ اپنے مختلف محکموں میں رائج کر سکیں۔ اسی لیے خصوصی طور پر انہوں نے ہیومینیرنگ کا یہ سبجیکٹ (Subject) خود اپنے پڑھانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ آج پہلے لیکچر کا موضوع تھا ''بہت زیادہ عقل مندی بھی حماقت کا دوسرا نام ہے۔''

سر آئزک کا کہنا تھا کہ ہم اپنی زندگی میں جن لوگوں کو بہت شدت سے چاہتے ہیں۔ اندر ہی اندر ہم کہیں نہ کہیں انجانے میں اُن سے ایک خاص قسم کی چڑچڑاہٹ بھی پال رہے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے پیار میں ہماری بے بسی اور انہیں کھو دینے کا خوف ہمیں ان کے سامنے اس مخالف جذبے کے اظہار سے روکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو یہ اندرونی چڑچڑاہٹ اندر ہی اندر گل سڑ کر شدید نفرت کا رُخ دھار لیتی ہے، اسی لیے جب کبھی ایسے شدید محبت کے رشتے ٹوٹتے ہیں تو ایک پل میں ہی شدید نفرت کا رُخ اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ ایک پل میں ہوئی نفرت دراصل پچھلے بہت لمبے عرصے سے ہمارے اندر پلتے منفی جذبات کا نچوڑ ہوتی ہے۔

اُس دن مَیں نے محسوس کیا کہ سر آئزک صرف ایک اچھے اور ماہرِ معاشیات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر ایک فلاسفر ایک دانش ور بھی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد انہوں نے کلاس کو اس موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ مَیں نے اپنی باری آنے پر کہا۔

''جذبہ چاہے شدید محبت کا ہو یا شدید نفرت کا، دونوں صورتوں میں انسان کو توڑ دیتا ہے۔''میں ذاتی طور پر نفرت سے زیادہ محبت کو خطرناک جذبہ سمجھتا ہوں۔ اور پھر۔۔۔''

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی میرے سامنے بیٹھی سنہرے بالوں والی ایک لڑکی نے غصے اور نفرت سے پلٹ کر مجھے دیکھا اور بولی۔

''کچھ لوگوں کی فطرت میں ہی ہر بات سے اختلاف کرنا شامل ہوتا ہے ایسے لوگوں کی تربیت میں ہی ضد اور ہٹ دھرمی موجود ہوتی ہے۔''

میں اس لڑکی کو نام سے نہیں جانتا تھا، لیکن اس کا رول نمبر بائیس تھا۔ مَیں نے محسوس کیا تھا کہ جس دن سے مَیں یونیورسٹی میں آیا تھا یہ لڑکی اور اس کے چار پانچ دوستوں کا

مخصوص گروپ کسی نہ کسی طور پر میرے مذہب اور میری قومیت کو طنز اور مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ عام طور پر مَیں اُن کی سُنی، اَن سُنی کر دیتا تھا کیونکہ مَیں ان بے مطلب کی باتوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت جانے کیوں میں بھی اپنے آپ پر اختیار کھو بیٹھا۔

''اس احساس کمتری کا شکار تو مجھے وہ لوگ لگتے ہیں جنھیں بظاہر اپنی تربیت پر بے حد ناز ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اندر کی جہالت کہیں نہ کہیں رنگ دکھا ہی جاتی ہے۔''

یہ سنتے ہی اس رول نمبر بائیس کا رنگ غصّے سے سُرخ ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر مجھے کچھ جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن سر آئزک نے روسٹرم پر زور سے ڈسٹر مار کر ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''پلیز پلیز۔۔۔ آپ لوگ آپس میں بحث کرنے سے گریز کریں۔ اختلاف رائے ہم سب کا حق ہے لیکن اسے اخلاق کی حدوداں میں ہی رہنا چاہیے۔ مس سارہ پیریز، آپ مجھ سے لیکچر کے بعد میرے آفس میں ملیں۔''

اتنے میں لیکچر ختم ہونے کی گھنٹی بھی بج گئی۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ اس آتش صفت کا نام سارہ ہے۔ دیکھنے میں کسی بہت معقول گھرانے کی لگتی تھی لیکن جانے مجھ سے اس کی کیا پرخاش تھی۔ سارہ اور اس کا گینگ مجھے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کلاس سے نکل گئے۔ مَیں نے بھی اپنا بیگ گلے میں لٹکایا اور باہر نکل آیا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن سردی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ مَیں نے فوراً ہاتھ رگڑ کر اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ اور ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اٹینڈنٹ نے آ کر بتایا کہ سر آئزک مجھے اپنے دفتر میں یاد کر رہے ہیں۔

مَیں نے اس راہداری کی طرف قدم بڑھا دیے جس کے اختتام پر سر آئزک کا دفتر موجود تھا۔ بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر دیکھا اندر سارہ غصے میں بھری سر آئزک کے میز کی مخالف سمت پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس مختصر وقفے میں سارہ کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ سنائی دیے۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے ایک مسلمان کو بنا کسی خاص وجہ کے اپنی یونیورسٹی میں ایڈمشن کیسے دے دیا۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ۔۔۔''۔ سارہ کی بات آدھی رہ گئی کیونکہ میں تب تک اندر داخل ہو چکا تھا۔ سر آئزک نے مجھے دیکھ کر کہا۔

''آؤ حماد۔۔۔ آؤ۔۔۔''

سارہ چُپ سی ہوگئی۔ مَیں میز کے سامنے لگی دوسری کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ سر آئزک نے سامنے پڑی فائل پر کچھ نوٹ کر کے اسے بند کر دیا اور پھر نظر اٹھا کر ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

''میں چاہتا تھا کہ تم دونوں کا آپس میں تعارف کروا دوں۔ شاید اس سے چیزوں کو سمجھنے میں کچھ آسانی ہو جائے۔ سارہ۔۔۔ ان سے ملو۔۔۔ یہ حماد امجد رضا ہیں۔ ان کے دادا برٹش گورنمنٹ میں وائسرائے کے ذاتی سٹاف میں نہایت اُونچے عہدے پر فائز رہے ہیں۔ ہماری یونیورسٹی میں داخلے کی تمام کڑی شرائط پر پورا اُترنے کے بعد ان کا داخلہ منظور کیا گیا ہے، ان کا شمار ہمیشہ سے بہترین طالب علموں میں رہا ہے۔''

سارہ نے یہ ساری گفتگو ایک خاص نخوت بھرے انداز میں سنی۔ پھر آئزک نے سارہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور مسٹر حماد۔۔۔ ان سے ملیے۔۔۔ مس سارہ پیریز۔۔۔ سارہ آئزک پیریز۔۔۔ اس یونیورسٹی کی پچھلے چار سمسٹر سے لگاتار پوزیشن ہولڈر۔۔۔ اور میری بیٹی۔ مجھے اُمید ہے کہ تم نے اس کی تلخ کلامی کا زیادہ اثر نہیں لیا ہوگا۔''

اوہ۔۔۔ تو یہ خوبصورت بلا سر آئزک کی بیٹی تھی۔ ایک یہودن۔۔۔ تبھی اس کے لہجے سے ہر وقت ایک خاص قسم کا زہر ٹپکتا تھا۔ اس وقت بھی وہ چہرہ دوسری طرف کیے، تکبرانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کے ساتھ والی سیٹ پر مَیں یا ایک انسان نہیں بلکہ کوئی حقیر کیڑا مکوڑا بیٹھا ہو۔ پھر سر آئزک نے ہم دونوں کو کلاس روم کے آداب اور یونیورسٹی ڈسپلن کے بارے میں ایک چھوٹا سا لیکچر دیا اور ہم دونوں سے اُمید ظاہر کی کہ آئندہ ہماری وجہ سے کلاس کا ماحول تناؤ کا شکار نہیں ہوگا۔ ہم دونوں ہی چُپ کر کے سنتے رہے اور پھر ہمیں واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ہم دونوں تقریباً ساتھ ہی کمرے سے نکلے اور ایک دوسرے کو دیکھے بنا مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ اس دن مجھے احساس ہو گیا تھا کہ شاید مَیں اس یونیورسٹی سے معاشیات کی ڈگری اتنی آسانی سے لے کر نہیں جا پاؤں گا۔ میرے اور سارہ کے درمیان جس سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ بہت جلد ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کرنے والی تھی۔

OO

زہرِ عشق

میں اس رات ایمان کو اس کے گھر چھوڑ تو آیا تھا لیکن اس پل کے بعد مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ ہر گھڑی جیسے میرے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہو۔ میں نے عشق اور محبت کی بہت سی داستانیں سُن رکھی تھیں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ اس عشق کا ڈنگ اتنا زہریلا ہوگا۔ ایک ہی پل میں یہ عشق کا زہر میری نس نس میں سرایت کر گیا اور اب میری حالت ایسی تھی کہ دن رات کی تڑپ ہی میرا مقدر تھی۔

محبت بذاتِ خود ایک سب سے بڑے عذاب کی صورت میں وارد ہوتی ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ محبت یک طرفہ ہو تو یہ ہر پل انسان کو کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ ایک ایک پل میں انسان سو سو بار جیتا ہے اور سو سو بار مرتا ہے۔

مجھے کوئی صورت سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ آخر کس طرح ایمان تک میرے اندر لگی اس آگ کی آنچ پہنچ سکے۔ اس کا گھر سے نکلنا محال تھا۔ میں پہلے ہی کئی کئی دن گھنٹوں تک اس کے گھر کے باہر پہرہ دے چکا تھا۔ اور اب تو عبداللہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ گھر کے باہر کھڑے رہنے میں اس سے سامنا ہونے کا خطرہ بھی ہر لمحے موجود تھا۔ اور پھر ایمان جیسی لڑکی کو یوں سرِ راہ روک کر بات کرنا بھی اب مجھے بے حد معیوب محسوس ہو رہا تھا۔ جانے وہ اس بات سے میرے متعلق کیا تاثر لیتی؟ ۔۔۔ تو پھر کیسے ۔۔۔ آخر اس تک رسائی کیسے ہو ۔۔۔؟ دن رات بس یہی ایک سوال اور یہی ایک دھن میرے سَر پر سوار رہتی تھی۔

یہ سچ ہے انسان کی آرزوؤں اور خواہشات کی کبھی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ہر منزل پر پہنچ جانے کے بعد اُسے وہ منزل ایک سنگِ میل لگنے لگتی ہے اور کوئی نئی اور اگلی منزل اس کی خواہش کا روپ دھار لیتی ہے۔ اور اسی سفر میں ہی انسان کی زندگی تمام ہو جاتی ہے۔

پھر انسان کا مقدر ہی ہمیشہ اور کبھی نہ ختم ہونے والا یہ سفر ہوتا ہے۔

کل تک ایمان کی صرف ایک جھلک کو پانا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ قدرت نے میری یہ خواہش پے در پے کئی مرتبہ پوری کر دی تھی لیکن آج میری التجاؤں کی حد صرف دیکھ لینے سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں اس تک اپنے جذبوں کی آنچ پہنچانا چاہتا تھا۔ اپنا یہ احساس اس تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ شاید انسان کی ناشکری کی بنیادی وجہ بھی کسی مقصد کسی آرزو کو پا لینا ہوتا ہے۔ نہ ہم آرزو کو پاتے اور نہ ہی نئی خواہشات جنم لیتیں ۔۔۔ بس ساری زندگی کسی ایک تمنا میں ہی گزر جاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

نہ میں ایمان کو اس پارٹی کے بعد دوبارہ کبھی دیکھ پاتا اور نہ ہی آج میں اس جنوں میں مبتلا ہوتا۔ ساری زندگی دربدر اس کی دوسری جھلک دیکھنے کے لیے ہی بھٹکتا رہتا تو اچھا ہوتا۔

دن اسی کش مکش میں گزر رہے تھے اور راتیں اسی کرب میں کٹتی تھیں۔ ایک دن شاکر شام کے وقت مجھے ڈھونڈتا ہوا چھت پر آ پہنچا، جہاں میں بہت دیر سے بیٹھا جاتی گرمیوں کا سورج ڈھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ گرمیوں کا سورج ڈھلتے ڈھلتے بھی کتنا وقت لیتا ہے، جیسے رات سے اس کی کوئی جنگ چل رہی ہو، اور وہ اپنی دوست شفق کو رات کے کالے سایوں کے حوالے نہ کرنا چاہتا ہو۔

"ارے حماد بابا آپ یہاں ہو ۔۔۔ کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں، یہ نگہت نے آپ کے لیے دیا ہے۔"

شاکر نے ایک رقعہ میرے حوالے کیا اور پھر واپس چل دیا۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آیا۔

"اور ہاں ۔۔۔ کہہ رہی تھی کہ حماد بھائی سے کہنا کہ اپنا وعدہ جلدی پورا کریں۔" شاکر بیٹی کا پیغام دیتے ہوئے اپنے آپ ہی مسکرا دیا اور وہاں سے چلا گیا۔ میں نے رقعہ کھول کر دیکھا۔ صرف چند سطریں ہی لکھی تھیں۔

"پیارے بھیا۔

اپنا وعدہ بھول گئے نا، ابا سے میری پڑھائی کی بات بھی نہیں کی۔

امتحانات سر پر آ رہے ہیں۔ اگر فارم نہیں بھرے تو میرا سال ضائع ہو جائے گا۔ آپ کی سفارش کی منتظر ۔۔۔"

تب مجھے یاد آیا کہ واقعی مَیں نے نگہت کی منگنی کے دن اُس سے شاکر سے بات کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب بھلا اُسے کیا خبر کہ آج کل تو مجھے اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔ کسی سے کیے ہوئے وعدوں کا کیا بھرم رکھ پاتا۔ لیکن مَیں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ہی شاکر سے اس مسئلے پر حتمی بات کروں گا۔ میں جانتا تھا کہ شاکر میری بات کبھی رد نہیں کرے گا۔ اور اس کے لیے اگر ہم دونوں کو نگہت کے منگیتر کے پاس بھی جانا پڑتا تو مَیں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

مَیں نگہت کا رقعہ اپنے ہاتھوں میں پکڑے یونہی خالی الذہن سا بیٹھا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی اچانک میرے ذہن میں جیسے ایک جھماکا سا ہوا۔ نگہت۔۔۔ ہاں۔۔۔ نگہت بھی تو وہ ذریعہ ہو سکتی تھی۔ وہ ایمان اور حیا کی سہیلی تھی۔۔۔ ایمان تک براہِ راست پہنچنے کا واحد ذریعہ۔۔۔ حیرت ہے۔ اتنے دن پہلے تک مَیں دیواروں سے ٹکراتا رہا لیکن مجھے نگہت کا خیال کیوں نہیں آیا؟

اور اَب جب یہ خیال میرے ذہن میں آ ہی گیا تھا تو جیسے میری بے چینیوں کو بھی اِک نئی راہ مل گئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طور اُڑ کر شاکر کے گھر پہنچ جاؤں۔ بحرطور مَیں نے جیسے تیسے کر کے وہ رات کاٹی۔ اور اگلی صبح سویرے ہی میں پُرانی حویلی پہنچ گیا۔ گزری شام میں نے شاکر کے جاتے جاتے اس سے نگہت کی مزید تعلیم کے سلسلے میں بات بھی کر لی تھی۔ شاکر نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ نگہت کے منگیتر عامر سے اس سلسلے میں خود بات کر لے گا۔

گھر سے نکلتے ہوئے مَیں شاکر کو بتاتے ہوئے آیا تھا کہ مَیں پُرانی حویلی کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ ایسی کوئی خلافِ معمول بات نہیں تھی۔ مَیں کئی مرتبہ اپنے دوستوں کی وہاں پارٹیز وغیرہ منعقد کر چکا تھا۔ کامران جب بھی لندن سے واپس آتا تو ہم دونوں کا دن رات کا ٹھکانا وہی پُرانی حویلی ہی ہوتی تھی۔ تب مَیں کتنا زندہ دل تھا، ہر وقت اس حویلی کے درودیوار ہمارے قہقہوں سے، تیز میوزک سے اور ہمارے ہلے گلے سے گونجتے رہتے تھے۔ ایسے میں ہم نگہت اور خالہ سے ہی فرمائشیں کر کر کے مزے مزے کے پکوان بنواتے تھے۔ خاص طور پر ساون کی بارشوں میں ہم دن بھر پائیں باغ میں دھا چوکڑی مچاتے۔ پوریاں تلوائی

جاتیں۔ سموسے اور پکوڑے بنوائے جاتے، کولڈ ڈرنک کے کریٹ باغ میں بہتی صاف پانی کی نالی میں رکھوا دیے جاتے، آموں کی بڑی بڑی ٹوکریاں چھکڑوں میں لدوا کر حویلی کے نعمت خانے میں پہنچوا دی جاتیں۔ آہ۔۔۔ ابھی چند ہفتے پہلے تک میں کس قدر جیتا جاگتا انسان تھا۔ اس ایک محبت نے تو جیسے میرے جسم سے رُوح تک ہی نچوڑ لی تھی۔

نگہت اور خالہ کا معمول تھا کہ ان میں سے جس کسی کو بھی میرے حویلی پہنچنے کی اطلاع کسی چوکیدار وغیرہ سے ملتی تو وہ فوراً میرے ساتھ آنے والے مہمانوں کے بارے میں پوری معلومات کر کے فوراً چائے ناشتہ وغیرہ بھجوا دیتیں۔ مَیں کبھی تنہا ہوتا تو نگہت خود آ جاتی اسے نت نئی کتابیں پڑھنے اور منگوانے کا بہت شوق تھا، شاکر کے سامنے تو وہ کھل کر کوئی فرمائش کر ہی نہیں پاتی تھی کیونکہ شاکر اس کی فرمائشوں پر اُسے جھڑک دیتا تھا۔

اس دن بھی یہی ہوا، جیسے ہی نگہت کو میرے آنے کی خبر ہوئی۔ وہ کچھ ہی دیر میں چائے اور نمکین بسکٹ وغیرہ ایک ٹرے میں رکھ کر وہاں آن پہنچی۔ اس دن نگہت کے چہرے سے ہی خوشی پھوٹ رہی تھی۔ پتہ چلا کی رات ہی شاکر نے اُسے اپنے طور پر آگے پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ یہ سب میری ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے آتے ہی میرا خلوص دل سے شکریہ ادا کیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مَیں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔ نگہت بھی میری کش مکش کو بھانپ گئی۔

”کیا بات ہے حماد بھائی جان۔۔۔ آپ کچھ کھوئے کھوئے سے لگ رہے ہیں۔“

”نگی۔۔۔ اُس دن منگنی میں تمھیں وہ لڑکی یاد ہے۔۔۔ وہی جو مجھ سے اندھیرے کمرے میں ٹکرا گئی تھی۔“

نگہت اپنی ہی دھن میں کپ میں چائے انڈیلتے ہوئی بولی۔

”کون۔۔۔ ارے ہاں۔۔۔ امی جان نے مجھ کو بتایا تھا“ نگہت کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

”وہ ایمان تھی۔ ہمارے پُرانے محلے میں رہتی ہے۔ مولوی علیم الدین صاحب کی بیٹی ہے۔ بہت اچھی لڑکی ہے بھیا۔“

پھر جیسے نگہت کو کچھ خیال آیا اور وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”خیر تو ہے

بھیا۔ آپ ایمان کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں ایک خاص شرارت تھی۔ میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔ دل کے کچھ چور چھپانا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے۔ جس نگہت کی ہم سب مل کر منگنی اور شادی کے نام پر خوب کھچائی کیا کرتے تھے، اتنی کہ وہ اکثر رونے لگ جاتی تھی۔ آج اس کی ایک معصوم شرارت بھری مسکان نے مجھ سے میرا تمام اعتماد ہی چھین لیا تھا۔ شاید دل میں چور ہونا اسی کو کہتے ہوں گے۔

''کچھ نہیں۔۔۔وہ دراصل میں۔۔۔میرا مطلب ہے۔''

نگہت نے میری چوری پکڑ لی۔

''ہوں۔۔۔تو یہ بات ہے۔۔۔بھیا۔ دیکھیں اس کے ساتھ کوئی شرارت نہ کیجئے گا۔۔۔وہ بہت بھولی بھالی سی سہیلی ہے میری۔۔۔اور بہت مذہبی گھرانے سے تعلق ہے اس کا۔''

نگہت میری بہت سی سہیلیوں کے بارے میں جانتی تھی۔ وہ میری تمام دوستوں کو میری سہیلیاں ہی کہتی تھی۔ اور ایمان کے بارے میں میری پوچھ گچھ کو بھی میرے انہی پُرانے معمولات میں سے ایک سمجھ رہی تھی۔ مَیں نے نگہت کا ہاتھ پکڑ کر اُسے وہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔

''بیٹھو یہاں۔۔۔اور غور سے میری بات سنو۔''

مَیں نے ''الف'' سے ''ی'' تک اب تک کی تمام کہانی نگہت کو من وعن سنا دی۔ نگہت حیرت سے میری رام کتھا سنتی رہی۔

''اب تم ہی بتاؤ، مَیں کیا کروں۔۔۔مَیں بہت مشکل میں ہوں نگی۔۔۔'' ہوں۔۔۔یہ تو خاصا گھمبیر معاملہ ہے۔۔۔تو ایمان بی بی نے میرے پیارے بھیا کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔۔۔لیکن بھیا۔۔۔آپ جیسا سمجھ رہے ہیں۔۔۔وہ ویسی لڑکی نہیں ہے۔۔۔ساری زندگی کسی نامحرم سے بات کرنا تو دُور کی بات ہے۔۔۔اس پر ایسی کسی چیز کا سایہ تک نہیں پڑا۔ اپنی ساری تعلیم بھی اس نے پردے میں ہی حاصل کی ہے۔ اسے اپنی اور اپنے گھر کی عزت اپنی جان سے بھی پیاری ہے۔ محلے کا ہر گھرانا اسے اپنی بہو بنانا چاہتا

ہے اور آپ سے پہلے بھی کئی نوجوان اس کی ایک جھلک کے لیے سالوں اس کے گھر اور گلی کے چکر کاٹتے رہے ہیں۔ لیکن ایمان نے نظر اُٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ میرا آپ کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔۔۔وہ زور سے ہنسی یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ مَیں اپنی سب سے پیاری دوست کو ہمیشہ کے لیے کھو دوں گی۔''

مجھے نگہت کی بات سن کر غصہ آ گیا۔ مَیں اُٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔تم رہنے دو۔۔۔مَیں خود ہی کچھ کر لوں گا۔''

مَیں نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔ نگہت نے جاتے جاتے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کے چہرے پہ شریری مسکراہٹ تھی۔

''اوہو۔۔۔روٹھ گئے پیارے بھیا۔۔۔لگتا ہے آپ واقعی ایمان کے لیے سنجیدہ ہیں۔۔۔پھر تو واقعی کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

''تو پھر کچھ سوچو۔۔۔آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ اپنے بھیا کا اتنا سا کام نہیں کرو گی۔''

مَیں اور نگہت سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور ایمان تک یہ رازِ دل پہنچانے کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگے۔ کبھی مجھے کوئی طریقہ سوجھتا تو نگہت اُسے رد کر دیتی اور کبھی نگہت کے ذہن میں کوئی بات آتی تو وہ طریقہ مجھے نہ بھاتا۔ اسی شش وپنج میں جانے کتنی دیر بیت گئی لیکن ہم کسی حتمی فیصلے پر نہ پہنچ پائے۔ مَیں نے نگہت کو ایمان کے نام ایک مختصر سا رقعہ لکھ کر دینے کی تجویز بھی دی تھی لیکن نگہت نے صاف انکار کر دیا تھا اس کے کہنے کے مطابق ایمان کبھی اس رقعے کو کھول کر نہ پڑھتی اور اسے پھاڑ دیتی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس بات پر نگہت سے بھی ہمیشہ کے لیے بات چیت بند کر سکتی تھی۔

تھک ہار کر مَیں تو سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ نگہت سے اپنے لاڈلے بھیا کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی اور اُس نے حیاء کو اس معاملے میں اپنا رازدار بنانے کی ٹھان لی۔ طے یہ پایا کہ نگہت کسی بہانے ایمان اور حیاء کو اپنے گھر بلوائے گی۔ حالانکہ اس معاملے میں مولوی صاحب بہت سخت اُصول پسند واقع ہوئے تھے لیکن نگہت کے مطابق وہ ایک بار انہیں مولوی

صاحب سے بھی اجازت دلوا ہی دے گی چاہے اس کے لیے اُسے خود مولوی صاحب کی منت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اس دن مجھے بھی اطلاع کر دی جائے گی اور نگہت چند لمحوں کے لیے میری ایمان سے تنہائی میں ملاقات کا بندوبست کروا دے گی۔ میں جانتا تھا کہ نگہت کے لیے یہ سب کس قدر مشکل ثابت ہوگا لیکن میری محبت میں اس نے اپنی بچپن کی دوستی کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

طے یہ پایا کہ آنے والی جمعرات کو اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جائے گا۔ لیکن میری وہاں سے واپسی تک نگہت نے ہزاروں بار مجھ سے تصدیق چاہی کہ میں کہیں ایمان سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔ کہیں وہ بھی کہیں میری بہت سی سہیلیوں کی بھیڑ میں کھو تو نہیں جائے گی۔ آخر کار مجھے اس کے کان پکڑ کر اُسے یقین دلانا پڑا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا اس کی بچپن کی سہیلی تھی ہی اِک ایسی گوہر نایاب۔۔۔ اس لمحے مجھے نگہت پر بے حد رشک بھی آیا۔ وہ کتنی آسانی سے اس مہ رواس گل رُخ سے مل سکتی تھی، بات کر سکتی تھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام سکتی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا میں گھنٹوں یہیں بیٹھا نگہت کے ساتھ ایمان کی باتیں کرتا رہوں۔۔۔ اس سے ایمان کی باتیں سنتا رہوں۔۔۔ محبت میں محبوب کا ذکر بھی کس قدر جاں فزا ہوتا ہے۔ بس اُس کے ذکر سے ہی بھوک پیاس مٹتی رہتی ہے۔ صدیاں گھڑیوں میں بیت جاتی ہیں۔ فضا یونہی خواہ مخواہ ہی دل کش لگنے لگتی ہے۔ آس پاس کا سبھی شور بھی جیسے نغموں میں ڈھل جاتا ہے۔ سخت حبس زدہ پھیلی دھوپ میں بھی جیسے پُروائیاں سی چلتی محسوس ہوتی ہیں۔ رات اور دن سب ایک خواب زدہ سی کیفیت میں گزرتے رہتے ہیں۔ ہونٹوں پر اپنے آپ ہی بنا کسی بات کے ایک خاص میٹھی سی مسکان پھیلی رہتی ہے۔ سب دشمن بھی دوستوں جیسے پیارے لگنے لگتے ہیں۔ جانے کیا کچھ ہونے لگتا ہے۔

میں بھی اگلی جمعرات کے آنے تک انہی سب محسوسات سے گزرتا رہا۔۔۔ کہتے ہیں یک طرفہ عشق وسوسوں کا گھر ہوتا ہے۔ مجھے بھی اچانک عجیب سے وسوسے ڈسنے لگتے۔ پتہ نہیں وہ آ بھی پائے گی یا نہیں؟ کہیں مولوی صاحب منع ہی نہ کر دیں۔ وہ مجھ سے ملے گی بھی یا نہیں؟۔۔۔ جانے وہ میری اس کوشش کو کیا معنی دے گی۔۔۔؟

آخر جمعرات کا دن بھی آ ہی گیا۔ نگہت نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

اس کے مطابق سہ پہر تین سے چار بجے کا وقت اس ملاقات کے لیے نہایت مناسب تھا۔ گرمیوں کی اس لمبی سہ پہر میں ہر طرف سناٹا ہی چھایا رہتا تھا۔ پلان کے مطابق مجھے دو بجے ہی پُرانی حویلی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ حویلی کے بڑے برآمدے کے ساتھ ہی۔ جہاں گرمیوں کے موسم میں دھوپ سے بچاؤ کے لیے بڑی بڑی چقیں تان دی جاتی تھیں، ایک بڑا سا کمرہ تھا جسے ہم ٹھنڈا کمرہ کہا کرتے تھے۔ اصل میں یہ کبھی دادا کی سٹڈی تھی۔ کمرے کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ گرمیوں میں ہَوا کے رُخ پر ہو لہٰذا شدید تپتی دوپہروں میں بھی یہ کمرہ ٹھنڈا رہتا تھا۔ اب بھی اس کمرے کے شیلف نادر کتب سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں گرمیوں کی لمبی لمبی سی دوپہریں ہم اسی کمرے میں اوندھے پڑے ٹارزن اور عمرو عیار کی کہانیاں پڑھتے ہُوئے گزار دیتے تھے۔

نگہت نے ایک اور انکشاف بھی کیا تھا کہ ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون تھا، اور اس معاملے میں وہ اکثر نگہت سے کتابیں مستعار لیتی رہتی تھی۔ نگہت نے اُسے میرے دادا کی اس اسٹڈی اور ان میں رکھی کتابوں کا بھی بتا رکھا تھا اور بقول نگہت، ایمان کو ان کتابوں کو ایک نظر دیکھنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ لیکن زیادہ تر یہ اسٹڈی بند ہی رہتی تھی۔ آج میں خصوصی طور پر اسٹڈی کی چابی لے کر حویلی آیا تھا اور نگہت نے بھی ایمان کو اسٹڈی دکھانے کے بہانے ہی حویلی طلب کیا تھا۔ البتہ حیاء کو وہ اعتماد میں لے چکی تھی کہ اصل میں مقصد میری ایمان سے ایک ملاقات کا اہتمام ہے۔

مجھے اسٹڈی میں ہی ان کا انتظار کرنا تھا۔ نگہت حیا اور ایمان کو لے کر اسٹڈی دکھانے آتی تو انہیں چند لمحوں میں مجھے ایمان سے اپنے دل کی بات کہنی ہوگی۔ اب یہ آگے میرا نصیب تھا کہ وہ میری بات سنتی، رد کرتی یا پھر غصے میں پلٹ جاتی۔۔۔ میں اسٹڈی میں اسی شش و پنج میں بیٹھا سامنے لگی لکڑی کی بڑی سی قدیم گھڑی کی سوئیاں گن رہا تھا۔ ابھی صرف دن کے ڈھائی ہی بجے تھے اور مجھے یہاں پہنچے صرف آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جانے کتنی صدیوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔ سٹڈی کے بڑے سے روشن دان میں چڑیوں نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا اور اس وقت چڑیا بھی اپنے بچوں سمیت اپنے گھونسلے میں ستا رہی تھی۔ روشن دان سے سامنے کی دیوار پر پڑتی دھوپ دھیرے

دھیرے سرک رہی تھی اور ڈھلتے ڈھلتے دیوار پر نئے زاویے بنا رہی تھی۔ کبھی کبھی یہ انتظار بھی کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی سانسیں تک رکتی محسوس ہوتی ہیں۔ مَیں نے گھبرا کر آس پاس کی الماریوں میں لگی کتابوں کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ لیکن حرف میری آنکھوں کے سامنے گڈ مڈ سے ہونے لگے۔ ہر آہٹ پر مَیں جیسے اچھل ہی تو پڑتا تھا، لیکن ہر آہٹ کے بعد باہر پھر سے طویل سناٹا چھا جاتا۔ گرمیوں کا مخصوص اور طویل سناٹا جس میں وقفے وقفے سے دُور کسی درخت پر بیٹھے کوّے کی کائیں کائیں کے علاوہ اور کوئی بھی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ یا پھر حویلی کے باہر سے گزرتی لمبی کالی سنسان سڑک پر کسی تانگے کی گزرنے کی آواز، یا پھر کسی موٹر گاڑی کی گھر گھر۔۔۔۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ آخر تین بج گئے، میرے وسوسے بڑھتے گئے۔ نہیں۔ وہ نہیں آئے گی۔۔۔ حیاء نے اُسے نگہت کے سارے منصوبے کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ وہ نگہت سے بھی ناراض ہو گئی ہوگی۔ ہمیں ایسا منصوبہ بنانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ یہ سب غلطی ہی میری ہے۔

جانے دل میں کیسے کیسے وہم آنے لگے تھے۔ سوا تین بجے تک تو میرا صبر بھی جواب دے گیا۔ مَیں نے گھبرا کر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیسے ہی مَیں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے، دُور برآمدے کے موڑ سے کچھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور چند نسوانی ہنسی اور باتوں کے جلترنگ سے دُور سے بجتے سنائی دیئے۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ میری سانسیں رکنے لگیں۔ یہ تو اسی کے قدموں کی چاپ ہے۔۔۔ یا خدا۔۔۔ مجھے ہمت عطا کر۔۔۔۔

اچانک دروازہ کھلا اور سب سے آگے نگہت اور اس کے پیچھے ایمان اور اس کے پیچھے حیا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ نگہت نے مجھے دیکھ کر مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

''السلام علیکم۔۔۔ ارے۔۔۔ حماد بھیا آپ۔۔۔ یہاں۔۔۔ اس وقت؟''

میری توقع کے عین مطابق ایمان کے چہرے پر گھبراہٹ اور سراسیمگی سی پھیل گئی۔ اُس نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا اور فوراً جانے کے لیے پلٹی، لیکن حیا اس کے راستے میں اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی لہٰذا اس کا راستہ رک گیا۔ نگہت نے بھی جاتی ایمان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام

لیا۔

''شاید تمھاری دوست کو میری یہاں موجودگی کچھ پسند نہیں آئی۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں نہیں رکنا چاہیے۔''

ایمان نے گھبرا کر پھر سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ نگہت نے اُسے نظروں نظروں میں ہی گھورا، پھر جلدی سے بولی۔

''نہیں نہیں بھیا۔۔۔۔ ہم تو دراصل یہاں کچھ پُرانی کتابیں دیکھنے آئے تھے۔ دراصل ایمان کو اچھی کتابیں پڑھنے کا جنون ہے نا بس اسی لیے۔۔۔۔''

اَب ایمان نے نگہت کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، لیکن نگہت نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رکھا۔

''ضرور۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔ آپ لوگ کتابیں دیکھیے۔۔۔ مَیں ابھی حاضر ہوا۔''

مَیں جلدی سے اسٹڈی سے نکل گیا۔ مجھ میں اس کی جانب دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ آج اُس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور کالے دوپٹے میں کچھ زیادہ ہی غضب ڈھا رہی تھی۔ رہ رہ کر میری آنکھوں میں اس کی لرزتی پلکیں اور کانپتے ہونٹوں کا منظر اُبھر رہا تھا اور اس کی وہی ایک پریشان سی لٹ۔۔۔۔

باہر برآمدے میں کچھ دیر کھڑا میں اپنے حواس قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ سارا معاملہ ہی اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مَیں کسی بہانے نگہت کو حیا سمیت چند گھڑیوں کے لیے باہر برآمدے میں بھیج دیتا اور ایمان سے بات کر لیتا لیکن اُسے دیکھ کر مَیں سب بھول کر خود ہی باہر نکل آیا تھا۔ مجھے اپنے اوپر شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ شاید اب دوبارہ اس سے بات کرنے کا کبھی موقع نہ مل سکے۔ شاید مَیں یہ بازی ہمیشہ کے لیے ہار چکا تھا۔

اتنے میں اسٹڈی کے دروازے کی طرف کچھ آہٹ ہوئی۔ مَیں نے چونک کر اُوپر دیکھا۔ نگہت دروازے سے دبے پاؤں نکل رہی تھی۔ اس نے مجھے غصے سے بھرے اشاروں میں پوچھا کہ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ جواب میں مَیں صرف کاندھے اچکا کر ہی رہ گیا۔ پھر نگہت نے اندر حیا کو کچھ اشارہ کیا اور حیا بھی باہر نکل آئی۔ مَیں اب بھی گم سم اور گنگ سا وہیں کھڑا تھا۔ نگہت آگے بڑھی اور میری کلائی تھام کر کھینچ کر مجھے اسٹڈی کے دروازے تک لے آئی

اور مجھے اندر دھکا دیتے ہوئے اُس نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''صرف تین منٹ۔۔۔۔''

مَیں گھبرایا ہوا سا نگہت کے دھکے کے زور میں اسٹڈی کے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ ایمان دُور آخری الماری کے قریب کھڑی کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ آہٹ ہوئی تو اُس نے بے دھیانی میں پلٹ کر دیکھا۔ شاید اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ نگہت اور حیا دونوں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی ہیں اور ان کی جگہ اب مَیں دروازے پر کھڑا ہوں۔ گھبراہٹ کے مارے اس کے ہاتھ سے کتاب نیچے گر گئی۔ اس نے سر کا پلو جلدی سے ٹھیک کیا اور باہر جانے کے لیے لپکی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت یہ تھا کہ اسٹڈی میں آنے اور جانے کا صرف ایک یہی بڑا سا دروازہ تھا جس کے بیچوں بیچ میں اس وقت کھڑا تھا۔ جس قدر تیزی سے اُس نے قدم بڑھائے تھے۔ اتنی ہی جلدی اُسے رکنا بھی پڑا۔ بے بسی سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اور وہ سر جھکائے، بنا کچھ کہے کمرے کے بیچ و بیچ کھڑی تھی۔ شائد اُسے نگہت اور حیا پر بھی شدید غصہ آرہا تھا اور ان کی منصوبہ بندی بھی اب اس کی سمجھ میں آچکی تھی۔ چند لمحے ہم دونوں خاموش رہے اور صرف ہمارے درمیان موجود خاموشی بولتی رہی۔ مجھے اس کی سانسوں تک کی آواز اس سناٹے میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے اپنی ہمت مجتمع کی اور اس کی آواز کا سُر کمرے میں بکھرا۔ اس کے وجود کی طرح اس کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''میں باہر جانا چاہتی ہوں۔۔۔۔ آپ راستہ چھوڑ دیں۔'' میں نے پہلی مرتبہ اس کے منہ سے اتنے بہت سے لفظ اکٹھے سنے تھے۔۔۔۔ کچھ دیر تو مَیں بالکل مبہوت سا کھڑا رہا۔ پھر یکا یک جیسے مجھے ہوش آیا۔

''آپ کا راستہ اس طرح روکنے کی معافی چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے میری یہ حرکت تمام عمر کے لیے مجھے آپ کی نظروں سے گرا دے۔۔۔۔ لیکن یقین جانیے۔۔۔ مَیں نے بہت مجبور ہونے کے بعد یہ قدم اٹھایا ہے۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ مجھے غلط نہ سمجھئے۔''

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں۔ مجھے جانے دیجئے۔۔۔ خدا کے لیے۔''

اُس کی آواز اَب بھرانے لگی تھی۔ آنسوؤں کا ارتعاش اس کی پلکوں کے گرد جمع ہو کر

چھلکنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

''مَیں صرف آپ سے اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے مَیں نے آپ کو دیکھا ہے۔ پھر آپ میرا اپنا نہیں رہا۔ میرے پاس شاید وہ لفظ ہی نہیں ہیں جن سے مَیں اپنی کیفیت آپ پر ظاہر کرسکوں۔۔۔۔ میرے جذبے کے لیے اس وقت دنیا کی سبھی ڈکشنریوں میں موجود ہر لفظ مجھے عامیانہ لگ رہا ہے۔ شاید میرا یہ طریقہ بھی بے حد عامیانہ اور ہلکا ہے لیکن مَیں کیا کروں۔۔۔۔ میرے پاس اور کوئی ذریعہ تھا بھی نہیں۔ یہ میری اور میرے دل کی شدید مجبوری ہے جس نے مجھے آپ تک اپنی بات پہنچانے کے لیے ایسا گرا ہوا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔۔۔۔ ہوسکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔''

وہ اَب بھی یونہی خاموش سی سر جھکائے کھڑی نیچے بچھے قالین میں نظریں گاڑے ہوئی تھی۔ اس نے پھر وہی بات دُہرائی۔

''آپ نے اپنی بات کہہ دی۔۔۔۔ اب مجھے جانے دیں۔۔۔۔ مَیں آپ کی منت کرتی ہوں۔''

''مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔''

مَیں اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ ہَوا کے ایک جھونکے کی طرح وہاں سے اپنا نازک وجود سنبھالتی ہوئی نکل گئی۔ بس اس کی خوشبو کمرے میں بکھری رہ گئی۔ مَیں نے باہر کے برآمدے کی طرف اسٹڈی کی کھلنے والی کھڑکی میں اُسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ نگہت اور حیاء کے پاس رُکے بغیر آگے بڑھ گئی۔ نگہت اُسے آوازیں دیتی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی۔ حیاء کی نظر کھڑکی سے ہوتی ہوئی مجھ پر پڑی اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے آداب کیا اور پھر وہ بھی ایمان کے پیچھے بھاگ گئی۔ مجھے اس لمحے حیا بہت اچھی لگی۔ اس لڑکی نے ایک انجانے انسان پر اعتبار کر کے اپنی جان سے پیاری بہن کو اس سے ملنے بھیج دیا تھا۔ جانے نگہت نے اُسے کس طرح میرا اعتبار دلایا ہوگا۔ بہر حال جو بھی تھا، فی الحال تو نگہت اور حیاء دونوں کی ہی خیر نہیں تھی۔ ظاہر ہے ایمان ان سے شدید ناراض ہوگئی ہوگی۔ جانے اَب وہ دونوں اسے کس طرح منائیں گی۔

میں بہت دیر تک اس کمرے میں یونہی سحر زدہ سا بیٹھا رہا۔ جانے کیوں وہاں سے

باہر جانے کے لیے میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔ میں بار بار اس منظر کو آنکھیں بند کر کے محسوس کرنا چاہتا تھا جب وہ ناز پیکر یہیں اس کمرے میں سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کا نازک وجود کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا، اور وہ مجھ سے ہم کلام تھی۔

دھوپ ڈھل چکی تھی اور اب روشن دان سے اندر چھننے والی روشنی میں وہ حدت باقی نہیں تھی۔ میری گھڑی پر نظر پڑی تو شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ بادل نخواستہ میں وہاں سے اُٹھا۔ اچانک میری نظر اس کتاب پر پڑی جو ایمان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ مَیں نے آگے بڑھ کر کتاب اٹھالی۔ بانو قدسیہ کی ''راجہ گدھ'' تھی۔ اچانک میری نظر کتاب کے پاس ہی پڑے دو چھوٹے سے موتیوں پر پڑی۔ ایسے موتی تو مَیں نے ایمان کے سینڈلز میں لگے دیکھے تھے۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کی نظر پورا وقت زمین میں گڑی ہوئی تھی اور میری نظر بھی اس کے نظر کے تعاقب میں اس کے قدموں کی طرف کئی بار اٹھی تھی۔ ضرور جب اس کے ہاتھ سے کتاب گری ہوگی تو اس کے قدموں سے ٹکرائی ہوگی۔ تبھی یہ موتی علیحدہ ہو کر گر پڑے ہوں گے۔ میں نے وہ دونوں موتی اُٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔

اب نگہت کا انتظار کرنے کا فائدہ نہیں تھا۔ مجبوراً میں ٹوٹے قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ رات بھر میری پلکوں تلے وہ سارے منظر کسی فلم کی طرح چلتے رہے۔ میری حالت اس نالائق طالب علم کی سی تھی جو پرچے میں ایک بھی سوال ٹھیک طرح سے حل کر کے نہ آیا ہو لیکن پھر بھی اُسے نتیجے کا بے چینی سے انتظار ہو۔

کبھی کبھی ہم زندگی میں کچھ ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمیں نتیجے کی کیفیت سے زیادہ نتیجہ کا پتہ چل جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا یا مخالفت میں، بس فیصلہ ہو جانے کی تمنا ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسا کمزور اعصاب والوں کے ساتھ ہوتا ہے جو انتظار کی اذیت اور چبھن کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ذہنی دباؤ کے ہاتھوں تنگ آ کر دھائی دینے لگتے ہیں کہ بس جو بھی ہونا ہے وہ آج ہی ہو کر رہے۔ ایسے لوگ اس وقت اس بات سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں کہ جس نتیجے اور جس فیصلے کا اپنی مخالفت میں طے ہو جانے کا خیال ہی انہیں اس قدر ہلکان کر رہا ہے کہ وہ

بے چینی سے اس کے اعلان کی دُعائیں کر رہے ہیں، وہ فیصلہ اعلان ہونے کے بعد جب واقعی ان کے حق میں نہیں ہوگا تو تب ان کا کیا حشر ہوگا۔۔۔؟

میری کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی اس رات۔ مجھے ایمان کے فیصلے کا انتظار تھا اور مَیں ایک ایسے کرب سے گزر رہا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، بس مجھے جلد از جلد اس کا فیصلہ سنائی دے دیا جائے۔ شاید اس جلد بازی میں میرے دل کی ایک اور چور سی تمنا کا بھی عمل دخل تھا۔ میرا دل اس وقت کسی طور بھی اس دلبر کی طرف سے کسی رابطے، کسی کلام کی خواہش میں مچل رہا تھا۔ مَیں چاہتا تھا کہ اس کے ہونٹوں پہ بس میرا نام آئے۔۔۔ چاہے، بر سرِ الزام ہی آئے۔ جانے عشق میں یہ دل ایک چھوٹے بچے کی طرح کیوں برتاؤ کرنے لگتا ہے۔ عشق میں دل کو صرف اُسی پل، اُسی لمحے، اُسی دن کی فکر ہوتی ہے جو گزر رہا ہوتا ہے۔ مستقبل کا ڈر، خوف یا وسوسے اس سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ عشق کو بس حال سے غرض ہوتی ہے۔ عشق انجام سے بے خبر اور لاتعلق ہوتا ہے۔

جانے وہ رات کیسے ڈھلی اور کب صبح ہوئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ مَیں اڑ کر نگہت کے پاس پہنچ جاؤں اور اس سے کل کی تمام روداد پوچھوں، کرید کرید کر سوال کروں، لیکن روز روز یوں پُرانی حویلی جانا بھی تو کچھ ٹھیک نہ تھا۔ نگہت میری منہ بولی بہن ہی سہی لیکن آس پاس حویلی کے دوسرے نوکر چاکر بھی تو تھے۔ جانے وہ میرے روز روز کے یوں وہاں آنے اور نگہت سے تنہائی میں ملنے کو کیا رنگ دیں۔ پھر مَیں نے خود ہی ان فضول خیالات کو سر سے جھٹک دیا۔ یہ مَیں کیا سوچ رہا تھا، یہ بے بنیاد سے وہم میرے اندر کہاں سے پلنے لگے تھے۔۔۔؟ شاید محبت انسان کو اپنے اُوپر شک کرنا بھی سکھا دیتی ہے۔

ساڑھے گیارہ بجے شاکر مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے کمرے تک آن پہنچا۔ مَیں ابھی تک کمرے میں ہی بند تھا صبح سے، شاکر نے مجھے نگہت کا دیا ہوا ایک بند لفافہ تھمایا اور حسبِ معمول پوچھا۔۔۔ ''بابا۔۔۔ کل آپ حویلی گئے تھے۔۔۔ کچھ کام تھا کیا۔۔۔؟''

حالانکہ شاکر نے اپنے معمول کے مطابق عام سا سوال ہی کیا تھا لیکن جانے کیوں میں گڑبڑا سا گیا۔۔'' ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہاں۔ میرا مطلب ہے کہ کچھ خاص نہیں۔۔۔ نگہت سے کچھ کتابیں نکالنے کا کہا تھا سٹڈی سے۔۔۔ وہی لینے گیا تھا۔''

شاکر نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''دیکھیں حماد بابا۔۔۔۔ اگر آپ نے نگہت کو مزید نئی کتابیں دلوائیں تو میں بہت ناراض ہو جاؤں گا۔ ضرور اس نے اس لفافے میں نئی کتابوں کی فہرست بھیجی ہو گی۔''

مجھے شاکر کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ جانے وہ کیا سمجھ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اس مہینے میں نگہت کو مزید کوئی کتاب نہیں دلواؤں گا۔ شاکر کے جاتے ہی میں نے بے تابی سے فوراً لفافے کو چاک کیا اور اندر سے نگہت کا خط نکالا۔ میری بے چین نظریں خط پر پھسلنے لگیں، لکھا تھا۔

''بھیا جی۔۔۔۔

بُرا پھنسایا آپ نے، وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ بہت ناراض ہو کر گئی ہے یہاں سے۔ اپنی چھوٹی بہن سے بھی بات نہیں کر رہی تھی۔ میں نے آپ کو کہا تھا نا کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔۔۔۔ بہر حال جو ہُوا سو ہُوا۔۔۔۔ آج میں اُس کے گھر جاؤں گی اور میں اور حیاء اسے مل کر منا ہی لیں گے۔۔۔۔ لیکن آپ کے مقدمے کا کیا فیصلہ دیتی ہے۔ یہ اَب خدا ہی جانے۔ میری مانیں تو آپ اپنے گھر والوں سے بات کر کے اُس کے گھر بھیجیں۔۔۔۔ اس سے آپ کی سچائی بھی اس پر واضح ہو جائے گی، ورنہ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو بنا کسی رشتے کے ایسا کوئی تعلق جوڑے۔۔۔۔ خوش رہیں۔''

اس چھوٹے سے خط میں نگہت نے وہی سب کچھ لکھا تھا جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میں وہ چند سطور پڑھ کر بے حد اداس اور پہلے سے کہیں زیادہ بے چین ہو گیا۔ وہی ہُوا، پہلے نتیجہ آنے کی بے چینی تھی اور اَب فیصلہ سننے کے بعد کی بے تابی۔

نا اس کروٹ چین تھا، نہ اُس کروٹ آرام۔

لیکن انسان کی فطرت میں قدرت نے اُمید اور آس کی ڈور سے ہمیشہ بندھے رہنے کا ایک عجیب سا انتظام کر رکھا ہے۔ ایک ڈور ٹوٹتی ہے تو وہ دوسری تھام لیتا ہے۔ دوسری ٹوٹتی ہے تو تیسری۔۔۔۔ یوں یہ سلسلہ اس کی سانس کی ڈور ٹوٹنے تک چلتا ہی رہتا ہے۔ شاید

قدرت نے انسان کی طبیعت میں یہ آس اور اُمید کا سلسلہ نہ رکھا ہوتا تو وہ پہلی نا اُمیدی پر ہی ختم ہو جاتا، مایوسی سے مر جاتا۔

میں بھی ایک نئی آس اور اُمید میں مبتلا ہو گیا کہ نگہت اور حیا جب اس مہ جبیں کو منا لیں گے تو شاید تب اُسے میرے حال پر کچھ رحم آ جائے۔۔۔۔ شاید وہ کچھ کہے۔

اَب میری دھڑکنوں کو اس کی طرف سے کسی پیغام کا انتظار تھا۔ مجھے اس انتظار کی سولی پر ابھی مزید کچھ روز لٹکنا تھا۔۔۔۔

OO

زرد لندن

لندن کی شام اگر دن بھر دھوپ نکلنے کے بعد ہو تو شاید ہی اس سے حسین شام دنیا کے کسی اور خطے پر اُترتی ہوگی۔ اور اگر موسم خزاں کا ہو تو پھر تو سونے پہ سہاگہ والی بات ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سُرخی کا رنگ تھا اور زمین پر خزاں میں جلے سُرخ پتوں نے جیسے اک آگ سی لگائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مصوّر نے صرف سُرخ اور زرد رنگ کی آمیزش سے کینوس پر ایک خوبصورت تصویر بنا ڈالی ہو۔

میں اور کامران اس روز ہائیڈ پارک سے شہر کی طرف جاتی ہوئی سنسان سڑک پر چہل قدمی کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ سڑک دونوں طرف سے گھنے پیپل کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جس کے خزاں رسیدہ پتے ہَوا سے ہمارے سروں پر یوں گر رہے تھے جیسے کسی دولہے کے سہرے پر پھول نچھاور کیے جاتے ہیں۔ سردی کی شدت نے ہم دونوں کو اپنے اپنے اوورکوٹ گلے تک بند کرنے اور ان کے کالر اُٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے جمی ہوئی برف کے ڈھیر دھیرے دھیرے پگھل کر ساتھ بنی لوہے کی جالیوں سے ڈھکی نالیوں میں ایک مدھم سے شور کے ساتھ گر رہے تھے۔ قریب ہی ایک جوڑا سردی سے بے نیاز، وہاں کھڑی آئس کریم گاڑی سے اپنی پسند کی کون آئس کریم بنوا رہا تھا۔ سچ ہے، آئس کریم کھانے کا مزہ تو شدید سردی میں ہی آتا ہے۔ لڑکی اپنے لباس میں خود بھی اس وقت کوئی رنگ برنگی آئس کریم ہی لگ رہی تھی۔ لڑکے نے جانے اُسے کیا کہا، دونوں ایک ساتھ زور سے ہنسے.. کامران نے حسب معمول بُرا سا منہ بنایا اور لندن کی تمام حسین اور جوان لڑکیوں کی عقل کا ماتم کیا۔ دُور کہیں سورج ڈھل رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہ سڑک ہمیں سیدھے اُس ڈوبتے سورج کے گولے کی طرف ہی لے جا رہی ہو۔

"کچھ بھی ہو یار میڈی۔۔۔۔ مجھے اس یہودن کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔ تم

یہاں سکون کی تلاش میں آئے ہو۔ مَیں تو کہتا ہوں چھوڑو یہ پڑھائی وڑھائی کا چکر، میں بھی کچھ دن آف لیتا ہوں اور نکلتے ہیں سوئٹزر لینڈ کی طرف۔ کچھ نئی محبتوں کی تلاش میں۔۔۔۔ بول۔۔۔۔ کیا بولتا ہے۔"

مَیں جانتا تھا کامران کس قسم کی نئی محبتوں کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ "سدھر جاؤ مسٹر کامران۔ تمھاری اپنی حرکتوں کی وجہ سے تین لڑکیاں باقاعدہ سال سال تک تمھاری منگیتر رہنے کے بعد تمھیں چھوڑ کر جا چکی ہیں اب تک، اَب کیا ڈبل ہیٹ ٹرک کا ارادہ ہے۔"

ہم چوک پر بنے ہوئے بڑے سے فوارے کے پاس پہنچ چکے تھے جس کے درمیان ایک بڑے سے لوہے کے بنے شیر کے مُنہ سے خون کی دھاروں کی بجائے پانی کی پھواریں نکل رہی تھیں۔ البتہ اس وقت شدید سردی کی وجہ سے دو چار دھاریں جم کر باقاعدہ برف کی پتلی کمانوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ آخری ٹرام نکلنے ہی والی تھی۔ ہم دونوں باقاعدہ دوڑتے ہوئے پیلے رنگ کی ٹرام جس پر بڑی سے لال لکیریں ڈلی ہوئی تھیں، میں سوار ہو گئے۔ اندر ایک جپسی عجیب سے گھاگھرا نما لباس میں باقی لوگوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کامران کو اور کامران اُسے دیکھ کر مسکرایا۔ میں نے حیرت سے کامران کی طرف دیکھا۔

"تم اسے جانتے ہو۔"

"نہیں۔۔۔۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو مجھے جانتی ہے، تبھی تو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔" اتنے میں جپسی نے والہانہ انداز میں ہاتھ پھیلائے اور کامران کی طرف بڑھی۔ کامران کے دل کی کلی کی طرح اس کا چہرہ بھی کھل گیا اور اس نے بھی ہاتھ پھیلا دیے۔ جپسی ہم دونوں کے درمیان میں سے ہوتی ہوئی ہمارے پیچھے کھڑے لمبے بالوں والے ایک مَیلے سے ہپی کے گلے جا لگی، کامران ویسے ہی بازو پھیلائے کھڑا رہ گیا۔ مجبوراً مجھے ہی اسے گلے لگانا پڑا۔ چند لمحے تو وہ حیرت اور غصے کے عالم میں ہی گنگ سا کھڑا رہ گیا اور پھر ہم دونوں ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ٹرام اپنی مخصوص دھیمی سی رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

کچھ لوگ محبت کو زندگی میں سب سے خالص جذبہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سچی محبت سے زیادہ خالص جذبہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اتفاق سے مَیں اور کامران دونوں ہی

اس نظریے سے متفق نہ تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں بھی ہم دونوں کے نظریات ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔

مَیں نفرت کو دُنیا کا سب سے مکمل اور خالص جذبہ سمجھتا تھا، محبت میں تو پھر بھی کہیں کچھ ملاوٹ، کچھ کھوٹ ہو سکتا تھا، لیکن نفرت بنا کسی کھوٹ اور ملاوٹ کے ہوتی ہے۔ بالکل اصلی، شدید اور خالص۔۔۔۔ جب کہ کامران کے خیال میں ''ہوس'' دنیا کا سب سے سچا جذبہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان صرف ہوس کے معاملے میں ہی خالص اور سچا ہوتا ہے۔ باقی سب جذبوں میں وہ کہیں نہ کہیں ڈنڈی مار ہی جاتا ہے۔ چاہے محبت ہو یا چاہے نفرت لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ چاہے محبت ہو یا نفرت، چاہے عشق ہو یا پھر صرف ہوس۔۔۔۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ چاروں ایک ہی جذبے کے چار رُخ دکھائی دیتے تھے۔ محبت کی بنیاد پر نفرت کرنے والے یا عشق کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اپنی ہوس چھپانے والے مجھے ہمیشہ ہی سے منافق لگتے تھے۔ کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کھلے عام ہوس کا رشتہ رکھنے والے ہی اصل میں بہادر اور سچے لوگ ہوتے ہیں۔ شاید ہوس ہی دنیا کا ازلی اور شاید ابدی رشتہ ہوتا ہے۔ اور ہم سب بھی ایسے ہی کسی رشتے کی پیداوار ہیں۔

کامران نے رات سونے سے پہلے پھر مجھے سر آئزک کی بیٹی مس پیریز کے ساتھ اُلجھنے سے منع کیا۔ دراصل اسے بچپن سے میری ایک خاص عادت کا بہت اچھی طرح سے اندازہ تھا۔ میں کسی ایک خاص حد تک ہی چیزوں کو ٹال پاتا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ معاملہ میرے دماغ کی رگوں پر سوار ہونے لگتا تو پھر مَیں اپنے نفع ونقصان کا احساس بُھلا کر اس معاملے کو سدھارنے کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ کامران جانتا تھا کہ مَیں یہاں اپنے ماضی کی پرچھائیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے آیا ہوں لہٰذا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی قسم کا تناؤ برداشت کروں۔

لیکن شاید قدرت اس وقت کامران کی خواہش کے حق میں نہیں تھی۔

اگلی صبح میری پہلی مڈبھیڑ ہی مس پیریز سے ہو گئی۔ یونیورسٹی کے احاطے میں جوزف ندی کنارے اپنی پسندیدہ جگہ پر کھڑا پرندوں کو چارہ ڈال رہا تھا۔ اُس نے مجھے دُور سے آتے دیکھا تو وہیں سے ہاتھ کے اشارے سے مجھے قریب بلانے لگا۔ میری کلاس میں ابھی

کچھ وقت باقی تھا۔ سوچا دو گھڑی جوزف سے ہیلو ہائے کر لوں۔ مَیں جوزف کی طرف بڑھنے کے لیے جیسے ہی لکڑی کے بنے ہوئے اس پل پر چڑھا جو ندی کے دونوں کناروں کو ملانے کے لیے بنا ہوا تھا۔ تو اچانک دوسری طرف سے سارہ اپنے چار دوستوں کے گینگ کے ہمراہ اس پل پر چڑھ آئی۔ اس کے دوستوں میں دو لڑکے اور دو لڑکیاں شامل تھیں اور یہ سب میری ہی کلاس کے اسٹوڈنٹ تھے۔ سارہ نے قریب سے گزرتے ہوئے عبرانی زبان میں کچھ کہا۔ وہ شاید اس بات سے بے خبر تھی کہ متروک زبانیں کبھی میری خاص دلچسپی کا حامل ہوا کرتی تھیں۔ جیسے لوگوں کو ٹکٹ جمع کرنے، سکے اکٹھے کرنے مصوری کرنے کا شوق ہوتا ہے، اسی طرح کبھی میرا واحد شوق دنیا کی پُرانی زبانوں کے بارے میں جاننا تھا۔ یہ شوق مجھے دادا جان سے منتقل ہوا تھا۔ ہماری پُرانی حویلی کی لائبریری اور سٹڈی میں اب بھی اس طرح کی کئی قدیم کتابوں کے نسخے محفوظ تھے۔ جن میں توریت اور زبور کے قدیم نسخے بھی شامل تھے۔

اسی لیے مجھے سارہ کی کہی ہُوئی بات سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے میرے مذہب کے بارے میں کوئی غلط بات کہی تھی۔ لیکن انگریزی کے بجائے عبرانی زبان اس نے شاید اس لیے استعمال کی تھی کہ مقصد شاید مجھے چوٹ پہنچانے سے زیادہ اپنے دوستوں سے داد وصول کرنا تھا۔ مَیں بھی اتنی عبرانی تو بول ہی سکتا تھا، سو مَیں نے بھی عبرانی میں ہی اُسے جواب دیا۔

''کوئی مذہب کسی دوسرے کے مذہب پر کیچڑ اُچھالنے کی اجازت نہیں دیتا، اور کیچڑ اُچھالنے والے دراصل خود اپنے مذہب کو ہی گالی دے رہے ہوتے ہیں۔''

میری بات سنتے ہی چند لمحوں کے لیے سارہ گنگ سی رہ گئی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ مَیں اس کی بات سمجھ جاؤں گا۔ نہ صرف سمجھوں گا بلکہ اُسے اس کی زبان میں ہی جواب بھی دوں گا۔ اس کے گروپ میں سے ایک لڑکا جو شاید عبرانی نہیں جانتا تھا جلدی سے سارہ کے قریب آیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ مَیں نے اس سے کیا کہا ہے۔ سارہ اب بھی خاموش کھڑی تھی۔ مَیں آگے بڑھنے لگا۔ دوسرا لڑکا میرے راستے میں آ کھڑا ہوا اور میرا راستہ بند کر دیا۔ چند لمحے ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اک دوجے کو گھورتے رہے۔

جوزف جو اَب تک دُور کھڑا یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔شاید معاملے کی سنگینی کو بھانپ گیا، اسی لیے وہ تیز تیز قدموں سے ہماری طرف چلا آیا اور دُور ہی سے چلّا کر کہنے لگا'' ہے حماد مین تم کہاں ہو۔۔۔؟ جلدی یہاں آؤ۔۔۔۔ مجھے تُم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

جوزف چونکہ اسی یونیورسٹی کا ایک ٹیچر تھا لہٰذا اُس کے سامنے ان لڑکوں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔مَیں بھی سامنے کھڑے لڑکے کو ہٹا کر جوزف کی طرف بڑھ گیا۔سارہ کا گروپ بھی دوسری جانب چلا گیا۔

جوزف نے پریشانی سے مجھے دیکھا۔

''کیا کہہ رہے تھے یہ لوگ تمھیں۔''

''کچھ نہیں۔۔۔مَیں نہیں جانتا تھا کہ نائن الیون کے بعد یہ مذہبی تعصب ان بڑی یونیورسٹیوں تک پھیل چکا ہے۔''

''ان لوگوں سے نہ ہی اُلجھو تو بہتر ہے۔یہ سب ہی یہاں کے اُونچے درجے کے یہودی اُمراء کے بچے ہیں۔تمھارے لیے کسی بھی وقت کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔''

مَیں اور جوزف چلتے ہُوئے اپنے مخصوص بینچ پر جا بیٹھے۔ہمارے اردگرد کبوتروں کا ایک غول دانہ چگ کر ایک زوردار آواز کے ساتھ اُڈاری بھر گیا، اور اس کی جگہ نئے کبوتروں نے لے لی۔

''میں کسی سے اُلجھنا نہیں چاہتا۔لیکن جانے یہ لوگ کیوں ہر بار میرا راستہ کاٹ جاتے ہیں۔جانے انہیں مجھ سے کیا پرخاش ہے۔''

جوزف نے خاکی کاغذ کے لفافے سے کبوتروں کا دانہ نکال کر فضا میں اُچھال دیا۔

''مَیں جانتا ہوں تم اپنے کام سے کام رکھتے ہو، نہ ہی تم نے کبھی ان لوگوں سے از خود اُلجھنے کی کبھی کوئی کوشش کی ہے۔لیکن یہ لوگ اس یونیورسٹی کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہاں کے اسٹوڈنٹس کو اپنی رعایا۔اور تم رعایا کے جملہ حقوق پر پورے نہیں اُتر رہے۔''

''کیا مطلب۔۔۔رعایا کے جملہ حقوق پر کیسے پورا اُترا جا سکتا ہے۔''

''دراصل تمھارے انداز میں، تمھاری چال ڈھال میں اور تمھارے بات کرنے کے انداز میں ایک خاص متانت، ایک خاص غرور سا ہے۔تمھاری شخصیت میں مرعوبیت کی ذرا

بھی جھلک نہیں ہے۔اور یہی بات ان سب کو کھلتی ہے۔جو شخص ان سے مرعوب نہ ہو۔ان کے سامنے تن کر چلے۔یہ بھلا اُسے کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔''

مجھے غصہ آ گیا۔

''مرعوب ہونے یا ان سے دبنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔۔۔۔مَیں کسی خیراتی سکالر شپ پر تو یہاں آیا نہیں ہوں۔ہزاروں پونڈ فیس بھری ہے۔اس یونیورسٹی کا میرٹ ٹیسٹ پاس کیا ہے۔بلکہ مَیں شاید یہاں پر موجود ہر اسٹوڈنٹ سے زیادہ ڈونیشن اور فیس دیتا ہوں کیونکہ مجھے اسپیشل سیٹ پر یہاں داخلہ دیا گیا ہے۔پھر بھلا مَیں کسی کے رُعب میں کیوں آؤں؟''

''تمھارے اسی ڈونیشن اور تمھاری اسی بھاری فیس نے ان یہودی ساہوکاروں کے منہ بند کر رکھے ہیں۔تم ان کے لیے ایک سونے کی کان ہو جسے یہ اپنی انا کے ہاتھوں کھو نہیں سکتے۔۔۔۔بُرا مت ماننا۔۔۔۔یہ تمھاری قابلیت نہیں تھی جس کی وجہ سے تمھیں یہاں داخلہ ملا۔۔۔۔بلکہ وہ تمھاری بینک بیلنس کی شیٹ جو تمھارے ریکارڈ کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔اُس نے تمھیں اس یونیورسٹی تک پہنچایا ہے۔''

مَیں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

''یہ سب آپ کو کیسے پتہ چلا؟''

''تم نے شاید غور نہیں کیا۔۔۔۔یہاں گنے چُنے مسلمان اسٹوڈنٹ ہیں۔ان میں سے بھی زیادہ تر برائے نام مسلمان ہیں۔جو یہاں کی تہذیب میں رل مل کر اپنا اور دوسروں کا فرق مٹا چکے ہیں۔باہر سے صرف تمہی ہو۔یہ یونیورسٹی داخلہ دیتے وقت سات شجروں تک حسب نسب کھنگالنے کی عادی ہے۔ہوسکتا ہے تمھارے شجرۂ نسب میں انہیں کوئی قابل فکر چیز بھی نہ ملی ہو۔''

مَیں نے چونک کر جوزف کی جانب دیکھا، یہ بات تو اس نے چاہے انجانے میں ہی کہی۔لیکن بالکل ٹھیک کہی تھی۔میرے دادا، پردادا برٹش گورنمنٹ کے خاص وفادار اور وظیفہ خوار رہ چکے تھے، ہماری سات نسلوں میں کوئی باغی پیدا نہیں ہوا تھا۔

مَیں نے غور سے جوزف کو دیکھا۔

''لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں۔آپ بھی تو اسی یونیورسٹی کی انتظامیہ

کاایک حصہ ہیں۔ پھر انتظامیہ کے یہ راز مجھ پر کیوں کھول رہے ہیں۔''

جوزف مسکرایا۔

''مَیں خود بھی اس بات پر کبھی کبھی بہت حیران ہوتا ہوں کہ آخر تُم میں ایسی کیا بات ہے جو اپنا اپنا لگنے پر مجبور کرتی ہے۔ تم اوروں سے مختلف کیوں دِکھتے ہو؟۔۔۔۔ شاید اس لیے کہ مَیں جانتا ہوں کہ تم نے کبھی ٹوٹ کر کسی سے محبت کی ہے۔۔۔۔ اور میرے دل میں محبت کرنے والوں کا بہت اُونچا مقام ہے۔۔۔۔ بہت اونچا۔''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''گویا آپ نے بھی کسی سے کبھی محبت کی ہے۔۔۔۔؟ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مَیں نے کبھی ٹوٹ کر کسی کو چاہا ہوگا۔۔۔۔؟ ہوسکتا ہے مَیں محبت کے نام سے بھی واقف نہ رہا ہوں۔''

''ناممکن۔۔۔۔ تمھاری آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتیں۔۔۔۔ ان کی گہرائی میں محبت کے کتنے راز، کتنے درد چھپے ہیں۔۔۔۔ یہ شاید تم خود بھی نہیں جانتے۔۔۔۔ محبت اِنسان میں ٹھہراؤ لے کر آتی ہے۔۔۔۔ وہ اُوپر سے جتنا پُرسکون نظر آتا ہے، اندر سے اتنا ہی بے چین ہوتا ہے۔۔۔۔ تم بھی ایک ایسا ہی خاموش اور پُرسکون سمندر ہو۔۔۔۔ جو اپنے اندر ہزاروں طوفان چھپائے بیٹھا ہے۔''

مَیں نے ایک لمبی سی سانس لی۔۔۔۔ تو گویا اَب یہ دل کے راز میرے چہرے سے بھی عیاں ہونے لگے تھے۔۔۔۔ کہاں جاؤں۔۔۔۔؟ کیسے چھپاؤں اپنے اس کرچی کرچی دل کے آئینے کو۔۔۔۔؟

مَیں اور جوزف یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارے سامنے نہر میں پانی بہنے سے فضا میں اِک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ ہمارے آس پاس کبوتروں اور دانے چگتے پرندوں کی ملی جلی آوازیں تھیں۔ سرد ہَوا میری آنکھوں سے ٹکرائی تو مجھے پتہ چلا کہ میری آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے ہیں۔ مَیں نے کوٹ کی جیب سے گہرا کالا چشمہ نکال کر پہن لیا۔ دل کے راز جب دل میں ہی رہیں تو اچھا ہوتا ہے۔۔۔۔ لیکن جب یہ آنکھوں سے بہہ کر چھلکنے لگیں تب ان پر پردہ ڈال لینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

محبت کی دوپہر

محبت اِنسان پر دھوپ کی طرح دھیرے دھیرے اُترتی ہے، جون، جولائی میں کسی صحرا کی تپتی دھوپ کی طرح۔ جس کی شدّت کا صبح کے پہلے پہر میں انسان کو اتنا پتہ نہیں چلتا، لیکن جیسے جیسے محبت کی دوپہر قریب آتی ہے، بے چینی اور چُبھن سے انسان کا بُرا حال ہونے لگتا ہے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے اُگ آتے ہیں۔ دم لبوں پر آ کر اٹک جاتا ہے، نہ جان جسم کے اندر رہتی، نہ پوری طرح جسم سے باہر نکلتی ہے۔

مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب مَیں ایمان کی محبت کے پہلے پہر سے نکل کر اس محبت کی دوپہر تک جا پہنچا تھا۔ مجھے تو اس کی محبت کے پہلے پہر کا سکون بھی نصیب نہیں ہُوا تھا۔ جب تک مَیں اس محبت ابتدائی کے جھٹکے سے سنبھلا، تب تک اس کی محبت کی کڑکتی دوپہر میرے سر پر موجود تھی۔

اس دن حویلی کی سٹڈی میں روکے جانے پر اور اس سازش میں اپنی عزیز از جان سہیلی اور اپنی بہن کے شریک ہونے پر وہ اس قدر برہم تھی کہ اُس نے کئی روز تک اپنی بہن حیا اور نگہت سے بات نہیں کی۔ لیکن نگہت بھی اپنی دھن کی پکی تھی۔ وہ باقاعدہ دھرنا دے کر ایمان کے گھر کے کچے صحن میں جا بیٹھی کہ جب تک مجھے معاف نہیں کرو گی، مَیں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ ایمان کی اماں نے پہلے نگہت کو اور پھر ایمان کو دُھائیاں دیں کہ گھر کے مردوں کی واپسی کا وقت ہے، خدا کے لیے ان دونوں کے درمیان جو بھی جھگڑا ہے ختم کر دیں۔ خاص طور پر انہیں مولوی صاحب کا ڈر تھا۔ اگر وہ گھر آ جاتے اور نگہت کو یوں صحن میں بیٹھا دیکھ لیتے تو جانے کیا سمجھتے۔۔۔۔؟ ان کا بچوں پر رعب بھی تو بہت تھا۔ مجبوراً ایمان کو ہی ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ نگہت کو بازو پکڑ اُٹھا کر اپنے اور حیا کے کمرے میں لے گئی اور پھر وہاں ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ نگہت کے گلے لگ کر خوب روئی اور اُس نے نگہت سے وعدہ لیا

کہ وہ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گی جس سے ایمان یا اس کے ماں باپ کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔ نگہت نے اس سے وعدہ تو کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسے یہ یقین دلانے کی بھی پوری کوشش کی کہ مَیں اُن عام نوجوانوں میں سے نہیں ہوں جو اس طرح کے رشتوں کو کھیل سمجھتے ہیں۔ نگہت نے اپنے ماں باپ کی قسم کھا کر اُسے میری اور میرے جذبے کی سچائی کا اعتبار دلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس معاملے میں ایمان نے صرف اتنا ہی کہا کہ اس کی زندگی کا اختیار صرف اس کے ماں باپ کو ہے، وہ جہاں چاہیں گے، جیسے چاہیں گے اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی بات کہنا چاہتی ہے اور نہ ہی سننا چاہتی ہے۔

یہ تمام باتیں مجھے نگہت کی زبانی پتہ چلی تھیں۔ نگہت نے پُرانی حویلی بلا کر یہ ساری داستان میرے گوش گزار کرتے ہُوئے مجھے پھر یہی مشورہ دیا کہ مَیں اگر ایمان کی جانب کوئی پیش رفت کرنا چاہتا ہوں تو اس کا صرف، واحد اور ایک ذریعہ میرے گھر والوں کی طرف سے اس کے گھر رشتے کا جانا ہی تھا۔

بہر حال مجھے ایک بات کا اطمینان تو ہو گیا تھا کہ ایمان فی الحال کہیں منسوب نہیں تھی لیکن اس جیسی ماہ تاب کے لیے جانے کتنے اور دل دھڑکتے ہوں گے۔ جانے اور کتنوں کی وہ نورِ نظر ہوگی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا، بہت جلدی کرنا تھا۔ لیکن مجھے اپنے گھر والوں کے ردِ عمل کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ شہر کے سب سے اُونچے اور امیر گھرانے کا رشتہ اور وہ بھی کسی غریب مولوی کے گھر؟ ہماری شان اور انا بھلا یہ سب کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن گھر والوں سے بات کیے بنا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ مجھے مولوی صاحب کے گھر تک پہنچنے کے لیے اپنے گھر والوں کی شناخت کی ضرورت تھی۔ میری اپنی تو فی الحال کوئی شناخت بھی نہیں تھی۔

اور پھر وہی ہُوا جس کی مَیں توقع کر رہا تھا۔ پورے گھر میں جیسے ایک بھونچال سا آ گیا۔ سب سے پہلے امی چلائیں۔ "کیا۔۔۔؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔"

کمشنر صاحب کو جلال آ گیا۔ وہ مُنہ سے پائپ کا دھواں اُگلتے ہُوئے دھاڑے "ہماری سات نسلوں کی عزت کو بٹہ لگانے چلا ہے یہ۔" عبرینہ بھابھی نے بُرا سا منہ بنایا۔ "واٹ رَبش What Rubbish۔۔۔ سجاد بھائی نے سر پیٹ لیا۔ "مجھے پتہ تھا یہ کوئی

نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا۔" پورے گھر میں صرف عباد تھا جس نے آ کر میری پیٹھ ٹھونکی "گریٹ میڈی بھائی گریٹ۔۔۔ زبردست چوائس ہے۔ بیسٹ آف لک"۔۔۔ لیکن عباد بے چارہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صرف قسمت کے لیے دُعا دینے سے کسی کی قسمت اچھی نہیں ہو جاتی۔ اور پھر مجھے تو اپنی قسمت کی لکیر پھر نئے سرے سے تراشنی تھی۔ صرف ایک تیشے کی مدد سے پھر سے دودھ کی نہر کھودنا تھی۔ زندگانی پھر سے کوہ کن کا امتحان لینے کو تیار تھی۔

میرے والدین اور بڑوں نے اس معاملے میں میری کوئی بات سننے سے ہی صاف انکار کر دیا۔ مجھے یاد ہے ہم سب ڈنر ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے اپنا مدعا پھر سے دُہرایا۔۔۔ بابا نے غصے میں ہاتھ میں پکڑے چھری اور کانٹے کو زور سے پلیٹ میں دے مارا۔

"بس۔۔۔ بہت سن لی تمہاری عشق کی داستان۔۔۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔۔۔ تم اگلے ہفتے لندن جا رہے ہو۔ مَیں نے وہاں کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں تمہارے داخلے کا انتظام کر دیا ہے۔ دو سال کی ڈگری ہے۔ پہلے پڑھائی ختم کر لو۔۔۔ شادی وادی بھی ہوتی رہے گی۔"

"لیکن مَیں لندن نہیں جانا چاہتا۔۔۔ مجھے اکنامکس کی ڈگری میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

امی چلائیں "تو پھر کس چیز میں دلچسپی ہے تمہیں ہاں۔۔۔؟ چار دن میں ہی ایسا کیا جادو کر دیا ہے تم پر اس شریف زادی نے۔۔۔؟

عبرینہ بھابھی نے فوراً تڑکا لگایا "مجھے تو اسی دن اس پر شک ہو گیا جس دن وہ یہاں پارٹی میں نیک پروین بنی بیٹھی تھیں۔ اُف۔۔۔ یہ چھوٹے لوگ۔"

مَیں مزید یہ لغویات نہیں سن سکتا تھا، لہٰذا مَیں غصے میں اپنی کرسی پیچھے کھسکا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور نیپکن زور سے میز پر جھٹک کر وہاں سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بھی امی کی تیز غصے میں بھری آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ شاید بابا سے کہہ رہی تھیں۔

"دیکھا۔۔۔ دیکھا آپ نے۔۔۔ کس قدر خود سر ہو گیا ہے۔۔۔ مَیں تو کہتی ہوں۔۔۔"

ان کا جملہ پورا ہونے سے پہلے مَیں ڈائننگ ہال سے باہر نکل چکا تھا۔ لیکن کاش میں

اس دن وہاں کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے امی کا پورا جملہ سُن لیتا تو اگلے دن وہ غضب نہ ہوتا جو ہُوا۔

سوائے عباد کے تمام گھر والوں نے میرا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اگلے دن مَیں یونہی گم سم اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اچانک نیچے سے امی اور بھابھی کے زور زور سے چلانے کی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی سے لڑ رہی ہوں۔ پہلے تو مَیں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ آج کل گھر میں ایسے ڈرامے تقریباً روز ہی ہوتے تھے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ معاملہ تو کچھ مجھ سے متعلق ہے۔ مَیں جلدی سے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ریلنگ کے قریب آ کر دیکھا تو نیچے لاؤنج میں مولوی علیم سر جھکائے کھڑے تھے، ان کے ماتھے پر ندامت کا پسینہ آنکھوں میں آنسو اور سارے بدن میں جیسے لرزش سی تھی، امی اور بھابھی مل کر جانے انہیں کیا کیا مغلظات سنا رہی تھیں۔ میرے قدموں کے نیچے سے تو جیسے زمین ہی نکل گئی۔ مَیں وہیں اوپر سے کھڑے کھڑے چلایا۔ ”امی۔۔۔ بس کریں بہت ہو گیا۔“

امی اور بھابھی مجھے دیکھ کر چپ ہو گئیں اور لاؤنج سے ملحقہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئیں۔ مولوی صاحب بھی پلٹے اور ٹوٹے ہوئے قدموں سے واپس ہو لیے، جب تک مَیں جوتے پہن کر بھاگتا ہوا باہر پہنچا وہ اپنی سائیکل نکال کر گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ مَیں بھاگتا ہوا ان کے سامنے آ گیا اور ان کے راستے میں مزاحم ہو گیا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں سے آنسو اس رفتار سے بہہ رہے تھے کہ ان کی سفید داڑھی بھی بھیگ چکی تھی۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا بس میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ان سب کی طرف سے مَیں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ حالانکہ ان کا گناہ قابل معافی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی مَیں آپ سے التجا کرتا ہوں۔“

مولوی صاحب نے نظر اُٹھا کر مجھے دیکھا، ان کی اس ایک نظر میں جو شکوہ تھا اس نے جیسے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا، میری نظر خود بخود جھک گئی۔

”مَیں نے تمھارا کیا بگاڑا تھا حماد میاں۔ غریب آدمی کے پاس صرف ایک ہی بھرم ہوتا ہے۔ اس کی عزّت کا بھرم۔۔۔ تم نے آج مجھ سے وہ بھرم بھی چھنوا دیا۔ کیوں۔۔۔

آج بھرے بازار میں میری معصوم بچیوں کے کردار پر کیچڑ اُچھالا گیا۔ انہیں رُسوا کیا گیا، صرف تمھاری وجہ سے، کاش۔۔۔ کاش مَیں تمھیں کوئی بددُعا دے سکتا۔۔۔ لیکن۔۔۔ بہر حال وہ بڑا انصاف والا ہے۔۔۔ میرا انصاف بھی وہ خود ہی کرے گا۔“۔۔۔ مولوی صاحب کی آواز جذبات کی رو میں ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہی تھی۔ انہوں نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ اپنی سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیے۔ مَیں سر جھکائے وہیں گیٹ کے پاس کھڑا رہ گیا۔

میرے ذہن میں طوفانوں کی آندھی چل رہی تھی۔ میرے ذہن میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی کہ میرے گھر والے اس حد تک بھی گر سکتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا مجھ پر کوئی زور نہیں چل سکتا۔ اس لیے انہوں نے رات ہی کو اس وجہ کو ہی ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا جس کی وجہ سے مَیں نے بغاوت کی جرأت کی تھی۔ کاش۔۔۔ کاش اگر مجھے پہلے ان کے ارادوں کا علم ہو جاتا تو مَیں مولوی صاحب کو راستے سے ہی واپس بھیج دیتا۔۔۔ کاش۔۔۔ لیکن اَب کیا ہو سکتا تھا۔ امی اور بھابھی نے موقع پا کر اپنا وار کر دیا تھا۔ مولوی صاحب کو گالی دی گئی تھی کہ وہ محفلوں میں اپنی بیٹیوں کو سجا کر اس لیے بھیجتے ہیں کہ مجھ جیسا کوئی رئیس زادہ ان پر فریفتہ ہو جائے۔ اُن کے منہ پر اُس ماہ کی تنخواہ مار کر انہیں آئندہ اس گھر کا رُخ نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ذرا سوچیے۔۔۔ اس سلوک اور ان الزامات کے بعد ایک سفید پوش اور ایک پاک باز غیرت مند انسان کے پاس سوائے مر جانے کے اور کیا چارہ رہ گیا ہو گا؟ لیکن مولوی صاحب جیسوں کے پاس تو موت جیسی عیاشی سرزد ہونے کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ اگر ہمارے مذہب میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو اس روز مولوی صاحب یقیناً خود کو ختم کر لیتے۔ اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ مَیں ان کی اس بے عزتی کا ذمہ دار تھا۔ مجھے اس لمحے خود سے ہی شدید نفرت کا احساس ہُوا۔ مَیں غصے میں واپس اندر کی طرف پلٹا اور پھر میرے راستے میں ڈرائنگ روم، لاؤنج، لابی کی جو بھی چیز آئی وہ ٹوٹ کر کرچیوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ بھابھی تو ڈر کے مارے اپنے کمرے سے ہی باہر نہیں نکلیں۔ البتہ امی کے ساتھ خوب بحث ہوگئی۔ انہوں نے روایتی عورتوں کی طرح مجھے طعنے دیے۔ مجھ پر مولوی صاحب کے گھر والوں کی طرف سے تعویز گنڈوں کے زیر اثر ہونے کا الزام بھی لگا۔ پھر آخر میں وہی۔۔۔

جو ایک ماں کا آخری ہتھیار ہو سکتا ہے۔۔۔ آنسو۔۔۔

رات کو کمشنر صاحب کی عدالت لگی اور میرے خلاف حتمی فیصلہ دے دیا گیا کہ مجھے اس گھر کی روایتوں کو توڑنے کی ہرگز اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور اگلے ہفتے مجھے ہر حال میں لندن کی فلائٹ لینی ہی ہو گی۔ مَیں نے اس رات کمشنر صاحب سے زیادہ بحث نہیں کی۔ مَیں جانتا تھا اور فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا تھا۔

دوسرے دن صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں پُرانی حویلی جا پہنچا۔ شاکر کو حویلی کے دوسرے نوکروں سے اس معاملے کی سن گن مل چکی تھی۔ لیکن گھر پہ کل موجود نہ ہونے کی وجہ سے اُسے پوری بات کی خبر نہیں تھی۔ اس قدر صبح وہ مجھے پُرانی حویلی میں پا کر اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور بھاگا بھاگا میرے پیچھے حویلی کے پُرانے بڑے گول کمرے میں چلا آیا۔

''حماد بابا۔۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔۔۔ یہ مَیں کیا سن رہا ہوں۔۔۔۔ کل مولوی صاحب کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔۔۔۔ بلکہ، مجھے تو شرافت چوکیدار نے بتایا ہے کہ ۔۔۔''

''تم نے ٹھیک سنا ہے، اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہُوا ہے۔''

میں نے شاکر کو ساری بات الف سے لے کر ی تک سنا دی۔ شاکر سر تھام کر وہیں بیٹھ گیا۔ ''یہ آپ نے کیا کیا بابا۔۔۔؟ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ کے گھر والے اس رشتے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔۔۔ اور مولوی صاحب۔۔۔ وہ تو بہت نازک انسان ہیں بابا۔۔۔ اور نگہت۔۔۔ اس سے تو مجھے اس بے وقوفی کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔''

''اس میں نگہت کا کوئی قصور نہیں ہے، تم جانتے ہو وہ میری بات نہیں ٹال سکتی۔ پلیز تم اُسے کچھ مت کہنا۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن جو زیادتی گھر والوں نے مولوی صاحب کے ساتھ کی ہے اس کا ازالہ کیسے ہو گا۔''

''اس کا ازالہ بھی مَیں ہی کروں گا۔ مَیں چاہتا ہوں کہ تم میرا رشتہ لے کر مولوی صاحب کے گھر جاؤ۔'' شاکر اچھل پڑا۔

''کیا۔۔۔؟۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، حماد بابا۔۔۔ مَیں بھلا کیسے۔۔۔؟

''اس کے سوا اب اور کوئی چارہ بھی نہیں۔۔۔ امی اور بابا کبھی اس گھر رشتہ لے کر نہیں جائیں گے اور مولوی صاحب کے اُجلے دامن پر جو داغ میری وجہ سے لگا ہے وہ کبھی مٹ نہیں پائے گا۔ اس لیے میں نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تمھیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے یا نہیں۔؟''

شاکر خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

نگہت چپ چاپ اندر آئی اور چائے کی ٹرے رکھ کر میرے اور شاکر کے لیے پیالیوں میں چائے ڈال کر واپس چلی گئی۔ شاکر نے سر اُٹھایا۔

''بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے آپ نے مجھے بابا۔۔۔

ایک طرف برسوں کی مولوی صاحب سے دوستی ہے تو دوسری طرف آپ کا برسوں کا نمک ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ شاید مَیں اس طرح مولوی صاحب کی برسوں کی دوستی کو کھونے چلا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔۔۔ مَیں آپ کو بھی تو نہیں کھو سکتا۔''

شاکر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ لیکن جانے کیوں اس کی یہ خاموشی مجھے کسی گہرے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔

OO

یادیں

''یادیں بھی ہمارے ساتھ کبھی کبھی کیسے کھیل کھیلتی ہیں۔ یہ ہمیں وہ سب سوچ کر ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں جب ہم کسی کے ساتھ مل کر روئے تھے ---۔ اور کبھی ہمیں یہ سوچ کر رونے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کبھی ہم کسی کے ساتھ مل کر ہنسے تھے۔''

اس دن عبرانی زبان والی نوک جھونک کے بعد سارہ کافی محتاط ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی مجھ پر طنز کے وار تو کرتی تھی۔ لیکن اب اس کے انداز میں احتیاط کا پہلو نمایاں تھا۔ جوزف سے اب بھی ہمارے اسی پسندیدہ اور مخصوص بینچ پر تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی بہت سی اندرونی باتیں بھی بتا دی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اُس کے خاندان میں اب صرف وہ اور اس کی بیوی ہی ایک چھت تلے رہتے ہیں۔ تینوں بچے جوان ہونے کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے گھر چھوڑتے گئے۔ اس عمر میں وہ یہ نوکری بھی اس لیے کر رہا ہے کیونکہ گزر بسر کے لیے اس کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں اور وہ اولڈ ہوم جانا نہیں چاہتا۔ وہ ایک دن مجھے یونیورسٹی سے واپسی پر برج ٹاؤن میں واقع اپنے چھوٹے سے گھر بھی لے کر گیا تھا۔ اس کی بیوی میری ایک مہربان عورت تھی جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی گہری اُداسی تھی۔ وہ مجھ سے اسی طرح پیش آئی جیسے ایک ماں اپنے کسی بچھڑے بیٹے سے پیش آ سکتی ہے۔ اُس نے دیر تک مجھے واپس نہیں جانے دیا اور اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں بھی کھلائیں اور ہمارے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح جاتے ہوئے میری جیبوں میں بھی بھر دیں۔ جیسے بچپن میں میری نانی اور میری دادی ان کے گھر سے واپسی پر میری جیبیں اخروٹ، کشمش، پستے اور خوبانیوں سے بھر دیتی تھیں ---۔ شاید دُنیا کے ہر خطے کی محبت کی ایک ہی بولی ہوتی ہے، شیرے جیسی میٹھی اور کچے دھویں جیسی آنکھیں جلانے والی بولی ----

لندن کے موسم کا بھی بے وفا محبوب کی طرح کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی پل میں

دھوپ چمک رہی ہوتی ہے کہ دوسرے ہی پل رم جھم کی جھڑی آپ کا تن من بھگونے لگتی ہے۔ اُس دن بھی جب صبح میں نے یونیورسٹی کے لیے نکلنے سے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا تو دھوپ چمک رہی تھی۔ لیکن جب میں گھر سے نکل کر سڑک کے نکڑ پر لگی کافی کی مشین تک پہنچا تب تک آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور میرے یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے پھوار پڑنا شروع ہو چکی تھی۔ میں یونہی بھیگتا ہوا، کاندھے پر اپنے نوٹس کا بیگ لٹکائے کلاس روم میں داخل ہوا۔ لیکن یہ کیا۔ آج تو کلاس بالکل خالی پڑی تھی۔ کیا میں جلدی آ گیا تھا یا پھر لیکچر ہی کسی اور روم میں ہونا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا کلاس سے نکلنے کے لیے پلٹا۔ اس لمحے میری نظر لیکچر ہال کے بلیک بورڈ پر پڑی۔ اور وہاں لکھی تحریروں نے میرے قدم جکڑ لیے۔ بلیک بورڈ پر مسلمانوں کے لیے تضحیک آمیز جملے لکھے ہوئے تھے۔ اور ہر جملے کے بعد یہودیوں کا مخصوص نشان (Davidstar) یعنی چھ کونوں والا ستارہ بنا ہوا تھا۔ ہر جملے سے زہر ٹپک رہا تھا، ڈاؤن ود مسلمز (Down with Muslims)، ٹیررسٹس (Terorrists)۔ ☆ وی آر دی اونلی گریٹ ☆ مسلمانوں یہ کیمپس چھوڑ دو، اور اس طرح کے دوسرے بہت سے جملے ----

میں جانتا تھا کہ اس کلاس میں صرف میں ہی ایک اکیلا مسلمان تھا اور یہ سب کچھ میرے لیے ہی لکھا گیا تھا۔ اور کس نے لکھا تھا۔ یہ بھی میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ میرے خون میں ایک عجیب سی گرم لہر دوڑ گئی۔ مجھے پہلی مرتبہ کامران کی کہی ہوئی باتوں میں صداقت محسوس ہوئی۔ اتنے میں کلاس میں ربیکا داخل ہوئی ربیکا آسٹریلین تھی اور میرے ہی سیشن میں میری ہم جماعت بھی تھی۔ اُس نے بلیک بورڈ پر لکھی تحریریں دیکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''ہے میڈی ---۔ یہ سب بکواس کس نے لکھی ہے یہاں پر۔''

کلاس کی سب سے مغرور اور بد دماغ لڑکی نے ---۔ اور بھلا کوئی ایسا کیوں کرے گا۔''

''یو مین سارہ ---؟ نو مین ---۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔''

''اگر تمھیں کہیں وہ مل جائے تو اُس سے کہنا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ خود کو عظیم کہنے اور

سمجھنے والے اس قدر کمزور ہوں گے کہ اُن میں اپنے مخالف کے منہ پر بات کہنے کی جرأت
نہیں ہوگی۔''

مَیں ربیکا کو یہ پیغام دے کر وہاں سے نکل آیا۔ اَب میرا کلاس لینے کا بھی بالکل
نہیں ہو رہا تھا۔ باہر اب بھی ویسے ہی ہلکی سی پُھوار کا سلسلہ جاری تھا۔ جن دنوں بارش یا
باری ہوتی تھی، ان دنوں گھاس کے میدانوں میں اور یونیورسٹی کے درمیان سے گزرتی
کے کنارے پڑے بینچوں اور کرسیوں پر لگی بڑی بڑی نیلی پیلی چھتریاں کھول دی جاتی تھیں
باہر نکلتے ہی جوزف بھی مجھے ایک ایسی ہی نیلی چھتری کے نیچے نہر کنارے اپنے پسندیدہ
پر بیٹھا نظر آیا۔ آج وہ بارش کی تصویر کشی کرنے کے لیے اپنے ساتھ کینوس سٹینڈ وغیرہ
لے کر آیا تھا اور نہر میں گرتی بوندوں سے پیدا ہونے والے پانی کے ارتعاش اور اس ارتعا
سے بگڑتے، سکڑتے پانی کے عکس پر بنی شبیہوں کی تصویر کشی کر رہا تھا۔

مَیں اُس کی طرف بڑھ گیا اور بیٹھ کر اس کی تصویر بنتے دیکھتا رہا۔ واقعی جوزف
اچھا مصور تھا۔ اُس نے نہر میں یونیورسٹی کی عمارت کے عکس کی تصویر بنائی تھی، لیکن یہ سا
عکس کی تصویر نہیں تھی بلکہ نہر کے پانی میں گرتی بارش کی بوندوں سے ہوئی ہلچل کے دو
اس عکس میں ہوتی تبدیلیوں کی تصویر تھی۔ جوزف نے بہت چھوٹی چھوٹی سی جزئیات کا
پورا دھیان رکھا تھا۔ جوزف تصویر بناتے بناتے میری طرف پلٹا۔

''کہو، کیسی لگی۔۔۔؟

''بہت خوب، لگتا ہے کہ کینوس خود ایک نہر ہے۔ جس پر تم بارش کے چھینٹوں
صورت میں رنگ پھینک رہے ہو۔''

جوزف نے خوشی سے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالی بجائی۔

''واہ۔۔۔ میری تصویر کی آج تک کسی نے اتنی مکمل تعریف نہیں کی۔ واقعی تمہار
لفظوں کا جواب نہیں ہوتا۔ مَیں رنگوں سے تصویر بناتا ہوں اور تم لفظوں سے تصویر کشی کر
ہو۔''

جوزف اپنی تصویر کو اختتامی سٹروک دے کر میرے ساتھ بینچ پر آ بیٹھا۔

''کیا بات ہے۔ آج تم کچھ اُلجھے ہوئے سے نظر آ رہے ہو۔''

مَیں نے جوزف کو کلاس روم میں پیش آنے والا سارا واقعہ سنا دیا۔ جوزف کو بھی غصہ
آ گیا۔

''تنگ نظری کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن جانے کیوں، مَیں بھی ربیکا کی اس بات سے
...وں کہ سارہ ایسا نہیں کر سکتی۔ شاید مَیں نے تمھیں پہلے بتایا نہیں۔ وہ یہاں داخلے سے
...ی ایک اور ادارے میں مجھ سے شام کی پینٹنگ کلاسز لیتی رہی ہے۔ اور وہ خود بھی ایک
اچھی مصورہ ہے۔ تم لوگوں کے خلاف اس کے دل میں واقعی بہت بغض بھرا ہوا ہے اور وہ
...شمنی میں کسی انتہا تک جا سکتی ہے۔ لیکن اُسے سامنے سے وار کرنے کی عادت ہے۔ وہ
...چھپ کر کوئی ایسا نیچ اقدام نہیں کر سکتی۔ دراصل وہ اِسے بھی یہودیت کی توہین سمجھتی ہے
...ن کی پیٹھ پیچھے وار کیا جائے۔''

مَیں نے بے زاری سے سر ہلایا۔

''کیا کہہ سکتا ہوں۔۔۔ بہر حال۔۔۔ اَب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا
...لوگوں سے ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید پروپیگنڈا ہی ان یہودیوں کا سب سے بڑا
...ار ہوتا ہے۔''

''ٹھیک سمجھے ہو تم، اسی لیے یہ لوگ ساری دُنیا میں کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ
...کاروبار کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے اور پروپیگنڈہ کو اپنے کاروبار کی وسعت کے لیے
...کامیابی سے استعمال کرتے ہیں کہ جس کا کوئی جواب نہیں۔ اور اس بزنس سے یہ اتنا
...ے ہیں کہ ان کی دولت دنیا کی چند سب سے بڑی مملکتوں کی بادشاہت بدلنے کا باعث
...رہی ہے۔ شاید تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ دُنیا میں فرنچائز سسٹم کے بانی بھی یہی یہودی
...اور اسی سسٹم کی بدولت آج یہ دُنیا کے ہر گلی کوچے میں اپنا کاروبار پھیلا چکے ہیں۔''

مَیں نے غور سے جوزف کی طرف دیکھا۔

''اگر یہ اتنے ہی کامیاب ہیں تو پھر اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔''

جوزف مسکرایا۔ ''شاید یہ ایک خوف ہی ان کی قسمت میں ازل سے لکھ دیا گیا ہے۔
...ک دُنیا میں سب سے زیادہ نبی اسی قوم پر اُترے ہیں۔ یعقوبؑ سے لے کر موسیٰؑ تک
...ہزار نبی اس قوم پر مبعوث ہو چکے تھے۔ اگر اس تعداد کو تم ان کی فی نسل پر تقسیم کرو تو ان کی

ہر نسل پر تو ے نبی اُترے ہیں لیکن پھر بھی یہ قوم گمراہ ہی رہی۔ یہ خوف اسی گمراہی کا خوف ہے۔''

مَیں حیرت سے جوزف کی باتیں سُن رہا تھا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ وہ یہودیوں کی تاریخ کے بارے میں اتنی تفصیل سے جانتا ہوگا۔ جوزف نے گہری سانس لی۔

''بہرحال مَیں تم سے پھر یہی کہوں گا کہ ان لوگوں سے نہ اُلجھنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ سر اور پتھر کی لڑائی میں زخمی ہمیشہ سر ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی عظمت اور برتری کا جنون ہے، جسے ان کے دماغوں سے نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔''

ہمارے سامنے نہر میں بنتے دائروں میں یک دم تیزی سی آگئی۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ مرغابیوں کی ایک ڈار نے تیز بارش سے گھبرا کر لمبی سی اڈار بھری۔ ساکت فضا میں پروں کے پھڑپھڑانے کا شور گونجا۔ جوزف نے اپنی تصویر اور دیگر سامان جمع کرنا شروع کر دیا۔ مَیں بھی اس کی مدد کرتا رہا۔ لیکن میرا ذہن اَب بھی جوزف کی باتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ شاید جوزف بھی میری بے خیالی بھانپ گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو۔''

''سوچ رہا ہوں کہ کہیں نہ کہیں یہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ اصل میں وہ خود عظیم نہیں ہیں، عظیم کوئی اور لوگ ہیں۔ اور اصل میں ان کا یہ خوف اسی وجہ سے ہے کہ کہیں وہ دوسری نسل اپنی عظمت کو دوبارہ پہچان نہ لے۔ اسی لیے وہ ان کو اور کسی دوسری نسل کو بھی سنبھلنے نہیں دے رہے۔ کہتے ہیں کہ جھوٹ کو اگر روزانہ ایک ہی تسلسل اور روانی سے بولا جائے تو ایک وقت آتا ہے کہ جھوٹ جھوٹ نہیں رہتا۔ سچ بن جاتا ہے اور لوگ سچ کو جھوٹ سمجھنے لگتے ہیں۔ شاید یہ یہودی بھی اسی کلیے پر عمل کر رہے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ ان کا جھوٹ دُنیا پر سچ بن کر ظاہر ہو رہا ہے۔ اور ہمارا سچ بھی اَب لوگوں کو جھوٹ لگتا ہے۔ یہ دنیا زور آوروں کی ہے۔ زور آور جو کہے گا، وہی سچ ہوگا۔ اور اس وقت یہودی ہی وہ زور آور ہیں۔'' جوزف بھی میری بات سُن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

OO

محبتِ ناتمام

شاکر سے اپنا رشتہ ایمان کے گھر لے جانے کی بات کرنے کے بعد اس دن شام کو مَیں واپس گھر پہنچا تو کمشنر صاحب کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ مَیں لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جا ہی رہا تھا کہ ان کی گرجتی آواز نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔

''ٹھہرو۔''

مَیں رک گیا۔ امی اور سجاد بھائی بھی عبرینہ بھابھی سمیت اپنے کمرے سے نکل آئے۔ بابا آج ایک مکمل کمشنر صاحب کے روپ میں موجود تھے اور میں ان کے سامنے کسی بستہ ''ب'' کے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تو تم لندن نہیں جاؤ گے۔''

''میں لندن جانے کے لیے تیار ہوں، اگر آپ لوگ اس گھر میں مولوی علیم کے ساتھ کی گئی بدتمیزی کا ازالہ کر دیں۔''

کمشنر صاحب دھاڑے۔

''واٹ۔۔۔۔؟۔۔۔۔تو کیا اب تم چاہتے ہو کہ ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا جس کے نام کی گونج ایوانِ صدر تک ہے وہ اب ایک معمولی مولوی کے سامنے معذرتیں پیش کرتا پھرے گا۔ جسٹ فارگٹ اِٹ Just forget It۔''

''تو پھر آپ سب بھی یہ بھول جائیں کہ مَیں آپ لوگوں کی کسی ہدایت پر عمل کروں گا۔''

مَیں نے سیڑھیاں چڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

کمشنر صاحب پھر دھاڑے۔

''تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ تم جس چھت تلے رہتے ہو وہاں صرف میری ہدایات اور

میرا حکم ہی چلتا ہے۔''

گویا مجھے بالواسطہ یہ دھمکی دی جا رہی تھی کہ اگر میں نے کمشنر صاحب کے احکامات کی تعمیل نہیں کی تو مجھے گھر بدر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ کمشنر صاحب اپنی کمشنری کے دور میں بھی تو یونہی مجرموں کو شہر بدر اور قصبہ بدر کرتے رہے ہوں گے۔ اور پھر میرا تو جرم بھی بہت بڑا تھا 'جُرمِ عشق' ۔۔۔۔ اور اس جرم کی معافی تو کسی بھی دور میں روا نہیں رکھی گئی۔ آج میں بھی اپنے گھر والوں کی اس خودساختہ عدالت میں محبت کا مجرم بنا کھڑا تھا۔

مَیں کمشنر صاحب کی طرف پلٹا۔

''تو کیا مَیں یہ سمجھوں کہ مجھے اس گھر میں مزید رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

امی گھبرا گئیں۔ شائید انہیں بات کچھ بگڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''نہیں بیٹا۔۔۔ ہم بھلا ایسا کیوں چاہیں گے۔۔۔۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ذہن اور دل سے اُس لڑکی کا خیال نکال دو۔''

''مَیں اُسے اپنے ذہن اور دل سے نکالنے سے زیادہ آسان اس گھر سے نکلنے کو سمجھتا ہوں۔۔۔۔''

مَیں نے واپس جانے کے لیے قدم باہر کی طرف بڑھائے۔ امی چلائیں۔

''حماد۔۔۔ یہ کیا حماقت ہے؟''

کمشنر صاحب گرجے، ان کے لہجے میں طنز اور حقارت کا ایک طوفان چھپا تھا۔

''جانے دو اسے۔۔۔۔ دو دن میں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اسے باہر کی دھوپ ابھی تک لگی نہیں ہے۔ نوکروں کی فوج کی خدمتوں تلے ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی گزارنے والے اور منرل واٹر پینے والے اس شہزادے نے ابھی تک گھر سے باہر کی سختیوں کی اک جھلک بھی نہیں دیکھی۔۔۔۔ ایک رات باہر رہے گا تو عشق کا سارا بھوت سر سے اُتر جائے گا۔ اسے تو ٹھیک سے پیدل چلنا بھی نہیں آتا، کہو میاں جہاں جانا چاہتے ہو وہاں تک چلے جاؤ گے یا ڈرائیور سے کہوں کہ تمھیں وہاں تک چھوڑ آئے۔''

میں کمشنر صاحب کی طرف پلٹا۔

''بچے کو پیدل چلنا اس کے ماں باپ سکھاتے ہیں۔ افسوس آپ دونوں نے مجھے واقعی پیدل چلنا نہیں سکھایا۔ لیکن وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ وہ بھی جو انسان کے ماں باپ اسے سکھانا بھول جاتے ہیں۔ میں بھی نوکروں، ائیر کنڈیشنڈ کمروں اور منرل واٹر کے بنا جینا سیکھ ہی جاؤں گا۔ اور اگر نہ بھی سیکھ پایا تو آپ اطمینان رکھیے۔ آپ سے مدد مانگنے پھر بھی نہیں آؤں گا۔''

امی چلاتیں رہ گئیں، سجاد بھائی ٹپٹا کے رہ گئے۔ بابا تلملا کر اپنے پائپ کا دھواں اُگلتے رہے اور میں اس گھر سے نکل آیا۔

میرے سامنے شہر کے کھلے راستے تھے اور سر پر دھوپ اگلتا آسمان، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف کی راہ لوں۔ بابا نے سچ کہا تھا، میں کبھی پیدل گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میں نے اس شہر کا ہر راستہ اپنے نئے ماڈل کی گاڑی کی ونڈ سکرین سے ہی دیکھا تھا۔ آج زمین پر ان راستوں پر چلتے ہوئے ان کی طوالت اور اصل منظر کا احساس ہو رہا تھا۔

کہتے ہیں ہر انسان دنیا کو بدلنے کی باتیں تو کرتا ہے۔ لیکن خود کو بدلنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ آج سے میں نے خود کو بدلنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ بہت دیر تک میں ایک پارک کے بینچ پر بیٹھا ان بدلے ہوئے حالات پر غور کرتا رہا۔ میری جیب میں دو چار سو روپے ہی موجود تھے۔ اپنا اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ اور کریڈٹ کارڈ میں وہیں لاؤنج میں گھر سے نکلنے سے پہلے گھر والوں کے سامنے پھینک آیا تھا۔ جانے یہ پیسے کیسے رہ گئے تھے جیب میں۔ شام دھیرے دھیرے پارک میں اُترتی جا رہی تھی۔ لوگ جو آس پاس چہل قدمی یا ستا رہے تھے دھیرے دھیرے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونا شروع ہو چکے تھے اور کچھ ہی دیر میں وہ پارک خالی ہو گیا۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ پارک کے چوکیدار نے مجھے آ کر پارک بند ہونے کی اطلاع دی۔ ظاہر ہے اس کے کہنے کا مقصد یہی تھا کہ صاحب پارک بند ہو چکا ہے۔ اب آپ بھی اپنے گھر جائیے۔۔۔۔ لیکن میرا تو آج کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ میں کس کے گھر جاؤں۔۔۔۔؟ بچپن سے لے کر آج تک میں جسے اپنا گھر سمجھتا رہا وہ تو کمشنر صاحب کی عدالت نکلا۔ بات مانو تو رہو۔۔۔۔ نہ مانو تو نکل جاؤ۔ ایسے ماں باپ ہم بچوں سے سالانہ ایک کنٹریکٹ فارم کیوں نہیں بھروالیا کرتے۔۔۔؟ جس میں تمام شرائط درج

ہوں اور ہر سال بچوں کو پڑھ کر سنائی جائیں۔ تاکہ ہم کبھی اس چاردیواری کو کبھی اپنا ذاتی گھر سمجھنے کی غلطی نہ کریں۔

رات کا اندھیرا اب سڑکوں پر اُتر آیا تھا اور سڑک کے کنارے کھڑے ٹھیلوں پر لگے گیس کے بھاری روشن دان اب جلنے لگ پڑے تھے۔ چلتے چلتے میری نظر گورنمنٹ سول ہسپتال کے گیٹ پر پڑی۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب میرے تایا یہاں سول سرجن ہوا کرتے تھے تب میں اور کامران اسکول سے واپسی پر یہاں سے ضرور گزرتے تھے۔ ہمارا اسکول اسی ہسپتال سے آگے جاتی سیدھی سڑک پر واقع چوک کے بعد آتا تھا۔ ہم دونوں تایا کے دفتر بھی جاتے اور گھنٹوں اس ہسپتال کی لمبی راہداریوں میں دھماچوکڑی مچاتے رہتے۔ ہسپتال کی صنوبر بھرے درختوں سے ڈھکی سڑکوں پر کھیلتے رہتے تھے، مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ہسپتال کے لمبے لمبے ایور گرین کے درختوں تلے لکڑی کے لمبے لمبے بینچ پڑے ہوئے تھے۔ جن پر مریضوں کے وہ لواحقین پڑے آرام کرتے رہتے تھے جو دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے ہوتے تھے اور شہر میں کوئی ہوٹل یا کسی کمرے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میری آج کی رات بھی ایک ایسے ہی لکڑی کے بینچ پر گزرنے والی تھی۔ اس وقت مجھے ان چند روپوں کا دھیان بھی نہیں رہا تھا جو اس وقت میری شرٹ کے جیب میں پڑے ہوئے تھے۔

میں ایک خالی بینچ دیکھ کر اسی پر جا کر لیٹ گیا۔ بہت دنوں کے بعد سر پر کھلے آسمان اور تاروں کو یوں اپنے آپ سے باتیں کرتا محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جب ہم نانی کے گھر گرمیوں کی رات کو ان کے کھلے صحن میں چارپائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے تو تب بھی کہانی سناتی نانی جان کی آواز صرف ہم تک نہیں بلکہ ہمیں دیکھ کر ان مسکاتے تاروں تک بھی جاتی تھی۔ تبھی تو ہمارے صحن میں چارپائیاں ڈال کر ان پر پڑتے ہی یہ ہمارے تارے بھی ہماری چارپائیوں کے اوپر نانی کے گرد سمٹ آتے اور پھر جب تک ہم کہانی سن کر سو نہیں جاتے۔ یہ تارے بھی ہمارے ساتھ جاگتے رہتے، ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے رہتے۔

بچپن کی طرح آج بھی یہ سارے تارے میری آج رات کی تنہائی کے ساتھی تھے۔ میں ان تاروں سے کچھ شرمندگی سی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے انہیں اتنا عرصہ بھلائے رکھا تھا

لیکن آج جیسے ہی تنہا ہو کر میں نے بھیگی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا تو میرے یہ سبھی پُرانے دوست بنا کسی شکوے اور شکایت کے پھر سے ماضی کی طرح میرے سر پر آن جمع ہوئے تھے، میرا درد بانٹنے کے لیے۔۔۔۔ بچپن میں ہر بچہ اپنی پسند کا ایک تارہ منتخب کر لیتا ہے۔ وہ کامران والا تارہ تھا، یہ نگی کا تارہ، یہ دو عباد نے اپنے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ اور یہ رہا میرا تارہ۔ سب سے چمک دار مجھے بچپن سے ہی سب سے الگ اور سب سے نمایاں چیزیں چننے کی عادت تھی۔ وہ بھی تو ایسی ہی تھی۔ سب میں نمایاں، سب سے الگ، اگر میرے دل نے اس کی خواہش کی تھی تو اس میں ایسا کیا بُرا تھا۔ یہ سارا زمانہ میرا دشمن کیوں ہو گیا تھا۔۔۔۔؟ یہ زمانہ ہمیشہ ہی سے محبت کرنے والوں کے خلاف کیوں ہو جاتا ہے؟ ایسے ہی کچھ بے نام سے سوالوں کی یلغار میں ساری رات بیت گئی۔ میں تب چونکا جب میرے دوست ستاروں نے ایک ایک کر کے مجھ سے وداع لینا شروع کر دی اور صنوبر چیڑ اور چیری کے درختوں پر پرندوں کے گھونسلوں سے ان کے ننھے منھے بچوں کی چیخ و پکار بلند ہونا شروع ہو گئی۔ شاید پرندوں کے گھونسلے بھی ہمارے گھروں کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ پہلے بڑے جاگ کر بچوں کے لیے ناشتے پانی کا بندوبست کرتے ہیں پھر چھوٹوں کا جگایا جاتا ہے۔

ہسپتال کی چھوٹی سی مسجد سے اذان کی آواز اُبھری اور پھر نمازی ایک ایک کر کے مسجد کی طرف چل پڑے۔ میں کچھ دیر حیرت سے ان نمازیوں کو دیکھتا رہا جو یوں صبح سویرے، منہ اندھیرے اپنی نیند ترک کر کے، آنکھیں ملتے ایک جذبے کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ تھے۔ میں آج تک کبھی یوں صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھنے کسی مسجد میں نہیں گیا تھا۔ جانے یہ کیسے لوگ تھے اور وہ کون سا جذبہ تھا جو انہیں یوں مسجد کی جانب کھینچے لے جا رہا تھا؟

میری ساری رات آنکھوں آنکھوں میں ہی کٹ گئی تھی اور اس وقت سورج کی کرنیں اونچے، لمبے پیڑوں کی شاخوں سے چھن چھن کر زمین تک پہنچ چکی تھیں۔ زندگی کا کاروبار رواں دواں ہو چکا تھا۔ شاید کسی بڑے ڈاکٹر کے دورے کا وقت تھا۔ ہسپتال کے سفید وردی میں ملبوس عملے نے جلدی جلدی ہم سب بینچ کے مکینوں کو وہاں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ میرا اب ویسے بھی یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے شاکر کے گھر جانا تھا۔ شاید وہ کل مولوی صاحب کی طرف گیا ہو؟ شاید اس کے پاس کوئی نئی خبر ہو؟ میں نے جیب میں غیر

ارادی طور پر ہاتھ ڈالے تو نوٹوں کی کڑکڑاہٹ محسوس ہوئی۔ ہاتھ نکال کر دیکھا تو سوسو کے وہی چند نوٹ جو گھر سے چلتے وقت میری جیب میں رہ گئے تھے باہر نکل آئے۔ میں نے ہسپتال کے گیٹ کے قریب کھڑے تانگے والے کو اشارہ کیا اور تانگے میں بیٹھ کر پُرانی حویلی کی طرف چلنے کا کہا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے انسان کو آس پاس کے تمام منظر یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے کوئی فلم الٹی چل رہی ہو۔

شاکر جو اس وقت حویلی کے گیٹ سے نکل ہی رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی جیسے اپنے حواس کھو بیٹھا، اور میری طرف دوڑا چلا آیا۔ کچھ دیر تک تو وہ مجھے یوں ٹٹول ٹٹول کر دیکھتا رہا جیسے مَیں کسی اور جہاں کی مخلوق ہوں۔

''حماد بابا۔۔۔۔آپ کدھر چلے گئے تھے۔ رات کہاں گزاری ہے آپ نے، یہ کیا حالت بنالی ہے اپنی۔''

شاکر مجھے لے کر اپنے ہی کوارٹر میں چلا آیا، کیونکہ میں نے حویلی کے ڈرائنگ روم کی طرف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ شاکر نے جلدی سے اپنے کوارٹر کی بیٹھک کا دروازہ کھولا جو باہر حویلی کے پچھواڑے والے باغ میں کھلتا تھا۔ میں آنکھیں موندھے وہیں صوفے پر بیٹھا رہا جب تک شاکر اندر سے جلدی سے ناشتے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ نگہت نے جلدی جلدی چند پراٹھے، تلے ہوئے اور اُبلے ہوئے انڈوں کا خاگینہ اور چائے بنادی تھی لیکن میرا دل اس وقت کسی چیز کو ہاتھ لگانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ شاکر نے بے حد اصرار کر کے چند گھونٹ چائے کے میرے حلق سے نیچے اُتروائے۔ مجھے شاکر سے مولوی صاحب کے گھر کے حالات جاننے کی جلدی تھی۔ لیکن شاکر نے پہلے میرے گھر کا احوال دیا۔ اُس نے بتایا کہ وہ اس وقت مولوی صاحب کی طرف گیا ہوا تھا جب میں نے گھر چھوڑا تھا۔ شاکر جب ہمارے گھر پہنچا تو نوکروں نے گھر میں ہونے والے ہنگامے کا اس سے ذکر کیا۔ شاکر کے مطابق امی کچھ پریشان تھیں جب کہ بابا اور سجاد بھائی کو یہ اطمینان تھا کہ مَیں در بدر کی ٹھوکریں کھا کر رات بھر میں ہی واپس آ جاؤں گا۔ البتہ چھوٹا عباد رات بھر مجھے میرے دوستوں کے گھروں میں تلاش کرتا رہا تھا۔

مَیں نے شاکر کو یہ نہیں بتایا کہ مَیں نے رات کہاں گزاری تھی۔ اس کے تمام سوالوں

کے جواب میں مَیں نے صرف ایک سوال کیا۔

''تم مولوی صاحب کے گھر گئے تھے۔۔۔۔؟ وہاں کی کیا خبر ہے۔'' شاکر میرا سوال سن کر خاموش سا ہو گیا۔

''ہاں گیا تھا، مولوی صاحب تو اُسی دن سے بستر پر پڑے ہیں جس دن سے وہ آپ کے گھر سے واپس آئے تھے۔ پورے گھر پر سوگ جیسی کیفیت طاری ہے۔ ایسے میں مجھے ان سے کوئی دوسری بات کرنا اچھا نہیں لگا۔ بس ان کی عیادت کر کے واپس چلا آیا۔ انہیں اس صدمے نے بالکل نڈھال کر دیا ہے۔ شریف آدمی کی زندگی بھر کا اثاثہ صرف اس کی غیرت ہوتی ہے بابا۔۔۔۔ اگر کوئی اس پر ہی وار کر دے تو پھر وہ صرف ایک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔''

مَیں جانتا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر اس وقت کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔ شاکر نے اچھا ہی کیا کہ وہ بنا کچھ بات کیے وہاں سے واپس چلا آیا۔ اَب میرے وہاں مزید بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس لیے مَیں بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاکر نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''کدھر کا ارادہ ہے حماد بابا۔۔۔۔ میں اب آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔''

''میری اب کوئی منزل نہیں ہے۔ جس طرف قدم اٹھیں گے چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنے آپ کو پہچاننے کا ایک موقع ملا ہے۔ مجھے روک کر اُسے ضائع نہ کرو۔ ورنہ میں ساری زندگی ابا تو کیا خود اپنے سامنے بھی نظریں نہیں اٹھا سکوں گا۔''

شاکر میری طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا کہ مَیں جو بات ایک مرتبہ دل میں ٹھان لوں۔۔۔۔ پھر اس سے پلٹنا میرے لیے ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ جانتا تھا کہ میری ساری زندگی پھولوں کی سیج پر گزری ہے۔ یہ کانٹے مجھے بہت جلد لہولہان کر دیں گے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مَیں نہیں رکوں گا اور یہ در بدری ہی اب میرا مقدر ہے۔ شاکر میرے ساتھ حویلی کی آخری حد تک آیا گھر سے نکلتے ہوئے نگہت پر میری نظر پڑی جو اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرتی دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ مَیں نے کچھ آگے جا کر زبردستی شاکر کو گھر واپس بھیج دیا۔ اُسے اپنی ڈیوٹی پر بھی پہنچنا تھا۔ کمشنر صاحب کا پارہ

ویسے ہی رات سے بہت چڑھا ہوا تھا۔ اور مَیں جانتا تھا کہ آج حویلی کے نوکروں کی شامت آئی ہوگی۔ شاکر روتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

سڑک پر کچھ دُور چلنے کے بعد مجھے پھر ایک تانگا مل گیا۔ مَیں نے تانگے والے کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ کامران کے ایک دُور کے رشتے دار ریلوے میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ شاید جاوید صدیقی نام تھا۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے لیکن مَیں نے کامران سے ان کا بارہا ذکر سنا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اب تو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر ہی تعینات ہوں؟۔۔۔۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اور پھر مولوی علیم صاحب کا ایک جملہ میرے کانوں میں جیسے اٹک کر ہی رہ گیا تھا۔

اس دن جب میں ان سے گیٹ پر معافی مانگ رہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کی زیادتی کی جو سزا چاہیں مجھے دے دیں۔ تو اس دن شاید انجانے میں ہی سہی، لیکن ان کے منہ سے ایک بہت بڑا سچ نکل گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔

''تمھاری اپنی شناخت ہی کیا ہے؟۔۔۔۔ معافی مانگنے اور معاف کیے جانے کا حق صرف انہیں ہوتا ہے جو خود اپنی کوئی شناخت رکھتے ہیں۔ تم تو خود ان کے محتاج ہو جنھوں نے آج میری سفید پوشی پر اور میری معصوم بچیوں پر کیچڑ اچھالا ہے۔''

جاتے جاتے وہ یہ کیسا طمانچہ مار گئے تھے میرے منہ پر۔ واقعی سچ ہی تو تھا۔ مَیں تو خود ان لوگوں کے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔ مَیں بھلا کس بل بوتے پر اُن سب کی طرف سے معافی مانگ رہا تھا۔ گویا اتنی زندگی میں نے بنا کسی شناخت کے ہی کاٹ دی تھی۔ صرف کمشنر امجد رضا کا بیٹا بن کر۔ میری معاشرے میں جو عزت تھی، وقار تھا وہ سب کسی اور کی دین تھا؟ لیکن اب میں نے خود اپنی شناخت بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مَیں اب مولوی علیم کا سامنا تب ہی کرنا چاہتا تھا جب میرے پاس حماد رضا کے پاس اپنی کوئی شناخت ہوتی۔

اسٹیشن پر پہنچ کر مَیں نے جاوید صدیقی صاحب کا پوچھا۔ خوش قسمتی سے وہ ابھی تک یہیں تعینات تھے۔ مَیں اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر کھڑا ان کے چپڑاسی کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا جو اندر میرے نام کی چٹ لے کر گیا تھا۔ کچھ دیر میں مجھے اندر بلوا لیا گیا۔ جاوید صدیقی صاحب پچاس کے پیٹے میں ایک بھرے بدن اور درمیانی قد کے معزز سے

ص تھے۔ سفید بالوں کو ایک طرف سے مانگ نکال کر سلیقے سے جما رکھا تھا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ اور کان پر ایک بال پوائنٹ۔ انہوں نے فائلوں پر نظریں دوڑاتے ہوئے مجھے دیکھا اور پھر سے فائل کا ورق پلٹتے ہوئے بولے۔

''ہاں تو حماد میاں۔۔۔۔ تم کامران کے دوست ہو۔۔۔۔ بتاؤ مَیں کیا کر سکتا ہوں تمھارے لیے۔''

''جی سر۔۔۔۔ مَیں بے روزگار ہوں۔۔۔۔ اگر کچھ کام مل جاتا تو۔۔۔۔ چاہے عارضی ہی سہی۔۔۔۔''

صدیقی صاحب نے چونک کر سر اٹھایا اور اس مرتبہ غور سے مجھے دیکھا۔

''اوہ۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔۔۔۔ میں تو سمجھا تھا کہ کوئی سیٹ ریزرویشن وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ لیکن میاں۔۔۔۔ شکل سے تو تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔۔۔۔ بھلا تمھارے لائق یہاں کیا کام ہوسکتا ہے۔ کتنا پڑھے ہو۔''

کبھی کبھی انسان کی اعلیٰ تعلیم بھی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ لوگ آپ سے ہمدردی تو رکھتے ہیں لیکن آپ کو کوئی کام دیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ مَیں پہلے ہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ میں اپنی تعلیم اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔

''جی بس گزارہ کر لیتا ہوں۔ آپ مجھے کسی بھی کام پر رکھ سکتے ہیں، میں بہت اُمید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

صدیقی صاحب نے ایک بار پھر مجھے غور سے دیکھا جیسے پڑھائی والی بات پر انہیں یقین نہ آیا ہو۔ لیکن وہ جہاں دیدہ آدمی تھے انہوں نے اس بات پر دوبارہ کوئی بحث نہیں کی۔

''سامان اٹھا لوگے۔''

''جی ضرور۔''

انہوں نے میز پر پڑی ہاتھ سے بجنے والی پُرانی سی گھنٹی پر ہتھیلی ماری۔ ٹنک کی آواز کے ساتھ ہی چپڑاسی کسی حکم کے غلام جن کی طرح نمودار ہوگیا۔ صدیقی صاحب نے اسے حکم دیا۔

''غفورے کو بلاؤ۔''

چپڑاسی سر ہلا کر باہر چلا گیا۔ اور چند لمحوں میں ہی ایک مضبوط بدن والے پکی عمر کے شخص کے ساتھ واپس آ گیا۔ جو قلیوں کے لباس میں ملبوس تھا۔ کاندھے پر رسی، سُرخ قمیض اور ہاتھ پر لوہے کا بلاّ (بیج)۔۔۔ اس نے کمرے میں گھسنے سے پہلے بیڑی بجھا دی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ صدیقی صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔ غفورا اندر آ کر سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔

صدیقی صاحب نے پھر سر اٹھایا۔

''ہاں بھئی غفورے۔۔۔ تمھاری نفری پوری ہوئی یا نہیں۔''

''کدھر صاحب جی۔۔۔ وہ سلّو کا بیٹا جسے پچھلے مہینے نمونیا ہو گیا تھا۔ اس نے ابھی تک ڈیوٹی پر رپورٹ نہیں کی ہے۔ دو ایک اور بھی ہیں حرام خور، جو مفت کی چھٹیاں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے کاغذ بنا لیا ہے، کل آپ کو کمپلینٹ مل جائے گی۔''

معلوم ہوا کہ غفورا اسٹیشن پر موجود ڈرائی پورٹ کا لیبر انچارج تھا۔ صدیقی صاحب نے مجھے اسی کے ساتھ عارضی طور پر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ مستقل قُلی بننے کے لیے محکمے سے باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا تھا اور یہ لمبا کام تھا۔ البتہ یہ صدیقی صاحب کے اختیار میں تھا کہ وہ روز کی اُجرت پر عارضی طور پر رکھے جانے والے مزدوروں یا قلیوں میں میرا نام ڈلوا دیتے۔

''غفورے۔۔۔ یہ حماد ہے۔۔۔ آج سے یہ نوجوان تمھارے انڈر کام کرے گا۔ فی الحال عارضی ہے۔ کام دیکھ کر فیصلہ کریں گے کہ پکا پرمٹ جاری کریں یا نہیں۔''

غفورے نے حیرت سے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا۔ جانے میرے چہرے پر ایسی کون سی تحریر تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مجھے مزدور تسلیم کرنے پر ذہنی طور پر رضامند ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ پہلے صدیقی صاحب اور اب یہ غفورا۔ شاید عمر بھر کی خوش حالی از خود ہمارے چہرے پر ایک خاص تحریر اور ایک خاص چمک پیدا کر دیتی ہے۔ لگتا تھا یہ تحریر مٹتے مٹتے مٹے گی اور یہ چمک جاتے جاتے جائے گی۔

صدیقی صاحب نے جاتے جاتے مجھ سے کہا کہ کسی بھی وقت کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو میں ان کے پاس آ سکتا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے پاس رہنے کا فی الحال کوئی

ٹھکانہ نہیں ہے اور میں اکیلا ہوں۔ صدیقی صاحب نے غفورے سے کہا کہ وہ تھرڈ کلاس والے ویٹنگ روم کے چپڑاسیوں کو میرے بارے میں بتا دے کہ میں رات وہیں بسر کیا کروں گا فی الحال۔ ویسے تو اس وقت گرمیوں کا موسم تھا اور رات پلیٹ فارم پر بھی گزاری جا سکتی تھی۔ غفورے نے سب سے پہلے میری وردی گودام سے نکلوا کر میرے حوالے کر دی۔ مجھے میری نئی شناخت کا پہلا نمبر بھی الاٹ کر دیا گیا۔ میری پہلی شناخت، حماد۔۔۔ مزدور نمبر 137۔ بلکہ یہاں تو مزدوروں کو ان کے نام سے نہیں بلکہ ان کے نمبروں سے ہی پکارا جاتا تھا۔ میں بھی اب حماد نہ تھا۔ صرف ایک نمبر تھا۔ مزدور نمبر 137۔۔۔۔ بلکہ یہ تو اچھا ہی تھا۔ میرا نام بھی ان مزدوروں کے ناموں میں کسی بھی طرح نہیں سجتا تھا۔ اگر شناختی کارڈ کی نقل ریکارڈ میں جمع کروانے کی شرط نہ ہوتی تو شاید میں اپنا نام بھی بدل ہی لیتا۔

ہر ریلوے اسٹیشن کی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہوتی ہے۔ الگ ہی صبح شام ہوتے ہیں۔ میں آج تک ہوائی جہاز سے ہی سفر کرتا چلا آیا تھا۔ میرا ٹرین کے سفر کا تجربہ صرف لندن اور یورپ کی ٹرینوں کا تھا۔ اپنے ملک میں تو میں نے کبھی ٹھیک سے کوئی ریلوے اسٹیشن بھی نہیں دیکھا تھا۔ اور تقدیر کا یہ کیسا پھیر تھا کہ میں آج اپنے ہی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر مزدور بنا کھڑا تھا۔

ڈرائی پورٹ کے قُلیوں کو عام قُلیوں کی طرح مسافر ٹرینوں سے زیادہ واسطہ نہ تھا۔ انہیں زیادہ تر مال گاڑی سے مال اُتارنا ہوتا تھا۔ اس دن بھی کچھ دیر پہلے ہی پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی آ کر لگی تھی۔ غفورے نے تمام جزئیات طے ہو جانے کے بعد میری کمر تھپکی۔

''چل بھئی جوان۔۔۔ لگ جا اپنی مزدوری پر۔ رب بھلی کرے گا۔ میں بھی دیگر مزدوروں کے ایک گروہ کے ساتھ سامان ڈھونے پر لگ گیا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بوجھ کسے کہتے ہیں، اور صحیح معنوں میں بوجھ اُٹھانے والے کا جسم کس طرح چٹختا ہے۔ میں دو پھیروں میں ہی ہلکان ہو گیا۔ غفورا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے قریب بلایا اور ہنس کر کہنے لگا۔

''کیوں بھئی جوان۔۔۔ لگتا ہے زندگی میں پہلے کبھی بوجھ نہیں اُٹھایا۔''

''نہیں مجھے عادت نہیں ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔۔۔ میں اپنے حصے کا کام پورا کروں

گا۔" غفورے نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور میری ہتھیلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اویار غفورے کی نظر کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ یہ تو قلم کاغذ پکڑنے والے ہاتھ ہیں۔ یہ تُو کہاں آ گیا ہے اپنی جوانی جلانے کے لیے میری جان۔ جا چلا جا، یہاں سے۔ ورنہ ہماری طرح ایک دن تیری زندگی بھی یہ بوجھ ڈھوتے ڈھوتے گل سڑ جائے گی۔ اپنی اس خوبصورت جوانی پر رحم کھا۔"

مَیں نے مسکرا کر غفورے سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور پھر سے کام پر لگ گیا۔ اُس بے چارے کو کیا پتہ تھا کہ جوانی تو اس زہرہ جبیں کی پہلی جھلک کی چنگاری سے ہی جل کر خاک ہو چکی تھی۔ اب تو صرف سینے سے اس آگ کی نشانی کے طور پر ہلکا سا دھواں اُٹھتا باقی تھا۔ جس دن راکھ پوری طرح بجھ گئی اُس دن سینے سے یہ اُٹھتا دھواں بھی ختم ہو جائے گا۔

OO

نیند

اُس رات کلاس میں بلیک بورڈ پر نعرے لکھنے والے واقعے کے بعد مَیں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے نیند کو آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی کیوں متصل کر دیا گیا ہے۔ انسان آنکھیں بند کر کے بھی تو ساری عمر جاگ سکتا ہے۔ مَیں تو ایسے کئی لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو کھلی آنکھوں سے تمام عمر نیند میں ہی ڈوبے رہے ہیں۔ شاید ہم جسے نیند سمجھتے ہیں وہ اصل میں نیند ہے ہی نہیں۔ نیند کا تعلق تو سکون سے ہوتا ہے۔ پلکیں بند کر لینے سے نہیں۔ مَیں بھی جانے کتنی صدیوں سے صرف پلکیں ہی بند کر پا رہا تھا۔ نیند تو جانے کب سے مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔

اگلے دن صبح کامران نے مجھے یونیورسٹی ڈراپ کیا۔ اتفاق سے پارکنگ میں رُکتے وقت سارہ بھی اپنی سفید بیٹل کار میں سے اُترتی دکھائی دی۔ کامران کی ساری توجہ اسی کی طرف تھی۔ نیلے اسکرٹ میں اور اوپر بند گلے کی سفید سویٹر میں واقعی اس کا حُسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ کامران کے منہ سے سیٹی سی نکلی۔

"یار میڈی۔۔۔ تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمھاری یونیورسٹی میں ایسی ایسی حوریں بھی پڑھنے آتی ہیں۔ تمھارا اگلا سمیسٹر کب سے شروع ہو رہا ہے یار مجھے آج اپنی جاہلیت کا حد درجے احساس ہو رہا ہے۔"

"زیادہ آہیں بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بقول تمھارے یہ وہی یہودن ہے جو میری جان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس پر لٹو ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔"

کامران نے ڈھٹائی کی انتہا کر دی اور سارہ کو ایک مشہور ہالی وڈ ایکٹریس سے ملا دیا۔ یہ اس کی پُرانی عادت تھی۔ وہ لوگوں کو ان کے چہرے کی مماثلت سے مشہور اداکاروں

سے ملاتا اور پھر اسی نام سے انہیں پکارتا تھا، اُس نے پھر ٹھنڈی آہ بھری۔

''کوئی بات نہیں یار۔ یہودی بھی تو اہل کتاب ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے تو یہ بالکل سلمیٰ ہائیک لگتی ہے یار۔ اتنی خوبصورت لڑکی سے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں اپنی پچھلی تجویز واپس لیتا ہوں۔ اور تمھیں فوراً اس سے دوستی کرنے کا نیا مشورہ دیتا ہوں۔''

میں نے بمشکل کامران کو زبردستی وہاں سے واپس بھیجا۔ سارہ بھی گاڑی سے اُترتے ہی کسی طالب علم کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئی تھی۔ کامران نے حتی الامکان گاڑی اس کے بہت قریب سے گزاری جس کا سارہ نے کچھ خاص نوٹس نہیں لیا۔ میں اپنا بیگ سنبھالے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ سارہ نے مجھے آواز دی۔

''مسٹر حماد۔۔۔ ایک منٹ پلیز۔۔۔''

میرے بڑھتے قدم رُک گئے۔ سارہ جلدی سے اپنے ہوا میں لہراتے کھلے بالوں کو سنبھالتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ ''ربیکا نے مجھے تمھارا پیغام دے دیا تھا۔ میں نے آج تک زندگی میں کبھی کسی کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن کبھی اپنے اوپر کسی دوسرے کے کیے ہوئے کا الزام بھی برداشت نہیں کیا۔ مَیں نے کلاس روم کے بلیک بورڈ پر وہ سب کچھ نہیں لکھا تھا۔ اور مجھے لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ مَیں اپنے خیالات کا برملا اظہار کرتی ہوں اور اس کی ہمت بھی رکھتی ہوں۔''

''تو پھر مَیں اس وضاحت کو کیا سمجھوں۔ کیا تم اپنے دوستوں کی طرف سے بھی وکالت پیش کر رہی ہو، ظاہر ہے یہ ان میں سے ہی کسی ایک کی حرکت ہے۔''

''نہیں میں ان میں سے بھی کسی کی وکالت پیش نہیں کر رہی ہوں، کیونکہ سچ کو وکالت کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''سچ کو دلیل کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔ اور جن کے پاس دلیل نہیں ہوتی وہی ایسی بچگانہ حرکتیں کر کے اپنا غصہ اپنی فرسٹریشن نکالتے ہیں۔''

سارہ نے ایک گہری نگاہ میرے اوپر ڈالی اور سرد سے لہجے میں بولی۔ ''دوسروں کا تو مجھے نہیں پتہ لیکن میرے پاس ہزاروں دلائل موجود ہیں۔ لیکن میں نے کہا نا، سچ کو ثابت کرنے کے لیے میں ان دلائل کو بیان کرنے میں اپنا اور تمھارا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔''

مَیں نے اُسے فیصلہ سنا دیا۔

''تو پھر طے رہا، ہم دونوں میں سے جس نے بھی دوسرے کو اپنے سچ سے قائل کر دیا، دوسرا اُسی کا راستہ اپنا لے گا، بولو منظور ہے۔''

سارہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور شاید اُسے میری آنکھوں میں چُھپا چیلنج بھی صاف نظر آ گیا۔

''منظور ہے، تمھیں ہرا کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوگی۔''

''اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ بیسٹ آف لک'' Best of Luck'' میں اور سارہ مخالف سمتوں میں مڑے اور اپنے اپنے راستوں پر چل دیے۔ دُور سے کوئی ہمیں دیکھتا تو اسے یوں لگتا کہ ہم ایک ہی کمان سے چھوٹے دو مختلف تیر ہیں جنھیں دو مختلف سمتوں میں ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا ہو۔

اس دن کلاس میں سارہ کے گینگ نے مجھ پر وقتاً فوقتاً فقرے بازی کرنے کی کوشش کی لیکن میں چپ رہا۔ ربیکا سارہ کی بہت اچھی دوست تھی لیکن جانے کیوں اس دن کے بعد سے اس نے میرے ساتھ ہی ڈیسک پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ کلاس میں پڑے ہر ڈیسک پر دو طالب علموں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس دن سے میں کلاس لے رہا تھا تب سے اب تک میں اکیلا ہی بیٹھتا تھا۔ ربیکا بظاہر ہر لحہ ہلہ گلہ کرنے والی، ہمیشہ جینز جیکٹ میں ملبوس رہنے اور چیونگم چبانے والی ایک شوخ و شنگ تتلی جیسی لڑکی تھی، جو چلتے وقت اپنے بوائے کٹ بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹکتی تو آس پاس کے نوجوانوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک آدھ دن جب وہ میرے ساتھ ڈیسک پر بیٹھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پڑھائی میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتی ہے جتنی دوسری شوخیوں اور لااُبالی پن میں۔

سارہ کا گینگ لیڈر بظاہر ایک یہودی لڑکا جم تھا، اُس کے علاوہ ٹینا بھی ان کے گروپ کی سرگرم رکن تھی۔ یوں سارہ ٹینا، جم اور ڈیوڈ پر مشتمل یہ چار کا ٹولا تھا جو در پردہ سارہ ہی کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔ پھر ایک دن بریک کے دوران جب جم نے اسٹوڈنٹس کو ہنسانے کے لیے کچھ رکاوٹوں بنائے اور چند مزاحیہ جملے لکھے تو مجھے اس کی لکھائی سے اندازہ بھی ہو گیا کہ اس دن بلیک بورڈ پر اسی کی تحریر تھی جو زہر اگل رہی تھی۔ بہر حال اس دن کے

بعد کم از کم بلیک بورڈ کی حد تک کسی نے دوبارہ وہ حرکت دہرانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن میں جانتا تھا، یہ لاوا اندر ہی اندر کہیں پک رہا ہے۔ تیسرے ہی دن یونیورسٹی میں شعبہ جات کے درمیان تقریری مقابلے کا اعلان ہوگیا۔ تقریر کے لیے نام طلب کیے گئے تو ربیکا نے شرارت میں میرا بازو بھی ہوا میں بلند کر دیا جب کہ میں اس وقت کچھ لکھنے میں مگن تھا، سارہ نے ربیکا کی اس حرکت پر اُسے کڑی نظروں سے گھورا، بہر حال میرا نام بھی اب مقرروں کی لسٹ میں شامل ہو چکا تھا۔

اس دن یونیورسٹی کا مرکزی ہال کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لندن کے میئر کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مجھ سے پہلے سارہ کی باری آئی۔ وہ بلیک کوٹ اور اسکارف میں بال باندھے کسی اسکول کی طالبہ لگ رہی تھی۔ سارہ نے جم کر تقریر کی اور یہودیوں کے ایک مفروضے ''ہالوکاسٹ'' (جس میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنوں نے پچاس لاکھ سے بھی زیادہ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا) کے بارے میں دلائل دیے۔ مَیں اُس وقت اس مفروضے کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہیں جانتا تھا۔ میں سارہ کی تقریر کے دوران یہی سوچتا رہا کہ بعد میں جوزف سے اس معاملے پر تفصیلی بات ضرور کروں گا۔ سارہ کے بعد میرا نام پکارا گیا۔ ہال میں سناٹا سا چھا گیا جس میں صرف ربیکا اور جوزف کی تالیوں کی گونج باقی رہی۔ میری تقریر کا موضوع بین المذہب مکالمہ ''Inter Religion Debate'' تھا۔

مَیں نے صدرِ محفل کا شکریہ ادا کر کے حاضرین کو مخاطب کیا جن میں سب سے اگلی قطار میں سر آئزک بیٹھے ہوئے تھے۔

معزز حاضرین ۔۔۔۔ مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ اس دور کی شائد سب سے بڑی ضرورت ہے ۔۔۔۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب، مذہبی تعصب کی اجازت نہیں دیتا ۔۔۔۔ ہاں یہ حقیقت ہے کہ کل جن کو عروج حاصل تھا۔ آج وہ اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے زوال کا شکار ہیں، مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ رہے ہیں، زمین ان پر تنگ کی جا رہی ہے۔ مذہب اور سائنس کے ٹکراؤ کی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔

کیا وجہ ہے کہ فزکس میں کوانٹم تھیوری کو تو حقیقت مان لیا جاتا ہے۔ لیکن روشنی کے اس

سفر کی سب سے بڑی شہادت ''واقعہ معراج'' کو جھٹلایا جاتا ہے ۔۔۔۔؟ ٹائم مشین اور مستقبل میں سفر کے قصے تو سب کی زبان پر ہیں اور ان ایجادات کے ظہور کا انتظار بھی کیا جاتا ہے، لیکن اسی روشنی کی رفتار سے براق پر سفر کرنے والے اور سات آسمانوں کی شہادت لانے والے پر یقین نہیں کیا جاتا ۔۔۔۔؟ فتح اور برتری کے جنون میں ایٹم بم برسانے والوں کو تو مہذب کہا جاتا ہے اور اپنے گھر کی حفاظت کے لیے پتھر اُٹھانے والوں کو دہشت گرد کا رتبہ دے دیا جاتا ہے ۔۔۔۔ یہ ۔۔۔۔ اور ایسے بہت سے دوسرے سوال ہیں جن کا جواب مَیں اپنی ہی اس نئی نسل سے چاہتا ہوں ۔۔۔۔''

میں ایک جذب کے عالم میں جانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اور تب چونکا جب، ہر طالب علم کو دیے جانے والے سات منٹ ختم ہونے کے بعد اسٹیج سیکرٹری نے گھنٹی بجا کر مجھے احساس دلایا کہ میرا وقت ختم ہو چکا ہے۔ مَیں شکریہ ادا کر کے نیچے اُتر آیا۔ تمام ہال کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر سب سے پہلے ربیکا ہی کھڑی ہوئی اور اس کی تالیوں کی گونج میں رفتہ رفتہ دیگر ہال بھی شامل ہوگیا۔ میں نے اسٹیج پر کھڑے ہوئے بھی اور پھر نیچے اُترتے وقت بھی سر آئزک کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پایا تھا۔ سارہ کے چہرے پر البتہ کچھ حیرانی اور کچھ ٹھہراؤ کی کیفیت تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ اپنے جذبات کو چھپانے میں کمال رکھتی تھی۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ہال سے نکل کر میں راہداری سے گزر رہا تھا کہ ربیکا نہ جانے کہاں سے مجھے آوازیں دیتی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے زور سے ہاتھ ملایا۔ اور خوشی سے بولی۔

''ہے میڈی ۔۔۔۔ گریٹ یلو ۔۔۔۔ میں نے تو یونہی مستی میں تمھارا ہاتھ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنا بہترین بول لیتے ہو۔ ویسے تو بڑے چُپ چاپ رہتے ہو ہاں۔ بہر حال ۔۔۔۔ تم مانو نہ مانو ۔۔۔۔ تمھاری تقریر نے پورے ہال پر سکتہ طاری کر دیا تھا ۔۔۔۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی تمھاری باتیں سننے اور ان پر یقین کرنے پر مجبور تھے۔ کیونکہ تمھارے پاس ہر بات کی دلیل موجود تھی۔''

میں نے مسکرا کر اس زندگی بھری لڑکی کی خوشی کو سراہا۔

''میں نہیں جانتا یہ تمام لاجک (Logic) یہ تمام دلائل میرے پاس کہاں سے یک

دم ہی آ گئے تھے۔ کیونکہ میں کبھی کوئی خاص مذہبی انسان نہیں رہا۔ اور مَیں نے پہلے سے اس تقریر کے لیے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔"

"مَیں جانتی ہوں۔ سب مقررین کو موقع پر ہی تقریر کے عنوان دیے گئے تھے۔ بہر حال، تم نے میدان مار لیا۔ چلو اسی بات پر تمھیں کیفے ٹیریا سے بہترین کافی پلواتی ہوں۔"

ربیکا کی عادت تھی کہ وہ بات کہہ کر جواب سنے بغیر آگے چل دیتی تھی۔ سو میں بھی ایک لمبی سی سانس بھر کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ کیونکہ اس سے بحث کرنے یا منع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ وقت لگ جاتا جتنا کافی کا ایک مگ حلق سے نیچے اُتارنے میں لگتا ہے۔

بظاہر یونیورسٹی کا ماحول پُرسکون تھا، لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میری اس دن کی، کی ہوئی تقریر آگے چل کر چند ہفتوں میں کن نت نئے اور بڑے طوفانوں کو جنم دینے والی ہے۔ بقولِ کامران "مَیں یہود کی نظروں میں آ چکا تھا لیکن بے خبر تھا۔"

OO

خدا اور محبت

مجھے ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کرتے تقریباً ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ میرے ہاتھوں کو چونکہ ایسی مشقت کی عادت نہیں تھی اس لیے پہلی رات ہی ان پر چھالے پڑ گئے تھے۔ جو اب رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غفورا میرا جس حد تک خیال رکھ سکتا تھا وہ رکھ رہا تھا۔ ویسے بھی مَیں دوسرے مزدوروں سے کچھ الگ تھلگ ہی رہتا تھا۔ ان کے اپنے چھوٹے چھوٹے غم تھے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں۔ ان سب میں ان کی دانست میں زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے غفورے نے میرا نام "بابو" رکھ چھوڑا تھا۔

میری راتیں پلیٹ فارم یا ویٹنگ روم کے کسی بینچ پر گزرتی تھیں۔ اور دن سارا مزدوری کرتے ہوئے۔ مجھے ان دنوں میں اس بات کا احساس شدت سے ہُوا کہ ہم انسانوں نے اس زندگی کو ایک خواہ مخواہ کا بکھیڑا بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ انسان چاہے تو اس کا گزارہ دو جوڑے کپڑے میں بھی بہت خوش اسلوبی سے ہو سکتا ہے۔

مَیں حماد اور امجد رضا، جس کے کپڑے لندن کے بڑے بڑے بوتیک سے تیار ہو کر آتے تھے۔ جو کف لنکس اور ٹائی کی پن میچنگ نہ ہونے کی وجہ سے پورے کا پورا سوٹ اُٹھا کر باہر پھینک دیتا تھا اور جس نے کبھی کسی تقریب میں ایک دفعہ کا پہنا ہوا لباس دوبارہ نہیں پہنا تھا۔ وہ حماد اَب بڑے آرام سے اپنے ایک جوڑا پینٹ شرٹ اور ایک وردی میں گذارا کر رہا تھا۔ ریلوے کے دھوبی گھاٹ سے پانچ روپے میں جوڑا دھل کر آ جاتا تھا اور وردی تو ویسے بھی سرکاری طور پر ہر دوسرے روز دھل کر آ جاتی تھی۔

کبھی میری صبحیں کانٹی نینٹل، انگلش یا عربی ناشتے کے لوازمات کے بغیر مکمل بھی نہ ہوتی تھیں۔ فرانس کا بنا ہوا کارن فلیکس اور مصر کا درآمد شہد نہ ہوتا تو میں ناشتہ ہی اُدھورا چھوڑ کر اُٹھ جاتا تھا۔ اب پلیٹ فارم کے کیبن کی تیز پتی کی چائے اور بند مکھن کے ساتھ بڑے

مزے کا ناشتہ ہو جاتا تھا۔

فریش اسٹرابری شیک کی جگہ گنے کے رس نے لے لی تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں کے لنچ اور ڈنر کی جگہ پلیٹ فارم کے ہوٹل کے تنور کی سادہ روٹی اور شوربے نے لے لی تھی، اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شروع کے دو تین دن کے علاوہ بعد میں مجھے کوئی خاص فرق بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اُن دنوں مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ واقعی ہم انسانوں نے خود اپنی زندگیوں کو مفت کے جھمیلوں میں اُلجھایا ہوا تھا۔ خاص طور پر ہم امیر لوگ، ہماری خود پرستی اور خود پسندی اِک عذاب ہی تو ہے۔

مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آتی گئی کہ انسان کی زندگی میں دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو اگر زندگی بتانے کا ایک پیمانہ سمجھا جائے تو ان چوبیس گھنٹوں میں سے زیادہ تر لوگ تو بارہ گھنٹے دن اور رات کی نیند میں ہی بتا دیتے ہیں۔ باقی بچے بارہ گھنٹے تو اس میں سے بھی چھ گھنٹے تو دنیاداری کی فکر، دفتر اور نوکریوں یا کاروبار وغیرہ کے جھمیلے میں گزر جاتے ہیں۔ باقی چھ گھنٹوں میں بھی آپ کھانے پینے اور کہیں آنے جانے کا دورانیہ شامل کر لیں تو زندگی کے بمشکل دو یا تین گھنٹے ہی گزرتے ہیں جو ہم یا کوئی بھی انسان اپنے لیے بتاتا ہے۔ اب ان دو تین گھنٹوں کی زندگی کے لیے اس قدر جدوجہد، اس قدر بے ایمانی، اس قدر کھینچا تانی کی کیا ضرورت ہے۔ انسان اگر معیار کے مقابلے میں پڑنا چاہے تو پھر معیار اور اعلیٰ زندگی کی بھلا کیا حد ہو سکتی ہے۔ اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک سے بڑھ کر ایک تعیش بھری زندگی کی مثالیں ہمارے سامنے آ جائیں گی۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب کے پاس ہوتے بس چوبیس گھنٹے ہی ہیں۔ سارا کھیل انہی چوبیس گھنٹوں کو ٹالنے کا ہے۔ چاہے بہترین سے بہترین ملنے کی بے چینی میں کاٹ لیں، یا پھر جو کچھ میسر ہے اسی پر صبر اور شکر کر کے بتا دیں دن بھر شکوہ کرتے رہیں یا پھر سجدہ شکر میں بسر کر دیں۔ یہ چوبیس گھنٹے تو بہرحال گزر ہی جاتے ہیں۔

زندگی روز مجھے نئے نئے سبق سکھا رہی تھی۔ یا شائد میں زندگی کی حقیقت کو سمجھنے لگا تھا۔ شائد مجھے اس لیے بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اکیلا تھا۔ شاید رشتے ہی انسان کی سب سے بڑی مجبوری بن جاتے ہیں۔ رشتوں کے تقاضے انسان کو ناشکری اور

خوب سے خوب تر کی ریس میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ شاید دُنیا میں اگر ہر آدمی اکیلا ہی ہوتا تو اسے زندگی اتنی کٹھن اور مشکل کبھی نہ لگتی۔ میاں، بیوی، بچے، بچوں کے بچے ۔۔۔۔ یہ سب رشتے ہیں۔ انسان کو اس دلدل میں دھکیل دیتے ہوں شاید؟

ایک ہفتہ پورا ہو گیا تھا اور آج جمعرات کا دن تھا۔ آج میری شام کو چھٹی تھی۔ میں غفورے کو بتا کر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ یہ پورا ہفتہ مَیں نے باہر کی دُنیا کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہُوا کہ جیسے میں اس شہر میں بالکل نیا ہوں۔ اسٹیشن سے ایک تانگے والے کو مَیں نے مولوی علیم کے پُرانے محلے چلنے کو کہا۔ ہم زندگی میں روزانہ کئی فیصلے کرتے ہیں کہ کل یہ کرنا ہے، اگلے ہفتے وہاں جانا ہے۔ فلانی تاریخ کو فلاں کام کرنا ہے لیکن ان میں سے بہت کم فیصلے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کی تکمیل کا وقت قریب آتے ہی آپ کا دل ڈوبنا شروع کر دے۔

بس یہی حالت اس وقت میری بھی مولوی صاحب کے گھر کی طرف جاتے ہوئے ہو رہی تھی۔ لیکن مَیں سمجھتا تھا کہ شاید اَب میں ان سے کی گئی زیادتی کی معافی مانگنے کے قابل نہ سہی۔۔۔۔ پر طلب گار تو ہو سکتا تھا۔

تانگے نے مجھے پُرانے محلے کے گیٹ پر اُتار دیا۔ یہ عصر کا وقت تھا، یہی کوئی شام پانچ ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔ مَیں دھڑکتے دل اور بھاری قدموں سے مولوی صاحب کی گلی کے نکڑ تک آ پہنچا۔ لیکن اب آگے بڑھنے کی ہمت جیسے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ مولوی صاحب کا دوبارہ سامنا کرنے کی وجہ سے اور کچھ اس نازنین کے گھر کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے خیال سے ہی جیسے میرے پسینے سے چھوٹ رہے تھے۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے۔ مولوی صاحب کی گلی میں تین چار ہی گھر تھے اور اس وقت گلی تقریباً سنسان ہی پڑی تھی۔ بہت دیر تک مَیں مولوی صاحب کے مکان کے لکڑی کے دروازے کے قریب کھڑا اپنی سانسیں درست کرتا رہا۔ اندر سے دُور کسی کے بولنے کی مدہم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرا دل پھر سے اُچھلا۔ شاید یہ ایمان کی ہی آواز ہو۔ مَیں نے ہلکے سے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر کسی نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

"جی کون ہے۔۔۔؟"

یہ ایمان ہی کی آواز تھی۔ اس کی آواز کا جلترنگ میں بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ میرے لیے اس لمحے زمین اور آسمان کی گردش جیسے تھم سی گئی تھی۔ جواب میں مَیں نہ جانے کیا کہنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے میرے منہ سے غوں غاں کی کیسی عجیب سی آواز نکلی کہ اسے دوبارہ میرا نام پوچھنا پڑا۔ اتنی دیر میں ایمان دروازے کے بالکل قریب پہنچ کی تھی مولوی صاحب کے تمام ملنے والوں کو شاید کسی کے گھر کے باہر دستک دینے کے تمام آداب کا سخت لحاظ ہوتا ہوگا اور ایمان شاید مجھے بھی انہی مہذب لوگوں میں سے کوئی ایک سمجھ رہی تھی جو دستک دے کر دس قدم دور جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اندر سے اگر کوئی نسوانی آواز سنائی دے تو باقاعدہ منہ ہی پھیر لیتے ہیں تا کہ بے پردگی نہ ہو۔ لیکن بھلا مجھ جیسے جاہل کو ان روایتی آداب کا کیا پتہ تھا۔ مَیں نے تو اس طرح سے کسی کے دروازے پر دستک بھی زندگی میں پہلی بار دی تھی۔ میرے تو تمام دوستوں، رشتہ داروں اور جاننے والوں کے اُونچے اُونچے محل نما مکانات تھے۔ جن کے گیٹوں پر بیٹھے دربان ہارن بجنے سے پہلے ہی گیٹ کھول دیتے تھے۔ اور میری اسپورٹس کار زَن سے اندر داخل ہو جاتی تھی۔

شاید ایمان یہی سمجھی کہ مَیں مولوی صاحب کا کوئی ایسا ہی تہذیب یافتہ مہمان ہوں جو دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد نسوانی آواز سن کر دروازے سے اتنی دور جا کھڑا ہوا ہے کہ اس کی آواز بھی اندر اس تک ٹھیک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اور شاید اسی لیے اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر دروازے کو تھوڑا سا کھول کر پوچھنے کے لیے ایک جھری سی بنائی۔ میں گم سم سا ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس کی نازک اور مخروطی انگلیاں دروازے کے سرے پر نظر آئیں اور پھر ایمان نے دوپٹے کا نقاب اوڑھے ہلکا سا دروازہ کھولا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ کوئی دروازے کے اتنے پاس ہی کھڑا ہوگا۔ مَیں نے گھبرا کر نظر اُٹھائی اور میری اور اس کی نظر ایک لحظے کے لیے ٹکرائی۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں وہی شدید حیرت لہرائی جو بس اس کی آنکھوں کا خاصہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بنا کچھ کہے تیزی سے وہاں پلٹ گئی۔ وہ اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اس نے دروازہ بھی ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا۔ مَیں بھی ابھی تک اس کی نظر کی بجلی سے جیسے

آنکھیں چندھیا جانے کے بعد ٹھیک ہونے کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔ کچھ دیر میں حیا دروازے پر نمودار ہوئی۔ پہلے اس نے کھلا دروازہ ٹھیک طرح سے بند کیا اور پھر دروازے کی تھوڑی سی کھلی جھری سے ہی اس نے مجھے سلام کیا۔ مَیں نے سلام کے جواب کے بعد اس سے کہا کہ مَیں مولوی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ حیا نے مجھے بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے اس لیے آج ان سے ملاقات ممکن نہیں ہوگی۔

"دیکھیں۔۔۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ مَیں ان کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ بس چند لمحوں کے لیے۔۔۔ پلیز۔"

جواب میں حیا تو چپ ہی رہی لیکن ایمان جو نہ جانے کب دروازے پر حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی، اس کی آواز اُبھری۔

"دیکھیں آپ خدا کے لیے یہاں سے چلے جائیں۔۔۔ ابا جان کی حالت بڑی مشکل سے کچھ سنبھلی ہے۔ وہ آپ کو یہاں دیکھیں گے تو۔۔۔ یہ میری آپ سے التجا ہے۔۔۔ آپ یہاں دوبارہ نہ آئیے گا۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل کے عین بیچ میں کوئی بڑا سا چھرا گھونپ دیا ہو۔ کسی نے بھاری پتھر سے اُسے کچل دیا ہو۔ لیکن اس میں ان بے چاریوں کا بھی بھلا کیا قصور تھا؟۔۔۔ اپنے شریف باپ کی صحت کے لیے کوئی بھی بیٹی کچھ ایسی ہی ترکیب تجویز کرتی۔ چند لمحے تو مجھ سے جیسے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ پھر مَیں نے دوبارہ اپنی ہمت مجتمع کی۔

"دیکھیں۔۔۔ مَیں جانتا ہوں کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ لیکن میرا یقین کیجئے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا، ورنہ مَیں کبھی اپنے گھر والوں کے سامنے اس بات کا ذکر بھی نہ کرتا۔ جو کچھ بھی ہُوا میری وجہ سے ہوا۔ تو ازالہ بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ مجھ سے ان سے معافی مانگنے کا موقع مت چھینئے۔۔۔ مَیں آپ کی منت کرتا ہوں۔"

ایمان کی آواز فضا میں پھر سے گنگنائی۔

"اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وقت خود ہی اپنے آپ ان کے زخم بھر دے گا۔ لیکن آپ یوں بار بار اگر ان کے سامنے آتے رہیں گے تو شاید وہ اس بات کو بھی

بھلانہ پائیں۔ انہیں آپ سے اب کوئی گلہ نہیں ہے۔ آپ بھی اس بات کو بھول جائیں، جو ہُوا سو ہوا، اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

ایمان کی دلیل اپنی جگہ درست تھی، لیکن میرے لیے یہ تب درست ہوتی کہ اگر میرا مقصد آخری بار مولوی صاحب سے معافی مانگ کر واپس چلے جانے کا ہی ہوتا۔ اس صورت میں مَیں تو سالوں انتظار کر سکتا تھا کہ جب مولوی صاحب کے دل کے داغ ہلکے پڑ جائیں گے تو سامنے آ کر معافی مانگ لوں گا۔

پر میرا مقصد تو اس سے کہیں بڑھ کر تھا۔ مجھے ان سے پہلے ان کا اعتماد اور پھر ان کے گھر میں چھپا وہ گدڑی کا لعل جیتنا تھا جس کی ایک نظر نے میری دُنیا ہی پلٹ کر رکھ دی تھی۔ وہ دونوں دروازے کی اس طرف چِک کی کھڑی میرے جانے کا انتظار کر رہی تھیں اور مَیں اس طرف کھڑا اپنے ذہن میں کوئی نئی تاویل گھڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اگر میں آج اس دَر سے پلٹ گیا تو شاید دوبارہ کبھی یہاں تک نہ پہنچ پاؤں۔ مَیں نے آخری بار ہمت جمع کر کے جیسے ہی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ اندر برآمدے کی طرف سے مولوی صاحب کی آواز اُبھری۔

"کون ہے بھئی دروازے پر وہاں۔۔۔؟"

اندر ایک طویل سی خاموشی طاری ہوگئی۔ اتنے میں ایک اور بات عمل پذیر ہوئی۔ عبداللہ گلی کے نکڑ سے تسبیح گھماتا گلی میں داخل ہوا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ کچھ ٹھٹک سا گیا۔ پھر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"آپ۔۔۔ یہاں۔"

"جی۔۔۔ مَیں مولوی صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔"

عبداللہ نے کچھ تأمل کیا۔

"شاید ان سے آپ کا ملنا اس وقت کچھ بہتر نہ ہو۔"

"آپ ان سے اندر جا کر میرا تذکرہ تو کریں۔ اگر انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔"

عبداللہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ یہ چند لمحے مجھ پر کیا قیامت کی

صورت گزرے۔۔۔ یہ بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں پھانسی کا کوئی قیدی ہوں اور تختے پر کھڑا دوسری طرف کے مقتول کے ورثاء کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں کہ آیا مجھے معاف کر دیا جائے گا یا پھر لیور کھینچ کر پھانسی دے دی جائے گی۔

صدیوں کے انتظار کے بعد دروازہ پھر کھلا اور عبداللہ برآمد ہوا۔ مَیں نے اُمید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ کر بولا۔

"آیئے۔۔۔ اندر آ جایئے۔"

میری رُکی ہوئی سانس پھر سے جیسے بحال ہوگئی۔ میری جان میں جان سی آ گئی اور مَیں عبداللہ کے پیچھے سر جھکائے پھر سے اس گھر میں داخل ہو گیا جہاں وہ رہتی تھی۔ ہم صحن سے ہوتے ہوئے اسی بیٹھک کی طرف بڑھ گئے جو لکڑی کی جالیوں سے پار برآمدے سے ملحق تھی۔ عبداللہ مجھے بٹھا کر اندر چلا گیا۔ چند لمحوں کے لیے ایک سناٹا سا طاری رہا۔ کوئی آواز، کوئی آہٹ نہ تھی۔ مَیں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ سب کچھ ویسے ہی پڑا تھا۔ ہر ترتیب ویسے ہی تھی جیسی میرے یہاں پہلی آمد کے وقت تھی، لیکن تب کے اور اس وقت کے میرے استقبال میں کس قدر فرق تھا۔ وقت کی بازی اچھے اچھوں کو پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ دیر میں دروازے پر مولوی صاحب کے کھانسنے کی ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ مَیں جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

مولوی صاحب چھڑی کے سہارے ٹیکتے ہُوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہ شکل سے برسوں کے بیمار معلوم ہو رہے تھے۔ مَیں ان کے استقبال کے لیے احتراماً کھڑا ہو گیا۔ وہ آ کر چُپ چاپ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ میرے سلام کا انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔

کچھ دیر ماحول پر گھمبیر سے خاموشی طاری رہی۔ میرے تو سارے لفظ جیسے پہلے ہی کھو گئے تھے، خود مولوی صاحب بھی گم سم سے تھے، پھر مَیں نے ہی خاموشی توڑی۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔"

"بھلا ہوں اب۔۔۔ شکر ہے مالک کا۔"

"کیا آج میں آپ سے معافی کی اُمید کر سکتا ہوں۔"

"جو بیت چکا اس کا بار بار ذکر کیوں کرتے ہو؟" معاف کرنے والا میں کون ہوتا ہوں۔ معافی دینے والی صرف اس کی ذات ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکا ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ میاں۔ یہ بڑے لوگوں کے یاد رکھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ ہم چھوٹے لوگوں کو ہمارے حال پر چھوڑ دو۔"

ان کا لہجہ آخر میں خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ یہ بھی انہی کا ظرف تھا کہ وہ میرے وجود کو اس وقت خاموشی سے اپنے ہی گھر میں برداشت کر رہے تھے، کوئی اور ہوتا تو شاید مجھے دھکے دے کر دروازے سے ہی واپس لوٹا دیتا۔

"جو کچھ میرے گھر والوں نے آپ سے کیا وہ ان کی کم ظرفی اور ناقابل تلافی گناہ ہے۔ لیکن آپ سب لوگوں سے خفا کیوں ہیں؟"

مولوی صاحب کے لہجے میں مزید تلخی اُبھر آئی۔

"جانے دو میاں۔۔۔۔ یہ سب کھیل تماشا ہے بڑے لوگوں کا۔۔۔۔ اور تم جیسے امیرزادوں کے لیے روز کا کھیل، پر ہم سفید پوشوں کی عمر بھر کی کمائی چند بھرم ہی تو ہوتے ہیں۔ تم لوگ ہم جیسوں کے پاس ان کا وہ بھرم بھی باقی نہیں چھوڑنا چاہتے۔"

"کیا میرا سب سے بڑا قصور آپ کی نظروں میں بس یہی ہے کہ میں ایک امیرزادہ ہوں۔۔۔۔ امیر گھرانے میں پیدا ہوا ہوں۔ کیا کسی کا امیر ہونا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کی نیت پر کوئی ہمیشہ کے لیے اپنا اعتبار ہی کھو دے۔ تو پھر مجھے بتائیے کہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے مجھے کس امتحان کس آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔ میں آپ کا اعتبار پانے کے لیے آگ کے کسی بھی دریا سے گزرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔۔۔۔ اور پھر آپ میری جس امارت سے خفا ہیں وہ تو خود میری اپنی بھی نہیں ہے۔ دوسروں کی عطا کردہ ہے۔ آپ نے تو خود کہا تھا اُس دن کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ پھر دوسروں کی دی ہوئی اس شناخت کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔"

میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا اور اپنی رو میں جانے کیا کچھ بول گیا۔ مولوی صاحب کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ جیسے میری باتوں پر غور کر رہے ہوں۔ پھر انہوں نے سر اُٹھایا۔

"تم اگر واقعی معافی کے طلب گار ہو اور چاہتے ہو کہ میرے دل سے تمہارے گھر

والوں کی کہی ہوئی باتوں کا بوجھ ہٹ جائے تو تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ آج کے بعد تمہیں مجھے اس گھر کے راستے کو، اس گھر کو اور اس میں بسنے والے سبھی لوگوں کو ان کی عزت اور وقار کی خاطر ہمیشہ کے لیے بھلانا ہوگا۔ میں نے تمہاری بات ٹھنڈے دل سے سن لی ہے اور تمہاری معذرت کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اب تمہیں بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم واقعی اپنے اور اپنے گھر والوں کے طرزِ عمل پر شرمندہ ہو۔ بولو دے سکتے ہو مجھے یہ وعدہ۔۔۔۔؟ پانا چاہتے ہو اپنا پُرانا بھرم واپس؟"

مجھے لگا کہ میں لاجواب سا ہو گیا ہوں۔ ضرور شاکر نے اس ایک ہفتے میں مولوی صاحب سے دبے لفظوں میں میری مرضی کا کچھ نہ کچھ تذکرہ ضرور کیا ہوگا۔ تبھی انہیں اپنی پیش بندی کے لیے اتنی لمبی تمہید باندھنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ گویا وہ جانتے تھے کہ وہ میرا مقصد اس معافی سے سوا بھی کچھ مزید ہے۔۔۔۔ کچھ اور ہے۔

میں نے اپنی ہمت پھر سے جمع کی۔

"دیکھیں۔۔۔۔ اُس دن آپ نے کہا تھا کہ میری اپنی کوئی شناخت نہیں ہے۔ میں جو بھی ہوں دوسروں کے بل بوتے پر اور اس گھر کی شان و شوکت کی وجہ سے ہوں۔ میں نے اگلے دن ہی وہ گھر چھوڑ دیا تھا۔ اب میں یہاں اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ آیا ہوں۔ میرا اس گھر کی دولت اور شان و شوکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس وقت ایک معمولی مزدور ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ خود دو وقت کی روٹی کما سکتا ہوں۔ ہر قسم کی ضمانت دے سکتا ہوں، دلوا سکتا ہوں۔ جو صرف اور صرف میری ذات کے بل بوتے پر ہوگی۔ اس میں میری ماضی کی شناخت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ اور اپنی اسی نئی شناخت کے بل پر میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

مولوی صاحب کی تیوری پر غصے کے بل نمودار ہوئے لیکن انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو قابو میں رکھا۔

"کوئی بھی بات دُہرانے سے پہلے اس بات کا خیال ضرور رکھنا کہ میرے کچھ بھرم ابھی باقی ہیں۔ کہیں تمہاری درخواست ان آبگینوں کو بھی پارہ پارہ نہ کر دے۔ جو تم سوچ رہے ہو۔ وہ ناممکن ہے۔"

میں جب مولوی صاحب کے گھر کے لیے اسٹیشن سے چلا تھا تو مَیں نے ایسا بالکل بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے آج ہی اس سلسلے میں حتمی بات کرنی پڑے گی۔ لیکن مولوی صاحب کے حتمی انداز نے خود بخود بات کو اس کا حتمی رُخ دے دیا تھا۔

کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔ پھر مَیں نے ہی یہ کفر توڑا۔

''مَیں نے سوچا تھا کہ کسی حتمی بات کے لیے کسی بزرگ کو آپ کی طرف بھیجوں گا۔ میرے گھرانے کے علاوہ بھی کچھ لوگ اور ہیں جو میری التجا آپ تک پہنچا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے شاید پہلے ہی آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ صرف مجھے اتنا بتا دیں کہ مجھ میں کیا کمی ہے۔ اپنی دولت اور امیری کی بدنامی کا طوق تو میں پہلے ہی اپنے گلے سے اُتار چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی کمی کوئی خامی ہے تو میں اُسے بھی دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے دھتکارنے کی کوئی وجہ تو بتا دیں۔''

مولوی صاحب کا ضبط اب جواب دے چکا تھا۔ وہ زور سے غصے میں چلائے اور کھڑے ہو گئے۔

''بس۔۔۔۔ بہت ہو گیا۔ کیوں ہم لوگوں کو بدنام کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے؟ مولوی علیم جس گھرانے میں بچے کو درس دینے جاتے تھے۔ اُسی گھرانے میں اپنی بیٹی بیاہ دی۔ تم چاہتے ہو کہ سارا زمانہ ہم پر انگلیاں اُٹھائے۔ جو الزام تمھارے گھر والوں نے مجھ پر اور میری بیٹیوں پر لگایا ہے، اُسے ہم اپنے ہاتھوں سے سچ کر دکھائیں۔ نہ میاں نہ۔۔۔۔ ہمارے حال پر کچھ تو رحم کرو۔''

''تو گویا آپ کو صرف لوگوں کی باتوں کا ڈر ہے۔ اگر میرے گھر والے اگر آپ سے بدتمیزی نہ کرتے اور میری خوشی کے لیے یہ رشتہ لے کر آ بھی جاتے تو آپ اُسے قبول نہ کرتے۔''

''کبھی نہیں۔۔۔۔ ہمارا اور تمھارا کوئی میل نہیں ہے۔ تمھاری تربیت کچھ اور ہے۔ تم جن لغویات کو پیار اور محبت کا نام دیتے ہو ہمارے ہاں اُسے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ صرف گناہ، میں پہلے ہی بہت گناہ گار ہوں مجھے مزید گناہ گار مت کرو۔ ہماری بیٹیاں ایسے لادین گھرانوں میں نہیں بیاہی جاتیں جہاں سالوں سال کسی نے نماز تک نہ پڑھی ہو۔ جس گھر

کے نوجوانوں کو پہلے یا بمشکل دوسرے کلمے کے بعد کے کلموں کا علم تک نہ ہو۔ جہاں قرآن کو صرف سجا کر طاق میں رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا ہو۔ جہاں عورت مرد بے حجابانہ ملتے ہوں۔ تمھاری تربیت بھی تو ایک ایسے ہی گھر کی ہے۔ صرف گھر چھوڑ دینے سے انسان کا ضمیر نہیں بدل جاتا۔ میں اپنے آنے والی نسلوں کو تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اب اجازت دو۔''

مولوی صاحب غصے میں میری کوئی بات سنے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی عبداللہ اندر آ گیا اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ میں نے جانے کا عذر کیا لیکن اس نے پھر بھی جلدی سے چائے کپ میں انڈیل دی تھی۔ مَیں نے دو گھونٹ زہر مار کیے۔ عبداللہ مجھے چھوڑنے باہر گلی تک آیا اور جاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کر کے بولا۔

''چچا جان کی باتوں کا بُرا مت منائیے گا۔ اس وقت وہ اپنے آپے میں نہیں تھے۔ میں نے اسی لیے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ اب ان سے دوبارہ نہ ہی ملیں تو بہتر ہو گا۔ بہر حال جو ہوا اُسے بھول جائیے۔ شاکر چچا نے اس دن بتایا تھا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ ماں باپ کا بڑا مقام ہوتا ہے، ان سے اتنی ناراضگی اچھی نہیں مغرب کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔ عبداللہ مجھے محلے سے باہر چھوڑ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں تو ٹھیک طرح سے عبداللہ کو خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں پیدل ہی کس جانب روانہ ہوں۔ مولوی صاحب کے جملے میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح بہہ بہہ کر داخل ہو رہے تھے۔ کیا واقعی محبت بھی ایک گناہ ہے نہ۔۔۔۔؟ اگر محبت کرنا گناہ ہے تو پھر یہ کیسا گناہ ہے جو مجھے بے چینی کے بجائے خوشی اور سکون دے رہا تھا؟

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مولوی صاحب کے انکار کی وجہ صرف طبقاتی فرق ہو گا امیری غریبی کا فرق۔۔۔۔ لیکن یہاں تو جنگ مذہب اور محبت کے درمیان تھی۔ مذہب محبت کو دھتکار رہا تھا۔ میں اس وقت سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اگر میں پورے چھ کلمے یاد کر لیتا اور میں بھی مولوی صاحب جیسا شرعی لباس پہن کر اگر کسی مسجد کے متولی کی حیثیت سے ان کی بیٹی کا رشتہ لینے

جاتا تو میں کیوں ان کے لیے قابل قبول ہو جاتا۔۔۔؟

اگر میں مذہب سے دُور تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ ایمان کے لیے میری محبت تو اسی طرح اپنی جگہ قائم تھی۔ اتنی ہی پاک تھی جتنی کسی مذہب کی شمولیت کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ ٹھیک ہے میں اپنی تربیت کی وجہ سے کچھ خاص اچھا مسلمان نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا میری محبت سے کیا تعلق تھا۔

مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کب ریلوے اسٹیشن آ پہنچا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور آخری میل بھی نکل چکی تھی۔ پلیٹ فارم میرے دل کی طرح ویران پڑا تھا۔ اِکا دُکا کیبن ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ میں گم سم سا آ کر ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا میں نہیں جانتا تھا کہ میری مذہب سے ان جانی دُوری آج مجھے اور میری محبت کو اس قدر حقیر بنا دے گی۔ مجھے اپنا آپ بہت چھوٹا لگ رہا تھا۔ مولوی علیم کی باتوں نے مجھ سے پل میں مجھ سے میری ذات کا۔۔۔ میری محبت کا غرور چھین لیا تھا۔ آج مجھ سے زیادہ تنہا شخص اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔۔۔ کوئی نہیں تھا۔

OO

محبت کے تین پہر

میری اس دن کی یونیورسٹی ہال میں کی گئی تقریر نے مجھے خاصا مقبول کر دیا تھا، کہتے ہیں متنازعہ ہونا بھی مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی نشانی ہوتا ہے۔ اب میں مقبول زیادہ تھا یا متنازعہ۔۔۔؟۔ اس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔

اگلے دن ہیومینٹرنگ کی کلاس میں سر آئزک نے ہم سب کو محبت پر بحث کرنے کی دعوت دی۔ ربیکا نے کہا محبت فانٹا کی بوتل کی طرح ہوتی ہے، جب تک ختم نہ ہو جائے، پیتے جانا چاہیے۔ جم نے کہا کہ محبت جسم ہے جسے پائے بنا پیاس نہیں مٹ سکتی۔ ٹینا نے کہا محبت وارڈروب میں لٹکے کپڑوں کی طرح ہے۔ روز بدل کر پہننے کو دل کرتا ہے۔ سارہ نے کہا محبت اور کچھ نہیں، بس جسم میں ہارمونز کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے۔ اور تبدیلی بھی وہ جو غیر مستقل ہوتی ہے۔ ہارمونز جیسے ہی واپس اپنی مستقل جگہ پر واپس آئے نہیں کہ محبت ختم۔

کسی من چلے نے پیچھے سے گرہ لگائی کہ لیکن جب تک محبت کے ہارمونز واپس اپنی جگہ لینے کے لیے آتے ہیں، تب تک ان دو پریمیوں کی شادی ہو چکی ہوتی ہے۔ اس بات پر ساری کلاس ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر سر آئزک میری طرف متوجہ ہوئے۔

''اور حماد تم۔۔۔ تمھارا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''سر۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت بھی انسان پر کسی دن کے پہروں کی طرح وارد ہوتی ہے۔''

''او ریئلی۔۔۔؟۔ کیا آپ کلاس کے سامنے محبت کے ان پہروں کو بیان کرنا پسند کریں گے؟''

''محبت کا پہلا پہر ہمیشہ چُبھن، تشنگی اور شدید پیاس لے کر آتا ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب آپ کا محبوب آپ سے دور ہوتا ہے۔ آپ کے جذبے آپ ہی تک محدود ہوتے ہیں

اور یک طرفہ محبت کی یہ تڑپ آپ کو ہر لمحہ کانٹوں پر چلنے کا احساس دلاتی ہے۔۔۔۔

پھر اظہار ہو جاتا ہے اور خوش قسمتی سے اگر اظہار قبولیت کا شرف بھی پا لے تو محبت کا دوسرا پہر شروع ہوتا ہے۔ تب محبت کی اصل ٹھنڈی چھاؤں کا اور ابدی سکون کا احساس ہوتا ہے، تب تپتی دھوپ میں بھی ٹھنڈک ملتی ہے اور جلتا صحرا بھی نخلستان بن جاتا ہے۔ ایسا نخلستان جس کا ساکت رکا ہوا پانی بھی کسی میٹھے اور صاف بہتے جھرنے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔''

مجھے ربیکا کی آواز کہیں دُور سے آتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

''اور محبت کا تیسرا پہر۔۔۔اس میں کیا ہوتا ہے؟''

''بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو محبت کے ان دو پہروں کو جھیل کر محبت کے تیسرے اور آخری پہر تک پہنچ جاتے ہیں۔ محبت کے تیسرے پہر میں پہلے پہر سے بھی زیادہ شدید تشنگی، شدید تیز پیاس اور بے چینی ہوتی ہے۔ لیکن یہ تشنگی، یہ پیاس پا لینے کی پیاس ہوتی ہے۔''

سارہ کے منہ سے حیرت میں نکلا، وہ پوچھ کر ضرور پچھتائی ہوگی۔

''پا لینے کی پیاس۔۔۔؟ یہ کیسی پیاس ہوتی ہے؟''

ہاں۔۔۔ پا لینے کی پیاس۔۔۔ جب آبِ حیات کا دریا سامنے بہہ رہا ہو تو کون ہوگا جو صرف ایک آدھ گھونٹ پر اکتفا کرے گا؟۔۔۔ پا لینے کی پیاس، جدائی کی پیاس سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے۔۔۔ اور اگر یہ پیاس لگ جائے تو ملن جدائی سے زیادہ اذیت ناک بن جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہماری محدود زندگی کبھی ہمیں اس دریا سے پوری طرح سیراب نہیں ہونے دیتی۔ ہم ابھی چند گھونٹ ہی حلق سے اُتار پاتے ہیں کہ جانے کا وقت آ جاتا ہے۔''

ساری کلاس پر اک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جم کو شاید کلاس کی وہ محویت پسند نہیں آئی۔ وہ میری باتوں کا اثر زائل کرنے کی نیت سے طنزیہ لہجے میں بولا۔

''بہت خوب۔۔۔ اب یہ بھی بتاتے جاؤ کہ محبت کے تیسرے پہر سے گزرنے کے

بعد انجام کیا ہوتا ہے۔۔۔؟''

مَیں نے مسکرا کر جم کی طرف دیکھا۔

''انجام وہی ہوتا ہے جو کسی بھی بھرپور دن کا تینوں پہر گزرنے کے بعد ہو سکتا ہے۔۔۔ یعنی شام۔۔۔ تین پہروں کے بعد محبت کی بھی شام ہو جاتی ہے۔۔۔ خاموش۔۔۔ ٹھہری ہوئی اور ساکت سی اک خوبصورت شام۔۔۔ محبت کی شام۔'' مَیں خاموش ہو گیا۔ کلاس نے تالیاں بجا بجا کر اور ڈیسک پیٹ کر آسمان سر پر اُٹھا لیا اور ان میں سب سے سرفہرست ربیکا تھی۔ سارہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس دن کے بعد سے میں نے محسوس کیا کہ میرے اور کلاس کے باقی طلباء کے درمیان جو ایک عجیب سی جھجک تھی وہ ایک دم ہی ختم ہو گئی تھی۔ اب آتے جاتے لڑکے لڑکیاں مجھے بھی اسی طرح چیخ چلا کر پوری گرمجوشی سے خوش آمدید اور الوداع کہتے تھے جیسے باقی سب آپس میں وِش (wish) کرتے تھے۔

کامران میری اس کامیابی پر بہت خوش تھا، اُس نے تو باقاعدہ پوری ایک شام اس خوشی میں ہی منائی اور مجھے زبردستی سنٹرل لندن کے ایک بہت بڑے سینما بھی لے کر گیا جس میں ایک ہی عمارت میں کئی ہال تھے۔ اور ہر حال میں الگ فلم لگی ہوئی تھی۔ کوئی عجیب سی کاؤ بوائے فلم تھی اور پھر اس پر دوسری مصیبت کامران کی پوری فلم میں مسلسل رواں کمنٹری۔ وہ شاید پہلے بھی یہ فلم دس مرتبہ دیکھ چکا تھا لہٰذا اُسے مکالمے تک زبانی یاد تھے۔ وہ ہر منظر سے پہلے ہی مجھے اس کا پورا خلاصہ بتا دیتا تھا۔ تنگ آ کر جب مَیں نے اُسے سینما ہال سے نکل جانے کی دھمکی دی۔ تب جا کر وہ بمشکل چُپ ہوا لیکن تب تک فلم ہی ختم ہو چکی تھی۔ وہ بچپن سے ہی ایسا تھا۔ جب اسکول کے دور میں ہم کلاس سے بھاگ کر کوئٹہ کے مشہور ریگل سینما میں صبح کا شو دیکھنے جاتے تھے تب بھی ہال میں گھس کر پتہ چلتا کہ کامران صاحب پہلے بھی کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے یہ ٹارزن یا سندباد کے کارناموں سے بھرپور فلم دیکھ چکے ہیں اور آج مجھے اور ہمارے ساتھ بھاگنے والے دوسرے گینگ کو صرف بور کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ تب ہم نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ ہم اپنے ساتھ سفید رنگ کی بڑی کپڑے کی سرجیکل ٹیپ کی ریل لے کر جاتے اور جہاں کامران کی ٹیں ٹیں شروع ہوتی ہم سب مل کر

اُس کے منہ پر یہ چوڑی ٹیپ کا پورا رول لپیٹ دیتے۔۔۔۔۔

اُس رات بھی ہال سے نکل کر گھر جاتے ہوئے میں اور کامران بچپن کی ان حسین یادوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ سڑکوں پر سے برف ہٹانے والی مشین نے سڑکوں کے کناروں پر برف کے چھوٹے چھوٹے سے ڈھیر جمع کر دیے تھے، جن میں سے ہلکا ہلکا سا دھواں اُٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ بھیگی چمکیلی سڑک پر رات کی وجہ سے اکا دکا گاڑیاں بھاپ اُڑاتی گزر رہی تھیں اور فٹ پاتھ پر لیٹ نائٹ شو سے نکلنے والے جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، ایک دوسرے سے چپکے، سرگوشیاں کرتے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے۔

اتنے میں ایک گاڑی نے ہمیں کراس کیا اور پھر آگے جا کر رک گئی۔۔۔ پھر فوراً ہی ریورس میں ہماری طرف بڑھی اور قریب آ کر رک گئی۔۔۔ اندر سے ربیکا نے سر نکالا اور زور سے ہاتھ ہلا کر چلائی۔

''ہے میڈی۔۔۔ کتنا حسین اتفاق ہے، آؤ ہمیں جوائن کر لو۔''

ربیکا کے ساتھ گاڑی میں میرے دو اور کلاس فیلو بھی تھے جن میں سے ایک ربیکا کا کزن بھی تھا۔ یہ انکشاف بھی مجھ پر اسی رات ہوا تھا۔ میں نے ربیکا کا شکریہ ادا کیا کہ ہم آج پیدل مٹرگشت کے موڈ میں ہیں۔ کامران نے جلدی سے گھور کر مجھے کہنی ماری۔ اس کی لغت میں کسی بھی خوبصورت لڑکی کی کوئی بھی پیش کش ٹھکرانے کا سوال ہی کب تھا۔ اوپر سے ربیکا کی ضد، ہم دونوں کو ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنا ہی پڑا۔ ربیکا کے کزن نے تھوڑی دور جا کر سڑک کے کنارے بنے ایک اوپن ائیر ریسٹورنٹ کے پاس گاڑی روک دی۔ اس ریسٹورنٹ کی پچھلی جانب سے کچھ دور بہتے دریائے ٹیمز کے جگمگاتے پانیوں کا عکس اور سرسراہٹیں صاف سُنی جا سکتی تھیں۔ انہوں نے کافی کا آرڈر دے دیا۔ کامران ربیکا کے کزن اور میرے دوسرے ہم جماعت کو ربیکا سمیت ہاتھ دیکھنے کے گُر اور ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ دو لڑکوں کا ہاتھ وہ اس اُمید پر دیکھ رہا ہے کہ اس کے بعد آخر کار اُسے ربیکا کا ہاتھ تھامنے کا موقع بھی ملے گا۔ یہ اس کا بہت پُرانا طریقۂ واردات تھا، اور سچ ہے کہ وہ اس طریقے سے بہت مرتبہ کامیاب بھی ہوا تھا۔ وہ تینوں نہایت انہماک سے کامران کو اپنے اپنے ہاتھ دکھا رہے تھے۔ میں اُٹھ کر ریسٹورنٹ کے فرش کے آخری حصے

میں نصب لوہے کے اس جنگلے کی طرف چلا آیا جس کے پار دُور تک گہرائی تھی اور یہیں سے دریائے ٹیمز پر بنا وہ پُل اور اس کے نیچے سے گزرتے اسٹیمر اور چھوٹے بحری جہاز اندھیرے میں چمکتے جگنوؤں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ مَیں دیر تک دُور بہتے پانی میں ان جھلملاتی روشنیوں کا عکس دیکھتا رہا۔ پھر آہٹ محسوس ہونے پر مڑا تو ربیکا محویت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''مَیں جب بھی تم سے ملتی ہوں، مجھے ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں پھر سے ایک نئے انسان سے مل رہی ہوں۔''

''ہر انسان کی بہت سی تہیں ہوتی ہیں۔ پیاز کی طرح، اُسے جتنا چھیلو، اتنی ہی مرتبہ ایک نئی تہہ اُبھر آتی ہے۔ اب یہ چھیلنے والے پر منحصر ہے کہ وہ دوسرے کی کتنی کھوج کر سکتا ہے۔''

''نہیں۔۔۔ تمھاری کھوج اس عام کھوج سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس دن جب تم کلاس میں محبت کے مختلف پہلو بیان کر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مَیں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محبت کو جانا ہے اور ایک مجھ پر ہی کیا منحصر ہے، اس دن کے بعد ساری کلاس ہی محبت کے ان نئے پہلوؤں کو کھوجنے میں لگی ہوئی ہے۔ تم نے ہم سب کو محبت کا ایک نیا چہرہ دکھا دیا ہے۔''

''چہرہ نیا نہیں ہے، بس اس سے پہلے ذرا اوجھل تھا، محبت ایک نظریہ ہی تو ہے اور ہم سب اس نظریے کو اپنی اپنی عینک سے دیکھتے ہیں۔''

وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''سنو۔۔۔ کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

پھر خود ہی اُس نے فوراً اپنے ہی سوال کو جھٹلا دیا۔

''نہیں نہیں۔۔۔ یہ سوال تو تم سے پوچھنا ہی فضول ہے۔ جو انسان محبت کو اتنا زیادہ پہچانتا ہو، وہ خود ضرور اس تجربے سے گزرا ہو گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے محبت کو کیسا پایا؟''

''محبت میرے لیے اُس زنگ زدہ گلوٹین کی طرح ثابت ہوئی جس کے نیچے رکھا سر کٹ تو جاتا ہے لیکن پوری طرح دھڑ سے علیحدہ نہیں ہو پاتا۔ جسم تڑپتا رہتا ہے۔ جان

دھیرے دھیرے اور نکلتے نکلتے نکلتی ہے۔ خون کے چھینٹے مرتے مرتے بھی آس پاس کی دیواروں کو محبت کی نشانی کے طور پر رنگ جاتے ہیں۔“

ربیکا نے اذیت سے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

”اف۔۔۔۔اتنی اذیت ناک محبت۔۔۔۔میڈی۔۔۔۔پھر تم اب تک زندہ کیسے ہو۔“

”محبت کی تو پھر اذیت کا ڈر کیسا مس ربی۔“

میں نے مسکرا کر ربیکا کو اس نام سے پکارا جس سے تمام کلاس اسے پکارتی تھی۔ ربیکا کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتی رہی۔

”میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔تمھارا ہر روپ نیا ہے، جانتے ہو میں اپنے سارے پرانے دوستوں اور سارہ کو ناراض کر کے تمھارے ساتھ ڈیسک پر کیوں آ بیٹھی تھی۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اس لیے کہ جس دن بلیک بورڈ پر وہ بے ہودہ نعرے لکھے دیکھے تھے۔ تب میں بہت دیر پہلے سے تمھیں دیکھ رہی تھی۔ تم نے جس اطمینان سے ان کے چیلنج کو قبول کیا اور تمھاری آنکھوں میں جو ایک عزم تھا ایسا عزم صرف ان لوگوں کے چہرے پر دکھتا ہے جو دنیا سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتے ہوں اور مجھے بچپن سے ہی بہادر اور پُرعزم لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تم مجھے پوری کلاس میں سب سے مختلف دکھائی دیے۔ اس لیے میں نے تمھارے ساتھ ہی بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہر گزرتا دن میرے اس فیصلے کو صحیح ثابت کر رہا ہے۔“

اتنے میں کامران جو بہت دیر سے ربیکا کو میرے پاس کھڑے دیکھ کر دُور سے بُرے بُرے سے منہ بنا رہا تھا، اس کا صبر جواب دے گیا اور اُس نے باقاعدہ آوازیں دے کر ہمیں بلانا شروع کر دیا۔ لگتا تھا ربیکا مزید بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ہمیں اپنی باتوں کا سلسلہ یہیں ختم کرنا پڑا اور ہم دونوں میز پر پڑی اپنی کافی کو مزید ٹھنڈا ہونے سے بچانے کے لیے اس کی طرف بڑھ گئے۔

OO

محبت اور خدا

اُس دن مولوی صاحب کی باتوں نے میرا اندر ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اپنی محبت کو پانے کے لیے مجھے جس شناخت کی ضرورت تھی وہ میں نے حاصل کر لی ہے لیکن اس دن پتہ چلا کہ مجھ سے تو میری پچھلی شناخت بھی چھن گئی ہے۔

بیچ میں ایک آدھ بار شاکر سے پرانی حویلی جا کر مل آتا تھا۔ اسی سے پتہ چلتا رہتا تھا کہ گھر میں کیا ہوتا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے شاید میری غیر موجودگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ باغیوں کو جتنی جلدی لوگوں کے دل و دماغ سے پھینک نکالا جائے۔ اتنا ہی بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کی بغاوت کے جراثیم دوسروں کے ذہنوں کو بھی متاثر کرنے لگتے ہیں۔ اور یہ بات بھلا کمشنر صاحب سے بہتر اور کون جان جا سکتا تھا۔ سو انہوں نے گھر میں میرا نام لینے پر بھی پابندی لگا دی تھی۔ کمشنر صاحب کا خیال تھا کہ میں کامران کے پاس لندن جا چکا ہوں۔ کیونکہ ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا اور میرا اتہ پتہ نہیں تھا گھر والوں کو۔ کوئٹہ کوئی اتنا بڑا شہر بھی نہیں تھا جہاں میں اتنا عرصہ کسی دوست کے گھر ان سے چھپ کر ٹھہر سکتا۔۔۔۔شاید عباد کو بھی یہی سوچ کر سکون مل گیا ہو ورنہ وہ مجھے ہر جگہ تلاش تو کر ہی چکا تھا۔ ان میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں بھی یہیں اسی شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پچھلے چار ہفتوں سے مزدوری کر رہا تھا۔

نگہت سے بھی شاکر کے ہاں ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن میں اس سے کچھ پوچھ ہی نہیں پایا۔ جب میں شاکر سے رخصت ہو کر جانے لگا تب اُس نے اکیلے جاتے دیکھ کر مجھے پیچھے سے آواز دی تھی۔ میں ٹھہر گیا۔ نگہت چپ چاپ میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ اور پھر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”یہ آپ نے کیا حالت بنالی ہے اپنی بھیا، اس محبت نے تو آپ کو برباد کر کے رکھ دیا

ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے بھیا۔ نہ مَیں آپ کو اس سے ملاتی نہ۔۔۔" آنسوؤں سے نگی کی آواز رندھ سی گئی۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ مَیں نے بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کیا کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ اگر میں اس وقت اس کے سامنے رو پڑتا تو وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔ مَیں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُسے تھپتھپایا۔

"نگی ایک بات بتاؤں؟"

نگی چُپ ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ "جی"

"تم آج بھی بچپن کی طرح روتے ہوئے بہت بُری لگتی ہو۔"

چند لمحے تو وہ حیرت سے مجھے دیکھتی رہی اور پھر جب اُسے میری اس کو چُپ کروانے کی چال سمجھ میں آئی تو روتے روتے ہنس دی۔

نگی نے مجھے بتایا کہ وہ میرے مولوی صاحب سے ملنے کے بعد دو مرتبہ ایمان کے گھر جا چکی ہے۔ مولوی صاحب اَب کافی بہتر ہیں۔ نگہت نے اُسے میرے گھر چھوڑنے اور یوں در بدر بھٹکنے کی تمام داستان سنائی تھی۔ نگہت کی باتیں سُن کر ایمان تو چپ بیٹھی حسب معمول اپنے پاؤں کے ناخن سے زمین پر بچھا قالین کریدتی رہی البتہ حیاء سے صبر نہیں ہوا اور وہ رو پڑی تھی۔ ایمان نے نگہت سے صرف اتنا کہا کہ اگر مَیں کبھی نگہت سے ملوں تو وہ مجھ سے کہے کہ مَیں اپنی یہ ضد چھوڑ کر واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔

یہ تھا اتنی صدیوں کے بعد اس دلربا کا میرے لیے ایک پیغام صرف یہی چند لفظ۔۔۔
کون جیتا ہے تیری زُلف کے سر ہونے تک۔۔۔۔

لیکن یہ لفظ بھی میرے لیے بہت تھے، چلو کسی بہانے ہی سہی۔۔۔ میرا ذکر تو اس کے لبوں پر آیا، یہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ نگہت میرے ہاتھوں کے چھالے چُھو چُھو کر دیکھتی رہی اور اس کی آنکھیں بھیگتی رہیں۔ مجھے نگہت کو بتانا پڑا کہ مَیں ریلوے اسٹیشن پر قُلی گیری کا دھندہ کرتا ہوں۔ لیکن اس سے یہ وعدہ بھی لیا کہ وہ اس بات کے بارے میں اپنے یا میرے گھر والوں کو نہیں بتائے گی۔ شاکر نے کبھی میرا پیچھا کر کے میرا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب مَیں مناسب سمجھوں گا خود اُسے بتا دوں گا۔

میں نے اپنی جیب سے وہ دو موتی نکالے جو اب تک ایمان کی غیر موجودگی میں مجھے

اس کے ہونے کا احساس دلاتے رہے تھے۔ وہی دونوں موتی جو حویلی کی سٹڈی میں ایمان سے ملاقات والے دن اس کے جانے کے بعد ملے تھے۔ اب تک مجھے جب کبھی اپنی تنہائی میں سخت تھکاوٹ میں، دن بھر کی مشقت کے بعد ٹوٹے بدن کے ساتھ ویٹنگ روم کی کسی سخت آرام کرسی پر گر کر پڑے ہوئے، جب کبھی میرا دل بہت اُداس ہوتا یا ایمان کی بہت یاد آتی تو میں ان دو موتیوں کو اپنی پلکیں بند کر کے اپنی آنکھوں پر رکھ لیتا تھا، پل بھر میں ان کی ٹھنڈک میرے بند پپوٹوں سے ہوتی ہوئی میری رُوح کی گہرائیوں تک کو چھو لیتی۔ میرے تصور میں ایمان اُتر آتی، انہی جھکی جھکی، گھبرائی ہوئی نظروں کے ساتھ، پھر وہ یونہی میرے سامنے بیٹھی رہتی اور مَیں گھنٹوں اس سے اپنے من کی باتیں کرتا رہتا۔ اور میری ساری رات انہی سپنوں میں گزر جاتی۔

یہ تصور اور خواب بھی کیسی نعمت ہوتے ہیں۔ انسان سے اگر شائد تصورات اور خواب دیکھنے کی صلاحیت چھین لی جائے تو وہ زیادہ عرصہ جی نہیں پائے گا۔ خواہشوں کی گھٹن اس کا گلا دبا دبا کر اُسے مار ڈالے گی۔ ہم اپنی نوے فیصد خواہشات اور آرزوؤں کو اپنے تصورات اور اپنے خوابوں کے ذریعے ہی تو پاتے ہیں۔

نگہت نے حیرت سے ان دو موتیوں کو دیکھا، مَیں نے اُسے ان انمول گوہر کی پوری کہانی سنائی اور وہ دونوں موتی نگہت کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔

"یہ موتی اُسے واپس دے دینا۔ اور اُس سے کہنا کہ اگر میری تقدیر میں ہوا تو ایک دن وہ خود مجھے یہ موتی واپس لا کر دے گی۔ اب جنگ میری اور زمانے کی نہیں ہے۔۔۔ اب لڑائی تقدیر سے ہے۔۔۔ دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔"

مَیں نگہت کو بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہیں کھڑی چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔ زندگی میں ہم سب پر کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے کہ جب ہم کسی سے ملنا، کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اس وقت ہمیں اپنی اس خاموش تنہائی کی اپنے آپ باتیں کرنا بھی نہیں بھاتا۔ بس ہمیں اک سکوت کی تلاش ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے ہم کچھ دیر کے لیے زمانے بھر کے سامنے ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں کوئی ہم سے کچھ نہ پوچھے، کوئی بات نہ کرے۔

اس دن نگہت سے مل کر آنے کے بعد بھی مجھ پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری تھی شاید جمعے کا دن تھا۔ ابھی ابھی کوئٹہ ایکسپریس چھوٹی تھی اور اسٹیشن سے بھیڑ رفتہ رفتہ چھٹ رہی تھی۔ مَیں چپ چاپ پلیٹ فارم کے ایک سرے سے شہتوت کے گھنے سے درخت کے نیچے بچھے لکڑی کے بینچ پر بیٹھا ہُوا اس کے پُرانے تختے پر ویسٹرن ریلوے کے کھدے ہوئے الفاظ کو غور سے دیکھ رہا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ ہماری اردگرد کی نصب ہُوئی کئی چیزوں نے جانے کتنے مہ و سال دیکھ رکھے ہوتے ہیں، جانے کیسے کیسے زمانے ان پر سے وارد ہو کر گزر چکے ہوتے ہیں۔ مثلاً اب اسی لکڑی کے بینچ کو ہی لے لیں۔ تقریباً سو سال سے انگریز کے دور سے یہ اب تک یہی نصب تھا، جانے کتنی دھوپیں، جانے کتنے سائے، جانے کتنی بارشیں اور برف باریاں اور جانے کتنی آندھیاں سہی ہوں گی اُس تنہا بینچ نے۔۔۔۔ اور جب مجھ جیسے کئی اور کم ظرف انسان اس پر بیٹھ کر بڑی بڑی شیخیاں بگھارتے ہوں گے تو یہ سب چیزیں آپس میں اشارے کر کر کے ہم کمزور اور فانی انسانوں کا کتنا مذاق اُڑاتی ہوں گی۔ سچ ہے انسان کی حیثیت ہی کیا ہے پل کی بھی تو خبر نہیں اُسے اپنی۔۔۔ پھر یہ گھمنڈ کس بات کا۔۔۔

مَیں انہی خیالات کی یلغار لیے بیٹھا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا کہ اچانک کسی کے کھنکارنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک نورانی سے چہرے والے بزرگ جو شاید سامنے لگے نل سے وضو کر کے آئے تھے، کھڑے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے، میرے متوجہ ہونے پر مسکرائے۔

''معاف کرنا میاں۔۔۔ تم شائد کسی گہری سوچ میں گم تھے، مَیں نے تمھیں چونکا دیا۔''

سچ تو یہی ہے کہ اس وقت مجھے ان کی یہ مداخلت بے حد ناگوار گزری تھی لیکن بہرحال ان کی عمر کا تقاضا یہی تھا کہ اپنی تلخی ظاہر نہ کی جائے۔ ہم انسان بھی کیسی کیسی روایات کی زنجیروں سے بندھے رہتے ہیں، کچھ سانسیں بھی اپنی مرضی کی لے نہیں پاتیں۔

''جی فرمائیے۔۔۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔''

بزرگ مسکرائے۔ ''ارے خدمت ودمت کچھ نہیں میاں۔ جمعے کا وقت ہے، سوچا آپ کو یاد دلا دوں کہ نماز کا وقت ہونے ہی والا ہے، ہو سکتا ہے آپ نے کچھ تیاری کرنی ہو۔''

''جی شکریہ۔ آپ چلیے۔۔۔ مَیں بھی کچھ دیر میں حاضر ہو جاؤں گا، مسجد اس طرف ہے۔''

مَیں نے جان چھڑانی چاہی، لیکن وہ بزرگ بھی سخت کائیاں ہی نکلے۔۔۔۔

''میاں مسجد کا راستہ یوں نہیں دکھاتے، مسافر کو مسجد کے دروازے تک چھوڑ کر آنا چاہیے۔''

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں پھر ضبط کر گیا۔

''افسوس۔۔۔۔ مَیں آپ کے ساتھ ضرور چلتا لیکن اس وقت مَیں اپنی کچھ اُلجھنوں میں پھنسا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہوں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ کسی اور کے ساتھ چلے جائیے، مَیں معذرت خواہ ہوں۔''

بزرگ نے خندہ پیشانی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔۔۔۔ مَیں خود ہی چلا جاؤں گا۔ اگر تمھیں اعتراض نہ ہو تو میں بھی کچھ دیر اس بینچ پر ستا لوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہے خطبہ شروع ہونے میں۔''

ایک بار تو جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ یہ پورا پلیٹ فارم خالی پڑا ہے۔ کہیں بھی جا کر ستانے کا شوق پورا کر لیجیے۔۔۔۔ پھر مَیں نے سوچا کہ شاید یہ بھی میری طرح تنہائی کا مارا کوئی انسان ہوگا۔ دو گھڑی بیٹھ جائے گا تو میرا کیا جائے گا۔ مَیں اور میری تنہائی تو صدیوں کے ساتھی ہیں، اور ہمارا ساتھ تو ابد تک کا ہے، ہم دونوں پھر کبھی مل لیں گے۔

مَیں نے ایک طرف ہو کر تختے پر اس بزرگ کی بیٹھنے کی جگہ بنائی۔ وہ اپنے کاندھے پر پڑی چادر سے اپنا ہاتھ منہ پونچھتے ہوئے آ کر بیٹھ گئے۔

''میرا نام رحمت اللہ ہے، لاہور جا رہا ہوں۔ وہیں کا رہنے والا ہوں یہاں پر کچھ پریس اور کچھ پبلشنگ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اس لیے دو تین ماہ میں ہفتہ دس دن کے لیے آنا پڑتا ہے۔''

جواب میں انہوں نے میری طرف اس اُمید سے دیکھا کہ اَب میں اپنا شجرۂ نسب ان کے سامنے بیان کروں، مَیں نے مختصراً بتایا۔

''میرا نام حماد ہے۔ یہاں پر قلی ہوں۔''

''ماشاء اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ ماشاء اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ محنت میں ہی عظمت ہے، تمھاری تنہائی میں مخل ہونے کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔ دراصل بہت دیر سے تمھیں یہاں بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ تمھاری پیشانی کی اس خاص چمک نے تم سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔''

''جسے آپ میری پیشانی کی خاص چمک سمجھ رہے ہیں، وہ میرے بختوں کی سیاہی ہے۔ اور کالک اور سیاہی جب حد سے زیادہ ہو جائے تو اس میں بھی ایک خاص چمک پیدا ہو جاتی ہے۔''

بزرگ حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

''سبحان اللہ ۔ ۔ ۔ میاں ۔ ۔ ۔ کیا خوب بات کہی تُم نے ۔ ۔ ۔ سیاہی کی چمک۔ واہ ۔ ۔ ۔ بہت خوب ۔ ۔ ۔ پڑھے لکھے لگتے ہو۔''

جی کچھ صفحے سیاہ کیے ہیں۔ لیکن سب رائیگاں چلا گیا۔''

''علم کبھی رائیگاں نہیں جاتا، نماز وغیرہ سے کچھ خاص شغف نہیں رکھتے شاید۔''

''میں اسے دل کا معاملہ سمجھتا ہوں، دل چاہے تو پڑھ لیتا ہوں کبھی کبھی ۔ ۔ ۔ ورنہ نہیں۔''

''سچ تو یہ ہے میاں کہ مَیں بھی بس حاضری لگانے کے لیے ہی پڑھتا ہوں۔ دل تو کہیں اور ہی اٹکا ہوتا ہے۔ کسی اور جوڑ توڑ میں، دھندے کی کسی گتھی کو سلجھانے میں۔''

''تو پھر ایسی حاضری کا فائدہ کیا ۔ ۔ ۔؟ اس سے تو میری غیر حاضری ہی بھلی۔''

''میاں حاضری تو لگانی ہی پڑتی ہے نا۔ ورنہ اگلے امتحان میں بیٹھنے ہی نہیں دیا جائے گا۔ جانتے ہو نا، حاضری کی بنیاد پر ہی امتحانی داخلہ ملتا ہے۔ کچی پکی حاضری پوری ہو گی تو ممتحن امتحان کے لیے بلائے ہ۔ ورنہ بنا امتحان لیے ہی فیل کر دیا جائے گا۔ ایک دفعہ اس ٹوٹی پھوٹی حاضری کی بنیاد پر اگلے جہاں کے امتحاں تک تو پہنچ جاؤں۔ پھر وہاں ممتحن کے آگے رو دھو کر کسی نہ کسی طرح صرف پاس ہونے تک کے 33 نمبر لینے کی کوشش کروں گا۔ ایک آدھ مضمون میں سپلی یا کمپارٹ آ بھی گئی تو کیا ہے۔ گھس گھس کر نکل ہی جائیں گے آخر۔ اس لیے حاضری ضروری ہے۔ بنیادی شرط ہے، کچی حاضری ہو یا پکی، دل کی گہرائی اور خلوص دل سے ہو یا دکھاوے اور منافقت بھری۔ لیکن یہی حاضری آگے پیش ہونے کا کام

دے گی۔ حاضری پوری ہی نہ ہوئی تو پیشی کا موقعہ ہی نہیں ملے گا اور پیشی اور سنوائی کا موقع ہی نہ ملا تو ہم تو گئے کام سے نا۔''

میں حیرت سے رحمت اللہ صاحب کی تقریر سنتا رہا۔ بہت بڑی بات انھوں نے بہت سہل زبان میں کہہ دی تھی۔ واقعی نالائق سے نالائق تر، کوڑھ مغز سے کوڑھ مغز ترین اور شریر سے شریر تر طالب علم کو بھی امتحان میں بیٹھنے کا موقع مل ہی جاتا تھا بشرطیکہ اس کی حاضریاں امتحانی معیار کے مطابق پوری ہوں۔ اب پاس فیل ہونا اُس کی قسمت اور اعمال پر تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پرچے چیک کرنے والا رحم کھا کر 33 نمبر دے ہی دے۔ لیکن جس طالب علم کی حاضری ہی پوری نہ ہوا ُسے تو امتحان لیے بنا ہی فیل تصور کیا جاتا ہے۔

''ٹھیک کہا آپ نے۔ اس حساب سے تو حاضری بڑی ضروری ہوئی۔'' رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

''نماز کی حاضری کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بڑا کٹھن ہوتا ہے پانچ وقت کی یہ روزانہ حاضری کاٹنا۔ شروع شروع میں تو مَیں بڑا تنگ ہوتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح خود کو جائے نماز پر کھڑا تو کر لیتا لیکن یہاں نیت باندھی اور وہیں ایک تیزی اور دنیا بھر کی جلدی کی ایک ایسی بے چینی سر پر سوار ہو جاتی تھی کہ جسے اگر وہ نماز پڑھنے میں مَیں نے ذرا بھر مزید دیر لگا دی تو جانے کتنے لاکھ کا گھاٹا ہو جائے گا۔ اسی تیزی میں جلد از جلد اُلٹی سیدھی رکعتیں پڑھ کر بس سلام پھیرنے کی کرتا تھا۔ جانے پوری پڑھتا بھی تھا یا آدھی نامکمل پڑھ کر ہی ختم کر دیتا تھا۔ اور ادھر سلام پھیرا اور ادھر وہ تیزی وہ بے چینی ختم۔ لگتا تھا جیسے خون میں جو اُبال آ رہا تھا وہ بس اس نماز کی وجہ سے ہی تھا۔ پھر چاہے گھنٹوں وہیں بیٹھا رہوں، کچھ نہ کروں تب بھی ویسی جلدی اور بے چینی پیدا نہ ہوتی، ہاں البتہ جیسے ہی دوسری نماز کے لیے کھڑا ہوا، وہیں وہ بھاگم بھاگ شروع۔

اور اس چند لمحے کی عجلت اور بے چینی بھری نماز کے درمیان بھی ہر لمحہ کسی عورت، کسی دھندے کسی کمائی کا سودا ہی ذہن میں سمایا رہتا۔ کبھی کبھی تو دل اس زور سے دھڑکتا تھا جیسے اگر مَیں نے فوراً پل میں نماز پڑھ کر سلام نہ پھیرا تو یہ کم بخت دل سینے سے ہی باہر نکل آ گرے گا۔''

میں حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ عام طور پر لوگ ایسی باتیں کسی کے سامنے اس لیے بھی نہیں کرتے کہ کہیں ان کے مذہب پر لوگ شک نہ کرنے لگیں۔ لیکن یہ بزرگ تو بڑے مزے سے اپنی جھوٹی سچی نمازوں کی داستان سنائے جارہے تھے۔

''تمھیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔۔۔ جس مسجد میں میں نماز پڑھنے جاتا تھا اس کے سامنے کی کھڑکی باہر بازار کی طرف کھلتی تھی۔ میں اگر خوش قسمتی سے کبھی پہلی صف تک پہنچ بھی جاتا تو پوری نماز کے دوران میری نظریں باہر بازار کی گلی میں بھٹکتی رہتی تھیں۔ دراصل شروع شروع میں نماز میرے لیے بڑا اُکتا دینے والا کام تھا۔ وہ کیا کہتے ہیں اسے ''بورنگ (Boring)'' ہاں۔۔۔ بڑا بورنگ کام تھا۔ اس لیے میری نظر خود بخود کھڑکی سے باہر اُٹھ جاتی تھیں۔ اور سچ بتاؤں رمضان میں بھی دوست کھینچ کھانچ کر تراویح کے لیے لے جاتے تو تب یہ کھڑکیاں میرے بڑے کام آتی تھیں۔ تراویح کی لمبی لمبی رکعتیں بڑے مزے سے گزر جاتیں۔''

رحمت اللہ صاحب یہ بتاتے ہوئے ہنس پڑے۔ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی میں نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا۔

''اور اب۔۔۔؟۔۔۔ اب کیا محسوس ہوتا ہے۔''

''اب لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ کچھ ٹھہراؤ آتا جارہا ہے۔ لیکن ہم کیا اور کیا ہماری نمازیں میاں۔۔۔ سب دکھاوا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ

''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔۔۔''

''مذہب میں کاملیت کروڑوں میں سے کسی ایک کو نصیب ہوتی ہے۔ ہم جیسے تو یونہی رُل رُلا کر بس اپنی نیت کے طفیل ہی یہ دریا پار کر لیتے ہیں۔ یا پھر کسی کی دی ہوئی کوئی دُعا کام آ جاتی ہے۔ منزل نہ سہی، کوئی سنگ میل ہی سہی۔۔۔ منزل سب کے نصیب میں کہاں ہوتی ہے، ہم تو ذہن میں پہلا پڑاؤ پہلا سنگِ میل رکھ کر ہی چلتے ہیں۔ جانے اُس تک بھی اس مختصر زندگی میں پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ اپنا فرض تو بس قدم بڑھانا ہی ہے۔''

میں رحمت اللہ صاحب کی باتیں بڑے غور لیکن دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا۔ میں آج تک مذہب کو بہت مشکل اور بڑا کٹھن کام سمجھتا تھا۔ لیکن رحمت اللہ کی باتوں سے لگ رہا تھا

کہ یہ تو بہت سہل ہے۔ بس نیت کا کھیل ہے۔

اتنے میں جمعے کی اذان شروع ہوگئی۔ میں بے اختیاری میں ہی رحمت اللہ صاحب کے ساتھ باتیں کرتا ہوا مسجد تک جا پہنچا۔ اب یوں گیٹ سے پلٹنا مجھے کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ رحمت اللہ نے دوبارہ حالانکہ مجھ سے نماز پڑھنے کا ذکر تک بھی نہیں کیا تھا۔ میں بھی دوسرے نمازیوں کے ساتھ وضو کر کے نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔

شاید اس دن وہ میری زندگی کا پہلا سجدہ تھا جو میں نے بنا کسی خوف اور کسی جلدی، بنا کسی بے زاری اور بنا کسی مطلب اور لالچ کے ادا کیا تھا۔

اس دن مجھے پہلی بار مذہب سے ڈر نہیں لگا۔ کوئی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اس لیے میرے اس پہلے سجدے میں بڑا اطمینان تھا طمانیت تھی اور سکون تھا۔

میں نماز پڑھ کر اسٹیشن سے ملحق مسجد کے باہر ہی کھڑا رحمت اللہ صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ جلد ہی وہ بھی نکل آئے اور ہم دونوں واپس پلیٹ فارم پر آ گئے۔ وہاں سپیکر پر اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی کہ لاہور جانے والی گاڑی کسی فنی خرابی کی وجہ سے تین گھنٹے دیر سے جائے گی۔ رحمت اللہ صاحب مسکرائے۔

''لو بھئی۔۔۔ شاید قدرت کو میرا تمھارا ساتھ کچھ دیر کے لیے مزید منظور تھا۔ تم اگر بُرا نہ مانو تو میں یہیں تمھارے پسندیدہ بینچ پر اپنی گاڑی کا انتظار کرلوں۔''

میں شرمندہ سا ہوگیا، شاید انہیں نماز سے پہلے والا میرا لہجہ اور رویہ یاد تھا۔ میں نے ان سے اپنے پچھلے سلوک کی معذرت چاہی۔ وہ مسکرا دیے۔

''ارے میاں معذرت کیسی۔۔۔ ہر بندے کا اپنی تنہائی پر مکمل اختیار اور مکمل حق ہوتا ہے۔ معذرت تو مجھے پیش کرنی چاہیے۔۔۔ بہر حال بھئی تمھیں لگی ہو یا نہ لگی ہو۔ پر مجھے تو شدید بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ پیٹ پوجا ہونی چاہیے۔''

انہوں نے اپنے سامان میں سے ایک لوہے کا خوبصورت سا چھوٹا ٹفن کیریئر نکالا اور میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے بھی کھانے میں شریک رکھا۔ سادہ سی آلو ساگ کی سبزی، تھوڑا سا اچار اور چند پراٹھے۔ انہوں نے بڑے شوق سے کھانا کھایا، پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ مجھے بے رغبتی سے نوالے ٹونگتے دیکھ کر انہوں نے مجھے نصیحت کی۔

''دیکھو حماد میاں ۔۔۔۔ چاہے جتنے بھی مصروف کیوں نہ ہو، کھانا کھانے کے لیے وقت ضرور نکالا کرو۔ ہم اپنی زندگی کی ساری جدوجہد کس لیے کرتے ہیں۔ اسی دو وقت کی روٹی کے لیے ہی نا۔ یہ روٹی کا چکر ہی نہ ہوتا تو سبھی ہمہ وقت مسجدوں میں سجدے میں ہی نہ پڑے رہتے۔ لیکن ہمیں رزق تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چاہے چند نوالے ہی کھاؤ لیکن عبادت کی طرح خلوص سے کھاؤ اور اس نیت سے کھاؤ کہ اس کے بعد تم خدا کا شکر ادا کر سکو گے۔ بلکہ صرف کھانے پر ہی کیا منحصر ہے۔ زندگی میں اس کی دی ہوئی ہر نعمت کو اس طرح برتو کہ یہ اس مالک کا احسان ہے اور اس نیت سے اس نعمت کا فائدہ اُٹھاؤ کہ یہ اس مالک کے شکر ادا کرنے کا ایک اور بہانہ ہے جو اُس نے تمھیں فراہم کیا ہے۔''

مجھے اس نورانی چہرے والے بوڑھے کی باتیں سن سن کر حیرت ہو رہی تھی۔ مَیں نے تو زندگی کبھی اس زاویے سے نہیں گزاری تھی۔ مَیں اپنے استعمال کی ہر چیز کھانے پینے، سواری، آرام اور تعیش کی چیزوں اور لمحات کو اپنا اور اپنی محنت کا حق سمجھتا تھا۔ اپنے بڑوں کی دین سمجھتا تھا۔ بڑوں کی کمائی سمجھتا تھا۔ نعمت اور شکر کا تصور تو میرے دل میں کہیں دُور دُور تک نہ تھا۔

میں نے کچھ دبے سے لہجے میں رحمت اللہ صاحب سے پوچھا۔

''کیا آپ تبلیغی ہیں۔۔۔؟''

وہ میری بات سن کر زور سے ہنس پڑے۔

''خوب۔۔۔ تو تم اتنی دیر سے میری باتوں کو تبلیغ سمجھ رہے ہو۔۔۔ بڑے بھولے ہو میاں۔۔۔ مَیں کہاں اور تبلیغ کہاں۔ میں تو ایک وقت کی بھوک بھی برداشت نہیں کر سکتا، تبلیغ کے لیے تو پورا اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ تب جا کر کہیں آپ کو یہ حق ملتا ہے کہ آپ دوسروں کو کچھ نصیحت کریں، کچھ سکھائیں، کیونکہ پہلی شرط یہ ہے کہ آپ خود وہ کریں جو دوسروں کو کہتے ہیں اور یہ بڑا مشکل کام ہے۔''

اتنے میں رحمت اللہ صاحب کی گاڑی کا وقت ہو چلا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی اور اب اس کا سائرن بھی وقفے وقفے سے بجنا شروع ہو گیا تھا۔ مَیں نے ان کا سامان سمیٹنے میں ان کی مدد کی اور ان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود ان کا سوٹ کیس اُٹھا کر انہیں ڈبے تک چھوڑنے آیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئے جو کھڑکی کے ساتھ ہی تھی تو میں اُتر کر پلیٹ فارم

پر ان کی کھڑکی کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھٹکا لیا۔ انہوں نے سر باہر نکال کر میرے ماتھے کا الوداعی بوسہ لیا اور بولے۔

''مجھے لگتا ہے کہ تمھیں کسی چیز کی تلاش ہے۔ وہ طلب اور اس چیز کی شدت کی چاہت تمھاری آنکھوں سے ہر لمحہ ٹپکتی ہے۔ لیکن کہیں نہ کہیں تم یہ سمجھ رہے ہو کہ مذہب تمھارے راستے کی رکاوٹ ہے۔ لیکن یاد رکھو حماد میاں۔۔۔ مذہب تب تک ہی رکاوٹ لگتا ہے اور اس سے خوف محسوس ہوتا ہے جب تک آپ اس سے دُور رہتے ہیں۔ قریب جانے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت بے ضرر اور بہت دوست نما کوئی چیز ہے۔ مذہب سے دُور نہ رہنا۔۔۔ اسے اپنا دوست بنا لینا۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ آباد رہو۔''

ٹرین نے دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع کر دیا تھا، میں اس کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم کی آخری حد تک چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ عجیب نورانی بزرگ ہاتھ ہلاتے ہلاتے ٹرین سمیت میری نظروں سے اوجھل ہوتا گیا۔ جو جاتے جاتے مجھے زندگی کے بہت زاویے بس ایک ہی ملاقات میں بتا گیا تھا۔

OO

ہالوکاسٹ

آخر کئی دنوں کی کوشش کے بعد مجھے جوزف سے تنہائی میں اس موضوع پر بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ ہالوکاسٹ کا نظریہ کیا ہے۔ جوزف میری بات سنتے ہی ایک دم خوف زدہ سا ہو گیا جیسے میں نے کوئی بہت ہی انہونی چیز پوچھ لی ہو۔ وہ سرگوشی میں یوں بولا جیسے ہم بہت بڑے ہجوم کے درمیان بیٹھے ہوں حالانکہ وہاں نہر کے آس پاس دُور دُور تک، ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''اس جگہ ایسی کوئی بات کسی سے پوچھنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ یہ موضوع یہاں پر ممنوعہ ہے۔''

میں نے حیرت سے جوزف کے اس پُراسرار انداز کی طرف دیکھا۔

''کیوں۔۔۔ ایسی کیا بات ہے اس موضوع میں۔۔۔ اور پھر سارہ نے اس دن اس نظریے کے حق میں اپنی تقریر کے دوران اتنے زیادہ دلائل بھی تو دیے تھے۔ پھر یہ سب ممنوعہ کیسے ہو گیا۔''

سارہ ایک یہودی لڑکی ہے اور اس کے تمام دلائل ہالوکاسٹ کے حق میں تھے۔ میں اس نظریے کے مخالف دلائل کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم اس نظریے کی حقیقت جان کر اس پر دوسروں سے بحث ضرور کرو گے جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔''

''کیوں۔۔۔ کیا تم بھی اس نظریے کے مخالف ہو۔''

''ہاں۔۔۔ میں کیا ایک دُنیا اس مفروضے کی حقیقت سے انکاری ہے۔ لیکن ان یہودیوں کے لیے یہ اس قدر مقدس نظریہ ہے کہ وہ کسی کا اس کے خلاف بولنا تو دور، سوچنا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اور ایسی کوئی بھی بات کرنے والوں کی زبان بند کرنا انہیں خوب آتا

ہے۔ اسے یا تو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے یا پھر ملک بدر اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ بلکہ اب تو انہوں نے باقاعدہ ایک قانون بنا لیا ہے جس کے ذریعے انہوں نے اس موضوع کی مخالفت پر پابندی لگا دی ہے باقاعدہ طور پر۔''

مَیں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

''اس جدید دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کسی کی سوچ، کسی کی زبان پر پہرے لگا دیں۔۔۔؟ اور پھر یہ لوگ تو آزادیٔ اظہارِ رائے کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ یہ آزادیٔ رائے اس وقت کیوں یاد نہیں آئی انہیں جب یہ لوگ ایسا کوئی جبری قانون بنا رہے تھے۔''

جوزف نے جلدی سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے آواز دھیمی رکھنے کا مشورہ دیا۔

''یہ تمام ڈھنڈورے دوسری قوموں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ شاید تم یہ نہیں جانتے کہ تمھاری اس دن ہال میں کی گئی تقریر نے جانے کتنوں کی نیند اُڑا دی ہو گی۔ یہ اس یونیورسٹی کے ایک سو تیس سالہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ کوئی اسٹیج پر آ کر باقاعدہ انہیں سچے لفظوں کے تازیانے لگا کر چلا گیا ہے۔ یہ لوگ ایسی جرأت کو بھولتے نہیں۔۔۔ نا ہی پسند کرتے ہیں۔''

مَیں نے جھلا کر کہا۔

''یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ۔۔۔ آخر یہ لوگ ہیں کون۔۔۔؟ اگر ان میں اتنی ہمت ہے تو سامنے آ کر بات کیوں نہیں کرتے۔۔۔ آخر یہ ہالوکاسٹ ہے کیا بلا۔۔۔؟''

جوزف نے ایک لمبی سی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مَیں کچھ جانے بغیر یہاں سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ وہ دبی دبی سی آواز میں مجھے بتانے لگا۔

''یہودیوں نے اپنے اوپر ہونے والے نام نہاد مظالم کو سب سے زیادہ جرمنی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے جرمنوں پر 1298ء میں جرمن نائٹ رنڈفلیش کی سرکردگی میں جرمنی میں موجود ایک سو چھیالیس یہودی بستیوں میں قتلِ عام کا الزام لگایا گیا۔ 1336ء میں دو سو یہودی بستیوں کو تباہ کرنے کا پروپیگنڈہ کیا گیا۔ لیکن سب الزاموں سے بڑھ کر الزام یہودی لیڈر ڈیوڈ بن گورین نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہٹلر پر لگایا کہ

اُس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران پچاس لاکھ سے زائد یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ختم کروایا تھا۔ کچھ لوگ یہ تعداد 60 لاکھ تک بتاتے ہیں۔ اور یہودی اسی عظیم الشان اموات کے نظریہ کو ہالوکاسٹ کہتے ہیں۔"

مَیں نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا۔

"لیکن اتنی بڑی تعداد میں اگر یہودی مارے گئے ہوں گے تو ان کی موت کا کوئی ثبوت بھی تو ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم اور ہٹلر کا دَور تو ابھی کل ہی کی بات ہے۔"

"کوئی ثبوت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ثبوت ڈھونڈنے والوں اور اس نظریے کے خلاف جانے والوں کو سزائیں دی جاتی ہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی آسٹریا کی ایک عدالت نے تاریخ کے ایک استاد پروفیسر ڈیوڈ ارونگ کو تین سال کی سزائے قید سنائی ہے۔ صرف اس جرم میں کہ اُس نے ہالوکاسٹ کے دوران یہودیوں کے قتل عام کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔"

"حیرت ہے لیکن یہودی اس پروپیگنڈے کے ذریعے کون سے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

"اپنی قوم اور اپنی نئی نسل کے لیے ایک الگ اور آزاد سلطنت، برطانیہ اور امریکہ نے یہودی رہنماؤں کو دوسری جنگ عظیم کے دوران یقین دلایا تھا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد یہودی سلطنت قائم کر دی جائے گی اور یہ ریاست فلسطین کی مقدس سرزمین پر قائم ہوگی۔ روس نے بھی اس معاملے میں یہودیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔"

جوزف نے مجھے رچرڈ ہارورڈ (Richard Harward) کی کتاب "کیا واقعی 60 لاکھ یہودی مارے گئے۔" فرنچ رائٹر پال راسی نیر کی کتاب "یورپی یہودیوں کا ڈراما" امریکی مصنف ڈیوڈ ہوگن کی تصنیف "مسلط شدہ جنگ" اور ایسی بہت سی دوسری کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیا۔ میرے لیے واقعی یہ ایک بہت ہی حیرت انگیز بات تھی۔ میں نے اسی دن شہر کی مختلف گمنام لائبریریوں سے یہ تمام کتابیں منگوالیں کیونکہ شہر کی بڑی لائبریریوں میں ان کتابوں کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے میں ان کتابوں کو پڑھتا گیا۔ نت نئے راز میرے اندر وا ہوتے چلے گئے۔ پتہ یہ چلا کہ ہالوکاسٹ کا یہ پروپیگنڈہ تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ جرمنی سے تمام اتحادی افواج خائف تھیں، یہودیوں نے جو اس

وقت جرمنی میں اسلحہ سازی کی صنعت پر چھائے ہوئے تھے، اتحادی افواج اور امریکہ کا درپردہ ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا اس شرط پر کہ جنگ عظیم دوئم کے بعد انہیں آزاد ریاست بنانے کی اجازت دے دی جائے۔

جرمن یہودی سازشوں کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم ہار گئے، ہالوکاسٹ کے واویلے سے یہودیوں نے پورا فائدہ اُٹھایا اور فلسطین تک ان کی بستیوں کی رسائی میں اتحادی ملکوں نے پوری مدد کی۔ اور رفتہ رفتہ ہالوکاسٹ کے موضوع کو ہی مقدس گائے بنا دیا گیا تاکہ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہ بولے اور نہ ہی تحقیق کی نوبت آئے۔ مجھے ان سب کتابوں سے بس ایک ہی حقیقت کا واضح اشارہ ملا کہ۔۔۔۔ "یہودی دراصل سازش کا دوسرا نام ہے۔"

اب مجھے کسی ایسے موقع کا انتظار تھا جب مَیں ان یہودیوں کے اس غرور کو توڑ سکوں۔ کامران نے میرے آگے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے کہ مَیں ان چکروں میں نہ پڑوں۔ اسے مجھ سے زیادہ سارہ کی فکر تھی کہ وہ میرے دوست کامران کے بارے میں کیا سوچے گی جب کہ ابھی تک سارہ کامران کے نام اور شکل سے بھی واقف نہیں تھی۔

اور پھر ایک ہی ہفتے کے دوران مجھے وہ موقع مل ہی گیا۔ ہیومینیٹرنگ کی کلاس میں سر آئزک نے ہم سب کو مختلف موضوعات پر ٹرم پیپر لکھنے کے لیے کہا، موضوع کی کوئی قید نہیں تھی لیکن موضوع پہلے بتانا ضروری تھا کیونکہ اسے طالب علم کے نام کے ساتھ نوٹس بورڈ پر چپکانا ضروری تھا۔ جس دن نوٹس بورڈ پر وہ فہرست لگائی گئی جس کے اندر موضوعات بھی واضح کیے گئے تھے اس دن سب لوگ میرے نام کے سامنے مضمون کی فہرست میں "ہالوکاسٹ" کا عنوان دیکھ کر ہی سراسیمہ ہوگئے۔ چند لمحوں میں ہی پوری یونیورسٹی میں سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں کا ایک ریلا سا بہہ نکلا۔ میں لائبریری سے نکل رہا تھا کہ پریشان سی ربیکا اپنے کٹے بال جھلاتی جانے کہاں سے آنکلی اور بنا کچھ کہے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی مجھے راہداری کے ایک سنسان گوشے کی طرف لے گئی۔

"میڈی۔۔۔ تم اپنے ہوش وحواس میں تو ہو۔۔۔؟"

"کیوں۔۔۔ مَیں نے ایسا کیا کام کیا ہے کہ تمھیں یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔"

"تم نے ہالوکاسٹ پر ٹرم پیپر لکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ یونیورسٹی یہودیوں کی ہے اور اس کی تمام انتظامیہ یہودی ہے۔ پلیز میڈی۔۔۔ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لو۔۔۔ دیکھو مَیں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

اُس نے واقعی اپنے گورے گورے سے ہاتھ میرے آگے جوڑ دیے۔ مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

"کچھ نہیں ہوگا، تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اگر یہ لوگ دوسری قوموں اور مذاہب کا مذاق اُڑاتے ہیں اور انہیں خود سے کم تر سمجھتے ہیں تو انہیں بھی آئینہ دکھانے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔"

"اوہ میڈی۔۔۔ تم نہیں جانتے مَیں تمہارے لیے کتنی پریشان ہوں۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔" وہ بولتے بولتے چُپ ہو گئی۔ مَیں نے چونک کر اُس بظاہر لااُبالی سی لڑکی کو دیکھا۔ اس لمحے اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آ کر گزر گئے۔ مجھے لگا دُور کہیں پھر سے محبت کی راج ہنسی پر پھیلا رہی ہے۔۔۔

OO

سنگِ دِل

مَیں بنیادی طور پر مذہب کو انسان کا بے حد ذاتی فعل سمجھتا تھا۔ اس دن ٹرین والے بزرگ رحمت اللہ سے ہوئی ایک ملاقات نے میرے اندر سے مذہب کا بہت سارا خوف نکال دیا تھا۔ مجھے لگنے لگا کہ مذہب کو دوسروں کے ساتھ ڈسکس بھی کیا جا سکتا ہے اور اس پر بحث بھی ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی بُرائی بھی نہیں ہے۔

جانے انہیں کیسے پتہ چل گیا تھا کہ مَیں اپنی چاہت کے راستے میں اپنے مذہب کو حائل سمجھتا ہوں۔ یہ کیسا عجیب بزرگ تھا جو پل بھر میں میری روح تک کھنگال کر اسے جھنجھوڑ گیا تھا۔ بہرحال اب مجھے میرا راستہ نظر آنے لگا تھا۔

درمیان میں ایک دفعہ شاکر کی طرف گیا تو پتہ چلا کہ وہ کمشنر صاحب کو لے کر اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ الیکشن قریب آ رہے تھے اور اب بابا کی بڑے گھروں کی یاترا بھی بڑھنے لگی ہوگی۔ نگہت نے بتایا کہ وہ دونوں موتی ایمان کو دے آئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ ایمان بہت دیر تک وہ دونوں موتی ہاتھوں میں لیے گم سم سی بیٹھی رہی تھی۔ اس نے نگہت سے پھر یہی درخواست کی تھی کہ وہ مجھے سمجھائے کہ میری ضد کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا لہٰذا میں یہ تیاگ ترک کر کے واپس اپنے گھر چلا جاؤں۔ نگہت اس سے اُلجھ پڑی تھی کہ جب اسے میری کوئی فکر ہی نہیں ہے تو پھر میری دربدری اور میری خواری کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک دے۔ اسے خواہ مخواہ خود کو مجرم سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو بھی کر رہا ہوں اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے کر رہا ہوں، ایمان کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نگہت کی یہ سخت جوابی سن کر وہ زہرہ جبیں ایمان کس قدر آزردہ ہوئی ہوگی۔ مَیں یہ سوچ کر دکھی ہو گیا۔ لیکن نگہت نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ چپ بھی رہتی تب بھی حیا ضرور اپنی بہن سے اُلجھ پڑتی۔ نگہت کو خود بھی اس بات پر حیرت تھی کہ جانے کیوں حیا کو مجھ پر اور میری ایمان

سے محبت پر بے انتہا یقین تھا۔ اور وہ مجھے ایمان کے معاملے میں ذرا بھی قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے اس انجانی لڑکی پر اس لمحے بے حد پیار آیا۔ چلو۔۔۔ کوئی تو تھا اس گھر میں جو کھلے عام نہ سہی چھپ کر ہی اس نازنین کے سامنے تنہائی میں میری وکالت کرتا تھا، کہتے ہیں مستقل طور پر اگر پانی کا ایک قطرہ بھی کسی سنگ سخت پر پڑتا رہے تو وہ بھی پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے۔ دیکھتے ہیں۔۔۔ اس پتھر دل کا دل کب پگھلتا ہے۔

مَیں جانتا تھا کہ ایمان کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا ہے جن لڑکیوں کے دلوں کے ہر کواڑ کی چابی ان کے ماں باپ کے پاس ہوتی ہے۔ ان کی ہر پسند ناپسند اپنے بزرگوں کی پسند سے مشروط ہوتی ہے، ان کے دلوں کا ہر راستہ ان کے باپ کی بیٹھک سے ہو کر گزرتا ہے۔ وہ بیٹھک جہاں سے آگے بڑھنے کی اجازت ملنے پر ہی وہ اپنے دل کا دروازہ کسی اجنبی کے لیے کھولتی ہیں۔ ورنہ یہ دروازے یہ کواڑ ساری عمر بند ہی رہتے ہیں۔ آپ لاکھ سر پٹخیں، ماتھے کو ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لیں پر وہ بہری بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ ان تک رسائی ناممکن ہوتی ہے۔ پرستان کی ان پریوں کی شہزادی کی طرح کہ جس کے محل کے دروازے پر کوئی اژدھا، کوئی دیو یا کوئی جن پہرہ دینے کے لیے ہمہ وقت موجود ہی رہتا ہے۔

لیکن مجھے جانے کیوں اپنی محبت کی طاقت پر کبھی شک نہیں رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ میرے پاس اب جینے کے لیے اس محبت اور اس کی طاقت پر بھروسہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ بھرم بھی ٹوٹ جاتا تو شاید میں اسی پل خود بھی مر جاتا۔ اب میری زندگی کا مقصد ہی اس پتھر کی دیوار سے تاعمر سر ٹکرانا تھا۔ بنا کسی تیشے اور اوزار کے صرف اپنے خالی ہاتھوں اور کمزور ناخنوں کی مدد سے اس پہاڑ کو ادھیڑ کر ایک نہر کھودنا تھا۔ میرے ناخن تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے، چھل چکے تھے، ہاتھ لہولہان تھے اور پتھر کا پہاڑ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی جگہ ویسے ہی قائم تھا۔ لیکن میرا حوصلہ ابھی جوان تھا۔ میری ہمت میرے ساتھ تھی۔ سو میں بھی اپنی رفتار کے ساتھ کسی نہ کسی صورت مشقت جاری رکھے ہوا تھا۔ بس شرط سانسوں کی تھی۔۔۔ وہ جب تک ساتھ دیتیں۔۔۔ مَیں رُکنے والا نہیں تھا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس راستے میں مجھے جو بھی لوگ ملتے گئے انہوں نے کسی نہ کسی طور میری مدد ہی کی تھی۔ میرا راستہ سہل ہی کیا تھا۔ شاکر، نگہت، صدیقی صاحب، غفورا اور اب

یہ صوفی رحمت اللہ۔۔۔ سبھی نے میری ہمت کسی نہ کسی طرح سے بڑھائی ہی تھی۔

رحمت اللہ صاحب نے تو ایک نیا ہی راستہ دکھا دیا تھا۔ اور میں نے اب اسی راستے پر چلنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگر مولوی صاحب کی نظر میں مذہب ہی میری کمی اور میری خامی تھی تو میں نے اب تک اس کمی کو اس خامی کو دُور کرنے کی کوشش بھی تو نہیں کی تھی۔ لوگ مذہب سے محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف جاتے ہیں تو کیا ہوا اگر میں اپنی محبت کی وجہ سے مذہب کی طرف قدم بڑھا لوں۔۔۔؟ رحمت اللہ صاحب نے کہا تھا کہ لاکھوں کروڑوں میں کوئی ایک کامل دین ہوتا ہے۔ تو پھر مَیں بھی اگر ان ہزاروں نو سیکھیوں کے ساتھ مل جاؤں تو اس میں کیا بُرائی ہے؟ مانا کہ یہ سب مَیں اس وقت ایمان کو پانے کے لیے ہی کرتا لیکن اپنی محبت کو ہار دینے اور ہتھیار ڈال دینے سے تو پھر بھی یہ کہیں بہتر تھا۔ دل میں کوئی خلش تو نہیں باقی رہتی کہ کاش یہ بھی کر کے دیکھ لیتے۔

وہ جاتی گرمیوں کے دن تھے اور ستمبر کا مہینہ اور خزاں سر پر تھی۔ مَیں نے اسٹیشن کے چائے والے لڑکے کو کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے صبح ساڑھے چار بجے جگا دے۔ وہ رات کی شفٹ میں اسٹیشن پر پھیری لگا کر ایک مخصوص لوہے کے چکر میں شیشے کے گلاس پھنسائے ان پر ایک لوہے کی پتری گھما کر آواز نکال کر چائے بیچتا تھا۔ اور مجھ سے خاصی دوستی ہو گئی تھی اس کی۔ بابر نام تھا اس کا، بابر نے مجھے ٹھیک ساڑھے چار بجے۔ ”چائے گرم“ کے نعرے کے ساتھ ہی اٹھا دیا۔ بہت دنوں سے میں نے بیڈ ٹی نہیں پی تھی، سو اس نے آج یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ البتہ یہ بیڈ ٹی نہیں بلکہ بینچ ٹی تھی کیونکہ ویٹنگ روم میں پڑے وہ لکڑی کے تختے ہی اب میرا بستر تھے۔ چائے پی کر مَیں جلدی سے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا اور باہر نکلتے نکلتے اسٹیشن کے نل سے منہ پر پانی کے دو چار چھینٹے بھی مار لیے۔ باہر اکا دکا تانگے موجود تھے جو مٹی کے تیل والی بڑی بڑی لالٹینیں اپنے تانگوں پر لٹکائے صبح کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مَیں نے وہیں سے خیرو تانگے والے کو آواز لگائی۔ خیرو تانگہ ہانکتا ہوا قریب آ گیا۔

”خیر تو ہے بابو نمبر 137۔۔۔ اتنی صبح سویرے کہاں کا ارادہ ہے۔“

وہ ہمیشہ مجھے بابو نمبر 137 ہی کہہ کر پکارتا تھا۔ مَیں نے اُسے پُرانے محلے چلنے کا کہا۔ اس نے تانگہ آگے ہانک دیا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ کوئٹہ سو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم

ٹھنڈی سڑک سے ہوتے ہوئے پُرانے محلے کے گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ مسجد کے قریب پہنچ کر مَیں نے خیرو کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ خیرو نے تانگہ ایک طرف لگایا اور حسبِ معمول اپنے تانگے کے ساتھ لٹکے ہوئے پُرانے سنگل بینڈ کے ریڈیو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ کبھی کبھی مجھے ان تانگے والے، رکشہ والوں اور ٹیکسی چلانے والوں کی اس مخصوص عادت پر بہت حیرت ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو جائے، زمانہ ادھر کا ادھر ہو جائے پر یہ لوگ خبریں ضرور سنتے اور بعد میں آپس میں بیٹھ کر اس پر تبصرے کرتے جیسے وہ کوئی تانگہ یا رکشہ اسٹینڈ پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ جیسے کسی اسمبلی کے رکن ہوں اور اگر وہ تبصرہ نہ کریں یا خبریں نہ سنیں گے تو جیسے ملک کا بے حد بڑا نقصان ہو جائے گا۔ اور اس کے برعکس عام طور پر اسمبلیوں تک پہنچنے والے اسمبلی میں اس رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے جس کی توقع ہم ان تانگہ بانوں سے کر سکتے تھے۔

مَیں خیرو کو وہیں خبروں کی تلاش میں ریڈیو کی سوئی گھماتا چھوڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا۔ مسجد ابھی تقریباً خالی ہی تھی، اکا دکا نمازی آنے لگے اور پھر جماعت کے وقت مولوی علیم مسجد میں داخل ہوئے اور سیدھے امام کی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ دو رکعت نماز پڑھا کر انہوں نے سلام پھیرا اور پھر دُعا کے لیے مقتدیوں کی طرف پلٹے۔ جیسے ہی انہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ لمحے بھر کے لیے تو وہ جیسے سُن ہی ہو کر رہ گئے۔ پھر انہیں جیسے کچھ خیال آیا اور انہوں نے دُعا ختم کی۔ سب نمازی ایک ایک کر کے مسجد سے نکل آئے۔ میں بھی مولوی علیم سے بنا کسی بات کے باہر آیا اور خیرو کو واپس اسٹیشن چلنے کے لیے کہا۔ خیرو نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''کیا بات ہے بابو۔۔۔۔ صرف نماج پڑھنے اتنی دُور تک آئے تھے۔۔۔ کیا کوئی منت وغیرہ مانی ہے۔''

''یہی سمجھ لو۔''

خیرو نے تانگہ آگے بڑھا دیا۔ سچ ہے محبت بھی تو ایک منت کی طرح ہی ہوتی ہے۔ بلکہ محبت سے بڑی منت اور بھلا کوئی دوسری منت کیا ہوگی۔

اس دن کے بعد سے مَیں نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ مَیں ہر روز صبح فجر اور پھر عشاء کی

نماز کے لیے اسی مسجد میں جاتا جہاں مولوی صاحب جماعت کرواتے تھے۔ بیچ میں ظہر، عصر اور مغرب کا وقت اسٹیشن پر ڈیوٹی کے دوران ہو جاتا تھا لہٰذا یہ نمازیں مجھے اسٹیشن پر ہی ادا کرنی پڑتی تھیں۔

مَیں نماز پڑھنے کو ہمیشہ سے ایک بے حد ذاتی فعل سمجھتا رہا ہوں۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے اپنی تنہا نماز کسی کے سامنے پڑھنے سے اس کی حرمت اور اس کی عظمت متاثر ہوتی تھی۔ جیسے کچھ دکھاوے کا پہلو نمایاں ہو رہا ہو شاید اسی لیے اسٹیشن پر کبھی کسی نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔

عبداللہ نے بھی مجھے فجر اور عشاء کی نمازوں پر وہاں آتے جاتے دیکھا لیکن وہ بھی ایک عجیب جوانِ رعنا تھا۔ جب بھی مجھ سے ملا، بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ مَیں نے کبھی اس کے چہرے پر کسی قسم کا رنج، غصہ یا تناؤ نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ میں یوں اس مسجد میں آ کر مولوی صاحب سے روزانہ ایک سرد جنگ لڑ رہا ہوں۔ جس کی کڑواہٹ روز بروز مولوی صاحب کے چہرے پر بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

عشاء کے بعد مولوی صاحب کا معمول تھا کہ وہ کسی بھی مسئلے یا حدیث کو لے کر پندرہ منٹ کا ایک درس دیتے تھے جسے سننے کے لیے چند نمازی پیچھے رُک جاتے تھے۔ جن میں اب میں بھی باقاعدگی سے شامل ہوتا تھا۔ عبداللہ بھی ضرور اس درس میں شامل ہوتا تھا بلکہ حدیث یا تفسیر کی کتاب طاق پر سے اُٹھا کر لانے اور واپس رکھنے کی ڈیوٹی بھی عبداللہ کی ہی تھی۔

لیکن شائد مولوی صاحب نے بھی یہ طے ہی کر لیا تھا کہ وہ اپنے طور پر مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ مَیں سلام کرتا تو جواب دیتے اور پھر وہی لاتعلقی۔۔۔۔ ان جیسے شریف اور وضع دار شخص سے کچھ ایسی ہی توقع کی جا سکتی تھی۔ میری فجر اور نماز عشاء کا یہ سفر جاری تھا۔ کبھی کبھار کوئی نمازی درس کے دوران کوئی مسئلہ کوئی سوال بھی پوچھ لیتا تھا جس کا مولوی صاحب کبھی تفصیل اور کبھی تخصیر کے ساتھ جواب دیتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ایک نمازی نے مولوی صاحب سے چھ کلمے سنانے کی اور انہیں یاد کرانے کی فرمائش کی۔ مولوی صاحب نے پہلے اس سے پوچھا کہ اسے اس وقت کتنے کلمے زبانی یاد ہیں۔ اُس شخص نے کہا

دو۔ مولوی صاحب نے وہ دو کلمے اس سے سُنے اور پھر تیسرا کلمہ اُسے یاد کروایا۔ میں بھی وہیں بیٹھا دل ہی دل میں وہ تیسرا کلمہ یاد کرتا رہا۔ پھر اسی طرح اگلے دن انہوں نے اسی نمازی سے عشاء کے بعد تین کلمے سُنے اور چوتھا یاد کروایا۔ میں بھی ساتھ ساتھ دہراتا اور دل ہی دل میں اُسے پکا تا رہا۔ اسی ترتیب سے پانچویں دن پانچواں اور چھٹے دن چھٹا کلمہ انہوں نے اسے ازبر کروادیا۔ ساتویں دن درس کے بعد مولوی صاحب نے خود اس نمازی سے چھ کلمے سنانے کی فرمائش کی۔ اس نے فٹافٹ چھ کے چھ کلمے سنا دیے۔ مولوی صاحب نے خوش ہو کر اس نمازی کی پیٹھ تھپکی۔ مَیں نے آہستہ سے کھنکار کر کہا۔

''میں نے بھی یہ چھ کلمے یاد کر لیے ہیں جناب۔۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی تصحیح کے لیے ایک مرتبہ سنا دوں۔''

مولوی صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ عبداللہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے اس نے فوراً ہی چھپا لیا۔ مولوی صاحب نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا البتہ سر ہلا کر اجازت دے دی۔ مَیں نے بھی چھ کے چھ کلمے مولوی صاحب کو سنا دیے۔ ایک آدھ جگہ میں اٹکا تو مولوی صاحب نے ہی تصحیح بھی کر دی۔ میں نے چھٹا کلمہ ختم کیا تو مولوی صاحب نے دھیرے سے کہا۔ ''جزاک اللہ۔''

ان کے فوراً بعد عبداللہ کے منہ سے بھی یہی دُعا نکلی۔ اب یہ ہمارا معمول ہو گیا تھا جو نمازی بھی مولوی صاحب سے کچھ بتانے یا سکھانے کی فرمائش کرتا میں بھی اپنے آپ ہی ان کے ساتھ ساتھ وہ سب ازبر کرتا جاتا تھا۔ مثلاً ایمانِ مفصل، ایمان مجمل، دُعائے قنوت، مختلف مسنون دُعائیں وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ مجھے بھی بچپن میں مولوی صاحب ہی کی طرح کے ایک مولانا نے سکھایا تھا۔ جیسے ہر گھر میں مسلمان بچوں کو سکھانے کے لیے کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ آتا ہی تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے جوانی کی حدوں میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ میں یہ دُعائیں بھولتی گئیں اور ان کی جگہ میرے ذہن میں انگلش گانے اور ان کے سنگرز کے نام بھرتے چلے گئے۔ ان چند دنوں میں مجھے پھر سے وہ سب کچھ ازبر ہو گیا تھا جسے میں کئی سالوں سے نہ دُہرانے کی وجہ سے بھلا بیٹھا تھا۔

مولوی صاحب نے بھی اب جیسے میری موجودگی سے اِک سمجھوتہ ہی کر لیا تھا کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ مَیں نے کبھی کسی مقصد کے لیے بھی براہِ راست ان سے بات کرنے کی یا پھر ان کے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کبھی کبھی جب مولوی صاحب کسی وجہ سے جماعت کروانے کے لیے نہیں آپاتے تھے تب عبداللہ یہ فریضہ سرانجام دیا کرتا تھا۔ اُس دن البتہ مَیں عبداللہ سے ضرور براہِ راست کوئی سوال کر لیا کرتا تھا۔ جو پچھلے کچھ دنوں سے میرے ذہن میں موجود تو ہوتا لیکن مولوی صاحب کی موجودگی کی وجہ سے زبان پر نہیں آپاتا تھا۔ عبداللہ بھی بڑے کھلے دل سے میرے سوال سنتا اور بہت تفصیل سے ان کے جواب دینے کی کوشش کرتا تھا۔ یوں چاہے میری محبت کی وجہ سے ہی سہی پر دھیرے دھیرے مجھ پر میرا مذہب کھلنے لگا تھا۔

عبداللہ نے کبھی اس دوران تنہائی میں بھی مجھ سے کسی ذاتی مسئلے پر گفتگو نہیں کی تھی۔ البتہ اس دوران عبداللہ اور مولوی صاحب کی زبانی بہت سی باتیں جو پہلے میری نظر سے اوجھل تھیں مجھے اب ان کی سمجھ آنے لگی تھی۔ خیرو تانگے والے نے تو اب یہ روز کا معمول بنا لیا تھا کہ وہ فجر اور عشاء کے وقت کوئی اور سواری اٹھاتا ہی نہیں تھا۔ اور میرے اسٹیشن سے نکلنے سے پہلے ہی وہ ان اوقات پر اپنا تانگہ سب سے آگے بڑھا کر کھڑا میرا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اُسے مجھ سے میری ''منّت'' کی وجہ سے عقیدت سی ہو گئی تھی اور اس کی بدولت سارے ریلوے اسٹیشن کو یہ بات پتہ چل گئی تھی کہ حماد بابو کسی منت کے سلسلے میں روزانہ کہیں جاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان سبھی نے مجھ سے بنا کوئی بات کیے ازخود ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ ضرور یہ منّت کسی محبت کے سلسلے کی ہی ہوگی۔ شاید میری عمر ہی ایسی تھی۔ یا شاید محبت خود عاشق کے روم روم سے ٹپکتی ہے۔ اس کی آنکھیں، اس کی چال ڈھال اس کا چہرہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا ہوتا ہے کہ دیکھو۔۔۔ یہ جا رہا ہے وہ شخص جس نے محبت کرنے کا جرم کیا ہے۔ یہی ہے وہ گناہ گار جو سنگسار کیے جانے کا حق دار ہے۔

بہرحال ان دنوں اسٹیشن پر میری اور میری ''منّت'' کی بڑی دھوم تھی۔ صدیقی صاحب بھی کبھی کبھی دفتر چھوڑ کر ڈرائی پورٹ کے گوداموں کی طرف چلے آتے اور مجھے کہیں تنہا بیٹھا دیکھ کر مسکرا کر میرے بال ہاتھ بڑھا کر بکھیر دیتے اور بنا کچھ کہے واپس چلے جاتے۔

عجیب سی شفقت تھی ان کے انداز میں۔ جیسے کہہ رہے ہوں، کیے جاؤ یہ محبت کا جرم۔۔۔۔ہم سب تمھارے ساتھ ہیں گھبرانا نہیں۔۔۔۔

شاکرے گاہے بگاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔۔۔۔عبداللہ نے شاید اُسے مسجد میں میری روزانہ کی حاضری کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر کچھ نہ بولا۔۔۔۔بس مجھے گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ محبت شاید پیدا ہی سب کو رُلانے کے لیے ہوتی ہے۔ واپسی پر نگہت سوجی آنکھوں کے ساتھ برآمدے کی اوٹ سے باہر نکلی اور اُس نے میرے ہاتھ پر کوئی امامِ ضامن باندھ دیا۔ لو جی۔۔۔۔ یہ تو خیرو کی منت والی بات بھی سچ ہی ہو گئی۔ مجھے نگہت سے اُس نازِ ادا کی حالت پوچھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ پہلے ہی اس کے آنسو مجھے دیکھ کر تھم نہیں پاتے تھے۔ کچھ پوچھ بیٹھتا تو اسے سنبھالنا واقعی مشکل ہو جاتا۔ امام ضامن باندھ کر اس نے بڑے پیار سے میرے بال سنوارے اور سر پر ہاتھ رکھ کر یوں دُعا دی جیسے وہ میری بڑی بہن ہو۔ اس ایک محبت نے مجھے کتنے لوگوں کی نظروں میں معتبر بنا دیا تھا، مجھے اس دن احساس ہوا کہ محبت بیک وقت ہمیں کئی نظروں میں معیوب کر دیتی ہے اور کئی نظروں میں ہمیں محترم بنا دیتی ہے۔ محبت ایک ہی وقت میں زہر اور اسی لمحے میں تریاق کا کام دیتی ہے۔

OO

ٹرم پیپر

جس دن سے مَیں نے، ''ہالوکاسٹ'' پر اپنا تحقیقی پرچہ لکھنے کا اعلان کیا تھا اسی دن سے سر آئزک بھی مجھ سے کچھ کھچے کھچے سے رہنے لگے تھے۔ جوزف سے ملاقات ہوئی تو اُس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''مَیں جانتا تھا کہ تمھیں روکنا بہت مشکل ہوگا۔ میری دُعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔''

ربیکا جانے کلاس میں زیرِ لب کیا کچھ پڑھتی رہتی اور مجھ پر آتے جاتے پھونکیں مارتی رہتی۔ سارہ البتہ پُرسکون تھی لیکن اس کا گینگ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہتا تھا۔ اور پھر اس دن وہی ہوا جس کا کامران بہت دنوں سے خدشہ ظاہر کر رہا تھا۔

اس دن یونیورسٹی جلدی خالی ہو گئی تھی کیونکہ شہر میں کسی جلسے کی وجہ سے آس پاس کی سڑکوں کو بند کر کے متبادل راستوں سے ٹریفک گزارنے کا اعلان کیا گیا تھا۔

انتظامیہ نے اسٹوڈنٹس کی سہولت کے لیے ایک لیکچر پہلے ہی یونیورسٹی کی بسیں چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس دن کامران کی گاڑی لے کر آیا تھا۔ مَیں اور ربیکا مرکزی عمارت سے نکل ہی رہے تھے کہ کہیں سے جم، ڈیوڈ اور ٹینا نمودار ہو گئے۔ جم حسبِ معمول میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ مَیں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا چاہتے ہو۔۔۔۔میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے تم نے۔''

''مَیں چاہتا ہوں کہ تم اس یونیورسٹی سے فوراً دفع ہو جاؤ۔ اور دوبارہ پلٹ کر اس طرف کا رُخ بھی نہ کرنا۔''

''اور اگر مَیں ایسا نہ کروں تو۔۔۔؟''

ڈیوڈ دو قدم آگے بڑھ آیا۔

''تو پھر ہم تمھارا بندوبست کرنا بھی خوب جانتے ہیں۔''

جم نے میرا گریبان پکڑ لیا، ربیکا زور سے چلائی۔

''ہے جم۔۔۔ چھوڑ دو میڈی کو۔۔۔ تم وحشی ہو۔''

لیکن جم نے میرا گریبان نہیں چھوڑا۔

''میرا گریبان چھوڑ دو جم۔۔۔۔ مجھے مجبور مت کرو کہ میں۔۔۔۔''

اِتنے میں سارہ جانے کس جانب سے دوڑتی ہوئی وہاں آ پہنچی اور میری بات اُدھوری رہ گئی۔ سارہ نے آتے ہی ایک جھٹکے سے میرا گریبان جم کے ہاتھوں سے چھڑوا دیا اور چلا کر بولی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے جم تم گلی کے غنڈوں جیسا برتاؤ کرو گے۔۔۔۔ تم سے یہ توقع نہیں تھی مجھے۔''

جم سارہ کو دیکھ کر کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں ربیکا کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ مجھے آوازیں دیتی ہوئی پیچھے چلی آئی۔

''جم کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتی ہوں جانے اُسے کیا ہو گیا ہے۔''

میں نے غور سے سارہ کی طرف دیکھا۔

''شاید وہ سچ کو برداشت نہیں کر پا رہا۔ سچ کو ہضم کرنا واقعی ایک مشکل کام ہے۔'' میں سارہ کو یونہی گم صم کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ربیکا نے راستے بھر جم کو دل کھول کر موٹی موٹی گالیاں دیں۔ میں ہائڈ پارک کے علاقے میں واقع اس کے اپارٹمنٹ تک اُسے چھوڑنے کے لیے جا رہا تھا۔ پکاڈلی کی مرکزی سڑک سے دائیں مڑتے ہی وہ بچوں کی طرح چلانے لگی۔ سڑک کے کنارے ایک کینڈی فلاس بیچنے والا جوکروں کے لباس میں کلاؤن بنا کھڑا تھا اور آتے جاتے بچوں کو مختلف اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے ہنسا رہا تھا اور انہیں پُھوں والی مٹھائی خریدنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہاں۔۔۔۔ بچپن میں ہم اسے پُھوں والی مٹھائی ہی تو کہتے تھے۔ ہمارے گھر کے باہر گلیوں میں ایک بوڑھا سا بابا شیشے کے بڑے سے مرتبان میں بہت سی روئی کے گالوں جیسی سفید اور گلابی مٹھائی کے گولے لے کر آتا اور اُن کو پھر ایک موٹے سے تنکے کے گرد خوب اچھی طرح گھما کر لپیٹ کر ہمیں بہت سے گولے تھما دیتا۔ یہاں پر انہی روئی کے گولوں کو کینڈی فلاس کہا جاتا تھا۔

ربیکا کی چیخ و پکار سے مجبور ہو کر مجھے بھی گاڑی سڑک کے کنارے لگانی پڑی۔ وہ جلدی سے اُچھل کر گاڑی سے اُتر کر بھاگ کر کلاؤن کے پاس پہنچ گئی اور پھر وہاں روئی کے دو بہت بڑے سے پیلے اور گلابی گولے بنوا کر مجھے بھی باہر آنے کا اشارہ کرنے لگی۔ واقعی اس لڑکی کو ایک کروٹ بھی چین نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے بھی نیچے اُترنا پڑا۔ پھر ہم بہت دیر تک وہیں سڑک کنارے پتھر کی لمبی سی سِل پر بیٹھے کلاؤن کی بکری کرواتے رہے۔ ہمارا بچپن بڑھاپے تک ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ اندر کہیں دبک کر بیٹھا رہتا ہے اور موقع ملتے ہی چھم سے باہر نکل آتا ہے۔ ہمیں جیبوں میں کینچے اور اخروٹ بھرنے پر اکساتا ہے۔ تنہا سڑک پر زور سے سیٹی مارنے پر مجبور کرتا ہے۔ راہ چلتے ٹھیلے والے سے برف کے گولے پر شربت ڈلوا کر مزے سے چوسنے پر مائل کرتا ہے۔ کھٹی میٹھی گولیاں اور چورن گھر والوں سے چُھپ کر منہ میں بھرنے پر شاباش دیتا ہے۔ وہی بچپن آج ربیکا کے اندر سے بھی چھلک رہا تھا۔ اور اس لڑکی کے بہانے میں نے چند پل اپنے بچپن کے پھر سے بِتا لیے۔

لیکن اس وقت ہم دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ کل کا سورج کیا لے کر آنے والا ہے۔

اگلے دن یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلی جو خبر ملی وہ یہ تھی کہ میری اور جم کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ ہمارا جرم تھا یونیورسٹی کے ماحول اور ڈسپلن کو خراب کرنا اور اس ایکسپلینیشن (Explanation) کال کا جواب ہمیں آج زبانی اور تین دن کے اندر تحریری طور پر جمع کروانا تھا۔ ربیکا اس بات پر بے حد سیخ پا تھی۔ ''یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ ساری یونیورسٹی جانتی ہے کہ سارا قصور جم کا تھا۔ اُسی نے تمہارا راستہ روکا تھا اور تم نے تو جواب میں اسے کچھ کہا بھی نہیں۔ میں خود سر آئزک سے بات کروں گی۔۔۔۔ میں دیکھتی ہوں تمہارے خلاف کوئی کیسے ایکشن لیتا ہے۔''

وہ اپنے آپ ہی شدید غصے میں بڑبڑائے جا رہی تھی اور جانے کب سے لان میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ جیسے زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر اپنا غصہ نکال رہی ہو۔ مجھے اس کے اس ناراض سے انداز پر ہنسی آ گئی۔

''تم بیٹھ کر بھی اپنا غصہ نکال سکتی ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

اُس نے مجھے بھی غصے سے دیکھا اور اپنی چہل قدمی اور بڑبڑاہٹ ویسے ہی جاری

رکھی۔

"مجھے سارہ سے یہ اُمید ہرگز نہیں تھی۔ وہ تو خود اس تمام واقعے کی چشم دید گواہ ہے۔ آخر اس نے سر آئزک کو کیوں نہیں بتایا کہ تم بالکل بے قصور ہو۔"

اتنے میں اسپیکر پر میرا اور جم کا نام پکارا جانے لگا کہ ہم پانچ منٹ کے اندر یونیورسٹی کے ڈین یعنی سر آئزک کے کمرے میں کمیٹی کے سامنے پیش ہو جائیں۔ مَیں نے اُٹھ کر ربیکا کو کاندھوں سے پکڑ کر اپنی جگہ بٹھا دیا۔

"یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ، میں ابھی اپنا بیان ریکارڈ کروا کر آتا ہوں۔ اور جب تک میں واپس نہ آؤں تم بالکل بھی پریشانی میں چہل قدمی نہیں کرو گی۔ سمجھ گئیں۔۔۔۔" ربیکا چُپ چاپ بیٹھ تو گئی لیکن اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ مَیں اُس نازک دل لڑکی کا سر سہلا کر اور اس کے بال بکھرا کر وہاں سے ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں جم مجھ سے پہلے موجود تھا۔ میز کی دوسری جانب سر آئزک اور تین کمیٹی کے انتظامی ممبران بھی موجود تھے۔ مجھے الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس میں ایک ہی الزام تھا کہ میں نے جم کے ساتھ گذشتہ روز ہاتھا پائی کی اور یونیورسٹی کے ڈسپلن اور وقار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے گالی گلوچ وغیرہ کی، جو کہ یونیورسٹی کے قاعدے اور قانون کے لحاظ سے بے حد سنگین جرم تھا۔ سر آئزک میری طرف متوجہ ہوئے۔

"جی مسٹر حماد۔۔۔۔ آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"مَیں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ مَیں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے یونیورسٹی کا کوئی بھی قانون ٹوٹتا ہو۔ میرا راستہ جم نے روکا تھا لیکن بات وہیں ختم ہو گئی تھی۔"

"لیکن جم کے بیان کے مطابق تم اس پر حملہ آور ہوئے تھے اور بات بہت آگے تک بڑھ چکی تھی۔"

مجھے جم کے بیان پر کوئی حیرت نہیں ہوئی، مَیں نے سکون سے جواب دیا۔

"میرا بیان اب بھی یہی ہے کہ بات معمولی سی تھی اور اسی لمحے ختم ہو گئی تھی۔ اگر انتظامیہ چاہے تو اپنے طور پر بھی اس واقعے کی تحقیق کروا سکتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اچھے

خاصے اسٹوڈنٹس وہاں موجود تھے جنھوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سارا واقعہ ہوتے دیکھا ہے۔ انہی میں ایک نام مس سارہ آئزک کا بھی ہے جو خود اس واقعے کی چشم دید گواہ ہیں۔"

سارہ کے نام پر سر آئزک نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے انہیں میری زبان سے سارہ کا نام بطور گواہ سننے کی اُمید بالکل ہی نہ ہو۔ یہی حال باہر ربیکا کا ہوا جب مَیں نے اُسے کمرے سے نکل کر بتایا کہ مَیں نے بطور گواہ سارہ کا نام انکوائری کمیٹی کو دے دیا ہے۔ سارہ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"اُف میڈی۔۔۔۔ یہ کیا غضب کر دیا تم نے۔۔۔۔ اَب تمھیں یونیورسٹی سے ریسٹی گیٹ Restigate ہونے سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی نہیں۔

OO

پھر وہی نظر

مَیں اُسی باقاعدگی سے مولوی علیم کی مسجد میں دن کی دو نمازیں پڑھنے جا رہا تھا۔ اس دوران ایک اور واقعہ درپیش آ گیا۔ کوئٹہ سے کراچی کے لیے سہ پہر چار بجے تک قریب بولان میل نامی ایک گاڑی روزانہ نکلتی ہے۔ جس کا کوئٹہ سے نکلنے کے بعد تیسرا اسٹیشن مچھ نامی شہر پڑتا ہے۔ شہر کیا ہے ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی وجۂ شہرت یہاں انگریز سرکار کی بنائی ہوئی ایک بہت بڑی جیل ہے جو "مچھ جیل" کے نام سے ہی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں جزائر انڈیمان کے کالا پانی جیل کی جو شہرت تھی وہی اس مچھ جیل کی بھی تھی۔ اس قصبے کے درمیانے طبقے کے لوگ صبح کراچی سے آتی ہوئی اسی بولان میل کی پہلی گاڑی سے کوئٹہ آ جاتے تھے جو صبح آٹھ بجے کے قریب کراچی سے مچھ پہنچتی تھی۔ دن بھر اپنے کام نپٹا کر وہ شام کو اسی میل کی ڈاؤن ایکسپریس سے چار بجے دوبارہ مچھ کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ جو انہیں ڈیڑھ گھنٹے میں مچھ پہنچا دیتی تھی۔

اس دن صدیقی صاحب کے کوئی دوست جو ان دنوں مچھ ریلوے اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر تعینات تھے اپنے گھر والوں کے ساتھ صدیقی صاحب کی دعوت پر کوئٹہ آئے ہوئے تھے۔ شام کی گاڑی سے واپس مچھ جا رہے تھے۔ بیوی بچوں نے شاید کوئٹہ کے بازاروں سے بھی چیزوں کا ایک آدھ نمونہ ضرور خریدا تھا تبھی ان کے ساتھ سامان کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ٹرین چھوٹنے کا وقت تھا لہٰذا صدیقی صاحب اِدھر اُدھر سے قلیوں کو بلوا کر جلدی جلدی ان کا سامان گاڑی کی بوگی میں رکھوا رہے تھے۔ میں نے دور سے دیکھا تو میں بھی مدد کے لیے چلا آیا۔ غفورے کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اس سے اور ایک دوسرے بوڑھے قلی سے سوٹ کیس کے لیے اور گاڑی کی طرف پلٹا، نظر اُٹھائی تو عبداللہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ عبداللہ مجھے یوں قلیوں کے لباس میں سوٹ کیسوں اور بکسوں کے بوجھ تلے لدا پھندا دیکھ کر

چند لمحے کے لیے گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ میں نے مسکرا کر اُس سے پوچھا کیوں عبداللہ میاں ۔۔۔! قلی چاہیے تو بولو۔ لیکن مزدوری ۔۔۔۔" اچانک جیسے میری زبان پر کسی نے کوئی جلتا ہوا کوئلہ رکھ چھوڑا ہو۔ عبداللہ کے بالکل پیچھے کچھ فاصلے پر کالے برقعے میں ملبوس وہ کھڑی تھی۔۔۔

ہاں ہاں۔۔۔ وہ وہی تھی۔۔۔ میں اس کی اُن قاتل نگاہوں کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ پھر پتہ چلا کہ اس کے پیچھے حیا اور ایک بوڑھی سی خاتون بھی تھیں جو سفید شٹل کاک برقعے میں ملبوس تھیں۔ شائد وہ ایمان کی اماں ہی تھیں اور یہ سب لوگ عبداللہ کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ تبھی مجھے پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیے۔ میرے دونوں ہاتھوں سے سوٹ کیس گرتے گرتے بچے۔ مَیں نے سامان نیچے رکھا۔ عبداللہ نے آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن مَیں اپنے حواس میں تھا ہی کہاں، پتہ نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا تھا۔ میں نے جتنی مرتبہ بھی ایمان کو اپنے روبرو پایا تھا مَیں اپنا آپ کھو بیٹھا تھا۔ مجھے اس کے بعد ہمیشہ خود پر بے حد غصہ آتا تھا اور مَیں حسرت سے سوچتا تھا کہ جتنی گھڑیاں بھی وہ میرے سامنے موجود رہی تھی، مَیں نے اِک اِک پل بنا، کوئی لمحہ ضائع کیے اسے دیکھا کیوں نہیں۔۔۔؟ کیوں میری نظر ایک رتی بھر پل کے لیے بھی اِدھر اُدھر ہوئی۔۔۔؟ کیوں اس وقت میں کسی اور بات میں اُلجھا رہا۔۔۔؟ کچھ ایسی ہی کیفیت اس وقت بھی میری ہو رہی تھی۔ جانے عبداللہ نے کیا کہا؟ جانے مَیں نے اُسے کیا جواب دیا؟ غفورے اور دوسرے قلیوں نے دیکھا کہ مَیں اپنے کسی جاننے والے سے بات کر رہا ہوں تو وہ خود ہی میرے آس پاس بکھرا صدیقی صاحب کے مہمانوں کا سامان اُٹھا کر چل دیے۔ حیا ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے بزرگ خاتون کو بھی میرے بارے میں کچھ بتایا۔ ایمان حسب معمول سر جھکائے کھڑی تھی۔ پر مَیں نے محسوس کیا کہ جس پل اس کی بے خبری میں پہلی بار یہاں پلیٹ فارم پر مجھ سے نظر چار ہوئی تھی، تب سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ مَیں نے عبداللہ کے ہاتھ سے ٹکٹ لے لیے تا کہ ان کی ان کے ڈبے تک رہنمائی کر سکوں۔ سامان لینے کی کوشش کی لیکن عبداللہ نے سامان کو مجھے ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

ان کا ڈبا بس دو بوگیاں چھوڑ کر ہی تھا۔ عبداللہ عورتوں کو اندر بٹھا کر خود باہر میرے پاس

آ گیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموش کھڑے رہے۔ شاید ہم دونوں کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔ دفعتاً عبداللہ نے میرے ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اس کی بھیگی پلکیں محسوس کرتے ہی مَیں نے تڑپ کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور اُسے کندھے پر تھپکی دی۔ کبھی کبھی واقعی لفظ ہمارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں دوسرا سہارا آنکھیں ہوتی ہیں جو ہمارے جذبات دوسروں تک منتقل کر سکتی ہیں۔ پر اگر اس لمحے آنکھیں بھی چھلک رہی ہوں تو پھر ہمارے پاس ہاتھ ہی رہ جاتے ہیں۔ جو کبھی ہاتھ پکڑ کر، کبھی کمر سہلا کر، کبھی تھپکی دے کر اور کبھی دوسرے کو گلے لگا کر اُسے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کے ساتھ ہیں۔ اس کے حال میں شریک ہیں۔ مَیں بھی اس وقت عبداللہ تک بس یہی ہاتھوں کی بولی ہی پہنچا سکا۔ مَیں نے اس لمحے محسوس کیا کہ حیا کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں جنھیں اس نے فوراً برقعے کا پلو گرا کر چھپا لیا۔ حیا اور ایمان کھڑکی کے قریب ہی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ عبداللہ نے جاتے جاتے بتایا کہ وہ لوگ بھی "مچھ" ہی جا رہے ہیں۔ جہاں مولوی صاحب کی بہن رہتی تھیں، شاید کسی تقریب کے سلسلے میں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میری ایمان سے ان دو تین ٹوٹی پھوٹی ملاقاتوں کے علاوہ آج تک کبھی سامنا بھی نہیں ہوا تھا لیکن پتہ نہیں اس کے کوئٹہ سے باہر جانے کی خبر سن کر مجھے ایسے محسوس ہوا کہ سارا شہر ہی ہمیشہ کے لیے سنسان ہونے والا ہے۔ مجھے لگا کہ جیسے یہ ٹرین مجھ سے میرا دل، میرا سب کچھ چھین کر لے جانے والی ہے۔ ایک دم ہی سے جانے کتنی بے چینیاں میرے رگ و پے میں تیرنے سی لگی تھیں۔
ٹرین دوبارہ وسل دے چکی تھی، عبداللہ نے مجھے گلے لگایا اور پلٹ کر ٹرین میں چڑھنے کے لیے بوگی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میری نظر بے اختیار ڈبے میں بیٹھی ایمان کی طرف اُٹھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے جیسے یہ ٹرین، یہ پلیٹ فارم، یہ آس پاس کے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے لوگ، یہ شور، یہ زمین، یہ آسمان۔۔۔ سب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ صرف ایمان اور اس کی دو آنکھیں اس کائنات میں باقی رہ گئیں۔۔۔ لیکن میری اس بدحواسی کی صرف اتنی ہی وجہ نہیں تھی۔ ایمان میری ہی طرف دیکھ رہی تھی، جی ہاں۔۔۔ میری طرف۔۔۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے مجھ پر کوئی دوسری نظر ڈالی تھی۔ دوسری نظر، اور وہ بھی اپنی مرضی سے، جیسے ہی میری اس سے نظر ملی۔ اک ثانیے کو اس کی آنکھوں میں نمی کی

ایک چمک سی لہرائی۔ اور پھر اُس نے گھبرا کر نظر جھکا لی۔ مجھے لگا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ اب میری سانسیں تھم جانی چاہئیں، مزید زندگی بے کار ہے۔
مجھے اپنے نصیب پر اتنا رشک پہلے کبھی نہیں آیا۔ جتنا اس لمحے آیا تھا۔ ٹرین نے ہلکا سا جھٹکا لیا۔ ٹی ٹی نے تیسری اور آخری سیٹی بجائی۔ گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ عبداللہ بھی آ کر دوسری جانب اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ عبداللہ کو الوداع کہنے کے لیے اوپر اُٹھ گیا۔ عبداللہ نے بھی ہاتھ ہلایا، میں اضطراری طور پر ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگا، جیسے کوئی بچہ اپنے کسی عزیز از جان کھلونے کو کسی اور کے ہاتھوں میں سونپ تو دے پر جب وہ جانے لگتا ہے تو وہ بھی ساتھ ہی چل پڑتا ہے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی اور ساتھ ہی میرے قدموں کی بھی۔۔۔ جانے مجھے کس چیز کی آس تھی، کون سی تمنا میرے دل کو اس وقت چیر رہی تھی، کاٹ رہی تھی۔ میری نظریں مستقل اندر بیٹھی سر جھکائے، کانپتی ہوئی ایمان پر تھیں۔۔۔ پلیٹ فارم کا آخری کنارہ قریب آتا جا رہا تھا۔ جانے میرے قدم راستے میں پڑی چیزوں اور سامان سے کتنی ٹھوکریں کھا چکے تھے، لیکن تب بھی میں لڑکھڑاتے ہوئے زخمی قدموں سے ٹرین کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرتا رہا۔ شاید غفورے نے کچھ چلا کر کہا تھا۔ شاید کچھ قلی میری طرف بڑھے بھی تھے تاکہ مجھے روک سکیں تاکہ مَیں پلیٹ فارم کے سرے سے گر کر ٹرین کے نیچے ہی نہ آ جاؤں۔ پر مجھے اس لمحے ہوش ہی کہاں تھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ اس بار ایمان میری نظروں سے اُوجھل ہوئی تو پھر شاید مَیں اُسے دوبارہ کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ مَیں نظریں اندر ڈبے میں گاڑھے ہی آگے بڑھتا رہا اور پھر جیسے قدرت کو میری حالت پر رحم آ ہی گیا۔ میری بے چارگی میری لاچاری نے عرش پر جتنے ماتھے ٹیکے تھے، شاید آسمان پر وہ سارے سجدے قبول ہو گئے تھے۔ ایمان نے ایک لمحے کے لیے سر اُٹھایا اور باہر مجھ پر نظر ڈالی۔ چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی ایک نظر میں جانے کتنے سوال، کتنی التجائیں اور کتنی بے بسی تھی۔ دوسرے لمحے ہی ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم سے نکل چکی تھی۔ مجھے جانے کس کے بازوؤں نے تھام لیا۔ مَیں اپنی سدھ بدھ کھو چکا تھا۔ بس ٹرین کے تیز پہیوں کی گڑگڑاہٹ میری سماعتوں کو چیر رہی تھی۔ آنسوؤں سے میرا چہرہ دھل رہا تھا۔ مَیں وہیں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا دور جاتی ٹرین کو دیکھتا رہا۔

میرے آس پاس میرے ساتھی قلی، غفورا، صدیقی صاحب اور جانے کون کون مجھے تسلی دینے کے لیے تھپک رہا تھا۔ سہلا رہا تھا، اپنے ساتھ بھینچ رہا تھا، گلے لگا رہا تھا لیکن مجھے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ دنیا میرے لیے فنا ہو چکی تھی۔

جانے ایمان کی نظر میں کیا تھا؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی؟ شاید یہی کہ میں یہ پاگل پن اور یہ دیوانگی چھوڑ دوں، کہیں نہ کہیں تو میرے سینے کی یہ آگ اور میرے سینے سے اٹھتا یہ دھواں اس کا اُجلا دامن بھی تو میلا کر رہا تھا۔ ہاں شاید یہی بات تھی۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ پھر اس کی آنکھوں میں یہ بے بسی کیسی تھی۔۔۔۔؟ یہ سوال کیسے تھے۔۔۔۔؟ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس پٹڑی پر چلتا جاؤں، چلتا جاؤں۔۔۔۔ وہاں تک، جہاں وہ ٹرین ایمان کو لے کر گئی تھی۔ اُسے جا کر اس انجانے قصبے میں سے کہیں ڈھونڈ نکالوں اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر میں اس نازنین سے پوچھوں کہ اُس کی آنکھوں میں وہ کیا سوال تھا؟ وہ ایک بار پوچھ کر تو دیکھتی۔۔۔ میں اپنی روح کا آخری دھاگا کھینچ کر بھی اس کے سوال کا جواب ڈھونڈ ہی لاتا۔

شام ڈھل چکی تھی اور اسٹیشن دھیرے دھیرے ویران ہوتا جا رہا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے ایک کونے میں جلائے جانے والے لکڑی کے پھٹوں اور دیگر بے کار اشیاء کے جلتے الاؤ کے گرد بیٹھا ہوا تھا۔ آگ میں لکڑی کے تختے چیخ رہے تھے۔ غفورے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

"بابو۔۔۔۔ تیرے اندر تو بڑی آگ ہے۔۔۔۔ سب ہی کچھ اندر رکھے گا تو اندر ہی اندر جھلس جائے گا۔ ارے غفورا تو سمجھتا تھا کہ آج تک صرف اُسی نے عشق کیا ہے۔ آج پتہ چلا کہ اپنے کو تو عشق کے عین کا بھی نہیں پتہ۔۔۔۔ کہاں سے لایا ہے اتنا لاوا۔۔۔۔ اتنی نار۔۔۔۔ ایک جھلک نے ہی سارا اسٹیشن جلا کر راکھ کر دیا۔ ایسے نہ کر بابو۔۔۔۔ ہم غریبوں پر کچھ رحم کھا۔۔۔۔ بتا دے ٹو کون ہے؟۔۔۔۔ کیوں ہم گناہ گاروں سے اور گناہ کروا رہا ہے۔۔۔۔ ٹو تو کسی سلطنت کا شہزادہ ہے، ان مزدوروں میں کیا کر رہا ہے۔۔۔۔؟"

میرے پاس غفورے کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا بتاتا میں اُسے؟ میں کچھ نہ بولا بس اس کا ہاتھ زور سے تھام لیا۔ ہاتھوں کی بولی نے اُسے جانے کیا پیغام دیا کہ پھر اس نے بھی دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ بس چُپ چاپ بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ جلتی آگ چیختی رہی

اور ہم دونوں کے چہروں کو سنہری اُجالے سے روشن کرتی رہی۔

نہ جانے کیوں اس دن کے بعد سے میں جب بھی اسٹیشن کے کسی بھی حصے یا پلیٹ فارم سے گزرتا تو آس پاس کام کرتے میرے ساتھی، اسٹیشن کا عملہ، میرے افسر سبھی رک کر مجھے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا احترام در آتا تھا۔ جیسے مجھے اس عشق کی ایک واردات نے ان سب کی نظروں میں بہت محترم کر دیا ہو۔ حالانکہ میں خود اپنی اس دن کی بے خودی پر بے حد شرمندہ تھا۔ دوسرے دن اور اس کے بعد مجھے سب کے سامنے جاتے ہوئے کس قدر مشکل کس قدر شرمندگی ہوئی تھی یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔

میں لگاتار روزانہ کراچی سے آنے والی ایکسپریس اور دیگر گاڑیاں ضرور چیک کرتا تھا کہ شاید ایمان واپس آ گئی ہو۔ لیکن ہر روز مجھے مایوسی ہی ہوتی تھی۔ دو دن گزر گئے پھر تین پھر چار۔۔۔۔

میری فجر اور عشاء کی "منت" والی نمازوں میں بھی بے قاعدگی ہونے لگی تھی۔ بس ہر لمحہ ذہن و دل پر وہ دو آنکھیں ہی سوار رہتی تھیں۔ مجھے ہر وقت بخار سا رہنے لگا تھا۔ غفورا ایک بار اصرار کر کے کسی ڈاکٹر کو کہیں سے پکڑ لایا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے بیماری پوچھی تو غفورے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "عشق کا بخار ہے ڈاکٹر صاحب۔"

اور ڈاکٹر بھی میرے ساتھ ہی ہنس پڑا۔ واقعی شاید یہ محبت کا ہی بخار تھا۔ یہ جذبے بھی کس قدر طاقتور ہوتے ہیں۔ ہمارے جسم کے اندر گھس کر، خون کے بہاؤ میں شامل ہو کر ہماری نسوں سے، ہماری رگوں سے چھیڑ چھاڑ تک کر سکتے ہیں۔ ہمارے پورے جسم کا نظام بگاڑ سکتے ہیں، اُلٹ پلٹ کر سکتے ہیں۔ اب بھلا ایسی کسی بیماری کو وہ بے چارہ ڈاکٹر کیا پکڑ پاتا۔

اس رات بھی مجھے شدید بخار تھا، لیکن میں نے خیرو کو تانگہ لگانے کا کہا اُس نے میری طبیعت کے پیش نظر کچھ لیت و لعل سے کام لیا تو میں دوسرے تانگے کی طرف بڑھ گیا۔ مجبوراً خیرو کو ہی اپنا تانگہ آگے بڑھانا پڑا۔ میں مسجد کے قریب پہنچ کر اُتر گیا۔ راستے میں خیرو نے اپنی بڑی سی پشاوری شال مجھے زبردستی اوڑھا دی تھی۔ میں اندر جا کر ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ مولوی علیم حسب معمول اپنے وقت پر پہنچے اور نماز پڑھوائی۔ نماز کے بعد

حسب معمول درس اور پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولوی صاحب کی نظر لمحہ بھر کو پچھلی صف میں بیٹھے ہوئے مجھ پر پڑی اور پھر وہ سوال کرنے والے نوجوان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نوجوان نے پوچھا۔

''مولوی صاحب۔۔۔ یہ بتایئے کہ ہمارے مذہب میں محبت کی شادی کی گنجائش ہے یا نہیں۔''

بے اختیار میری نظر مولوی صاحب کی جانب اُٹھ گئی لیکن انہوں نے مجھے دیکھے بنا اس نوجوان کو جواب دیا۔

''محبت شادی کے بعد میاں بیوی میں ہو تو تبھی جائز ہے۔ اس کے علاوہ دوسری قسم کی محبت جائز نہیں ہے۔'' نوجوان کی تسلی نہیں ہوئی۔

''لیکن مولوی صاحب ہمارے مذہب میں لڑکی سے سوال کرنے کی گنجائش تو ہے نا۔ مَیں نے تو سُنا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے کی جھلک دیکھنے کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ مطلب لڑکی اور لڑکے کی پسندیدگی ضروری ہے۔''

''مولوی صاحب نے سختی سے کہا۔''

''ہاں اگر ضرورت پڑے تو کسی حد تک اس کی اجازت ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں وہی شادیاں کامیاب ہوتی ہیں جو والدین کی مرضی سے طے پا جائیں۔ اتنا بڑا فیصلہ ایک کمزور، ناسمجھ اور ناعمر لڑکی پر چھوڑنا دانش مندی نہیں ہے۔ دُنیا کے کوئی ماں باپ جان بوجھ کر اپنی معصوم بیٹی کو کس غلط شخص کے ساتھ کیوں باندھنا چاہیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ یہ فیصلہ لڑکی کے ماں باپ یا اس کے بڑوں پر ہی چھوڑ دیا جائے۔''

مولوی صاحب نے بڑی تفصیل سے جواب دے دیا تھا نوجوان تو شاید مطمئن ہو ہی گیا ہو لیکن جانے اس ایک پل میں مجھے کیا ہُوا۔ مَیں کئی ہفتوں سے یہاں آ رہا تھا اور اس عرصے میں کبھی مَیں نے مولوی صاحب کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی لیکن اس روز نہ جانے میں کیوں بول پڑا۔ مولوی صاحب محفل سمیٹ کر اٹھنا ہی چاہ رہے تھے کہ میری آواز سن کر بھی چونک کر رُک گئے۔

''مولوی صاحب کسی بھی لڑکی کے لیے اس کے ماں باپ کو رشتہ طے کرتے وقت

لڑکے میں کن شرعی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔''

کچھ دیر کے لیے مولوی صاحب چپ سے رہ گئے۔ لیکن باقی نمازیوں کی وجہ سے انہیں جواب دینا ہی پڑا تھا۔

''تمام شرعی باتوں کا، مذہب، کلمہ، نماز، روزہ، حسب نسب سبھی کچھ۔''

''لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے مولوی صاحب کہ رشتہ مانگتے وقت کوئی اتنا ہی مذہبی ہونے کا ڈھونگ کر رہا ہو جتنا لڑکی کے گھر والے اس سے توقع کرتے ہوں۔''

''ایسی صورت میں یہ دھوکا ہو گا۔۔۔ اور دھوکے کا عذاب اس شخص کو بھگتنا ہو گا۔''

''مَیں پانچ وقت کا نمازی ہوں مولوی صاحب۔۔۔ چھ کلمے بھی مجھے یاد ہیں اور مذہب جو شرائط لگاتا ہے کسی مسلمان لڑکی سے شادی کے لیے مَیں ان سب پر پورا اُترتا ہوں۔ دُعا کریں کہ مَیں جس گھر میں رشتہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں میرا رشتہ طے ہو جائے۔''

میری بات سُن کر آس پاس بیٹھے نمازی زیرِ لب مسکرا دیے۔ مولوی صاحب نے بادلِ نخواستہ ہی سہی، پر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ دُعا ختم ہوئی اور لوگ اُٹھ کر وہاں سے چل دیے۔ مَیں اور مولوی صاحب پیچھے تنہا رہ گئے، انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''مَیں جانتا تھا کہ تم یہ سب کچھ بس دکھاوے کے طور پر کر رہے ہو، تمہارا اصل مقصد کچھ اور ہے اور آخر کار آج تمہارے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔''

''آپ کون ہوتے ہیں کسی کی عبادت کے بارے میں حتمی فیصلہ دینے والے۔ یہ تو بندے کا اپنے خدا کے ساتھ براہِ راست معاملہ ہوتا ہے۔ آپ یا مَیں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دکھاوا ہے؟ اور آپ کو تو دوسروں کے دکھاوے کو بھی سچ مان کر ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ کون جانے یہی دکھاوا کسی کو کسی دن سیدھی اور سچی راہ پر لا کھڑا کر دے۔''

مولوی صاحب کچھ لاجواب سے ہو گئے۔ انہوں نے بات کا رُخ بدل دیا۔

''تم چاہتے کیا ہو، آخر اس طرح سے بار بار میرے سامنے آنے کا تمہارا کیا مقصد ہے۔''

''آپ میرا مقصد جانتے ہیں، آپ نے اس دن مجھے میری لادینی کا احساس دلایا تھا۔ حالانکہ اس کم مذہبی میں بھی میرا اپنا سارا قصور نہیں تھا۔ مجھے بچپن کے بعد کسی نے ان

باتوں کا احساس ہی نہیں دلایا۔ بہر حال ۔۔۔ چاہے دیر سے ہی سہی۔ لیکن اب میں آپ کی مذہب کی لگائی ہُوئی شرط پر بھی بہت حد تک پورا اُترتا ہوں۔ اگر کچھ کمی رہ گئی ہے تو مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں اُسے بھی پورا کر دوں گا۔"

مولوی صاحب غصے سے پھٹ پڑے۔

"میاں تمھاری سمجھ میں جانے یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہمارا اور تمھارا کوئی میل نہیں ہے۔ مَیں اپنی بیٹی کو اس گھر میں بیاہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"میرا اب اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ درخواست مَیں اپنی ذاتی حیثیت میں کر رہا ہوں۔"

مولوی صاحب کی آواز بھرا سی گئی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کی اور لرزتے ہوئے لہجے میں بولے۔

"کیوں میری برسوں کی کمائی ہُوئی عزت کے درپے ہو۔ جب تمھیں اس مسجد میں یا اپنے محلے کے آس پاس بھی دیکھتا ہوں تو ساری ساری رات فکر سے مجھے نیند نہیں آتی۔ لوگوں کی زبان اگر چل پڑے تو پھر اُسے روکنا ناممکن ہوتا ہے۔ میری بچیوں پر اگر کوئی تہمت لگ گئی تو ساری عمر ماں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائیں گی۔ ہماری غریبی پر کچھ رحم کرو۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے اور اس سے بھی چھوٹا ہمارا محلّہ ہے۔ یہاں بات پھیلتے دیر نہیں لگتی۔ پہلے ہی تمھارے گھر کے نوکروں نے اس دن طرح طرح کی چہ میگوئیاں کی تھیں۔۔۔۔ وہ تو بھلا ہو شاکر کا۔ جس نے ان کی زبان وہیں روک دی۔ ورنہ تمھاری ماں اور بھابھی نے مجھے سولی پر لٹکانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہر حال جو ہُوا سو ہوا۔ لیکن میری عزّت تمھارے ہاتھ میں ہے۔"

"آپ یہ تصور بھی کیسے کر سکتے ہیں کہ مَیں کبھی ان جانے میں بھی آپ کی کسی بھی طرح کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہوں۔"

"تو پھر میں تم سے دوبارہ یہی التجا کرتا ہوں کہ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔ میں۔"

مولوی علیم کی آواز آنسوؤں کی لرزش سے لحہ بھر کو کانپی اور ایک پل ہی میں وہ میرے

گھٹنوں کے قریب دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور روتے ہوئے انہوں نے میرے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

مَیں چند لمحے کے لیے تو سُن ہو کر ہی رہ گیا۔ یہ انہوں نے کیا کر دیا۔ مَیں نے تڑپ کر ان کے بندھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ مولوی علیم کی اب باقاعدہ رو رو کر ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے مجھے مزید گناہ گار اور شرمندہ نہ کریں۔ میرا مقصد ہر گز آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ مَیں تو ۔۔۔۔"

ان کی حالت دیکھ کر جیسے میں اپنے لفظ ہی کھو بیٹھا تھا۔ میری بات کاٹ کر بولے۔

"تو پھر میری بات مان لو۔ تمھارا اور اس کا میل نہیں ہو سکتا۔ تمھارے گھر والے اور ہمارا معاشرہ اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کرے گا۔ وہ زمین کی خاک ہے، اور تم آسمان ہو۔ تم جہاں کہیں بھی جاؤ گے کمشنر کے بیٹے ہی کہلاؤ گے اور وہ جہاں کہیں سے بھی گزرے گی ایک غریب مولوی کی بیٹی ہی کہلائے گی۔ لوگ اس ملن کو عجیب عجیب طرح کے نام دیں گے۔ کل تک وہ الزام صرف تمھارے گھر والوں کی زبان پر تھے، تب ساری دُنیا پیٹھ پیچھے یہی باتیں کرے گی۔ مَیں ایک پیش امام ہوں، لوگ میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ سوچو کل جب یہی لوگ میری پیٹھ پیچھے میرے گھر کی عزت اور ناموس پر انگلیاں اُٹھائیں گے تو مَیں کیسے جی پاؤں گا۔ اس سے بہتر تو یہی ہے کہ مَیں خود اپنے ہاتھوں سے اُس کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالوں۔"

بس ۔۔۔۔ اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں جکڑے مولوی صاحب کے ہاتھوں کو زور سے دبایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ آنسوؤں کا سیلاب اب بھی ان کی سفید داڑھی کو تر کر رہا تھا۔ مَیں کچھ اس طرح سے مسجد سے نکلا کہ جیسے کوئی جواری جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا چکا ہو۔ یکا یک آخری بازی بھی ہار دے۔ جانے میں کس طرح تانگے تک پہنچا۔ خیرو میری حالت دیکھ کر بوکھلا گیا۔ اُس نے جلدی سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

"اوئے خانہ خراب ۔۔۔۔ بابو تیرا بخار تو شدید تیز ہو گیا ہے۔"

خیرو نے جلدی سے مجھے تانگے کی پچھلی سیٹ پر آڑھا ترچھا لٹایا اور اُس نے تانگہ ـک پر ڈال دیا۔ مجھ پر جیسے غنودگی کی سی اِک کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے خود پر ـدید غصہ بھی آ رہا تھا۔ مجھے مولوی صاحب سے اس وقت یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے مَیں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آخری اُمید کا بھی خون کر دیا ہے۔

اِنسان بھی کتنا بے صبرا ہے۔ جب تک اُمید کا دامن ہاتھ میں ہو، تب تک وہ اپنے زخم کریدنے سے باز نہیں آتا۔ ہر بار اس اُمید میں زخموں کا کھرنڈ پکنے سے پہلے ہی دوبارہ کھرچ دیتا ہے۔ اور جب زخم اس بار بار کی چھیڑ چھاڑ سے پک کر ناسور بن جاتا ہے تب وہی ـسان بیٹھ کر ساری زندگی خود کو کوستا رہتا ہے۔

اُس وقت مولوی صاحب کی جو حالت ہو رہی تھی اُسے دیکھتے ہوئے وہاں سے میرا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ اس وقت مولوی صاحب کسی بھی قسم کی توجیہہ سننے کے قابل نہیں تھے۔ ـہوں نے ٹوٹ کر اپنی انا کا خول بھی اپنے آپ ہی پاش پاش کر دیا تھا۔ کاش وہ اس دن بھی ـپنے اُسی آپے میں ہی رہتے، مجھے ڈانٹتے، بُرا بھلا کہتے، دھتکار دیتے، دھکے دے کر مسجد ـے نکال دیتے، پر وہ نہ کرتے جو انہوں نے کیا تھا۔ اَب مَیں ان کا سامنا کیسے کروں گا؟ ـرے لیے تو جیسے ہر دَر ہی بند کر دیا تھا انہوں نے۔

جانے میرے ذہن میں کیسے کیسے وسوسے پلتے رہے۔ خالی سنسان سڑک پر تانگہ ـزی سے ٹک ٹک کی آوازیں نکالتا اسٹیشن کی جانب رواں تھا۔ سڑک کے کنارے لگی پیلی ـجی بتیوں کے دائرے روڈ پر وقفے وقفے سے پھیلے ہوئے تھے۔ میرا ذہن بھی ان دائروں کی ـشنی کے بیچ میں سڑک کے اندھیرے حصے کی طرح کبھی ڈوب جاتا اور کبھی روشن ہو جاتا۔ ـٹیشن پہنچنے سے پہلے ہی مَیں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اور میرا ذہن مکمل اندھیرے میں ـوب چکا تھا۔

OO

جیوری کا فیصلہ

مَیں نہیں جانتا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے بلایا یا نہیں، لیکن تین دن کے اندر انکوائری کمیٹی نے اپنا فیصلہ نوٹس بورڈ پر چپکا دیا۔ مجھے اور جم (Jim) دونوں کو ایک ایک سمسٹر کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ایک سمسٹر کا مطلب چھ مہینے کا تھا۔ البتہ ہمیں موقع دیا گیا تھا کہ ہم اس فیصلے کے خلاف یونیورسٹی انتظامیہ سے اپیل کر سکتے تھے۔ لیکن تین دن کے اندر اس کے بعد ہم یہ حق بھی کھو دیتے۔

اس دوران میرا اور جم کا ایک آدھ بار یونیورسٹی کیمپس میں سامنا ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو۔ جم جیسے لڑکوں کے لیے چھ مہینے کی معطلی صرف ایک پکنک تھی۔ اس کا مقصد کسی بھی طریقے سے مجھے یہاں سے باہر نکالنا تھا۔ مجھے تو اب یونیورسٹی انتظامیہ بھی اُس کی سازش میں برابر کی شریک دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گورے ہر کام بہت سوچ سمجھ کر اور طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں کا قانون اس قدر سخت ہے کہ مجھے بغیر کسی انکوائری کے یونیورسٹی سے نکال دینے میں انہیں اس بات کا خدشہ ہوگا کہ مَیں کہیں عدالت کا دروازہ نہ کھٹکھٹا دوں۔ اس لیے انہوں نے پکا انتظام کیا تھا اور اپنی ایمان داری اور انصاف ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے جم کو بھی قربانی دینے پر تیار کر لیا تھا۔

پوری یونیورسٹی میں میرے واحد غمگسار صرف جوزف اور ربیکا تھے۔ ربیکا کے تو آنسو ہی نہیں رک پا رہے تھے۔ میں اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا کہ ابھی حتمی فیصلہ ہونا باقی ہے لیکن وہ ربیکا ہی کیا جو کسی کی بات مان لے۔

آج یونیورسٹی میں اپیل داخل کروانے کا آخری دن تھا، ورنہ کل سے مجھے یہ کیمپس چھوڑ دینا تھا۔ مَیں سیدھا ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اندر کمیٹی کے چاروں ارکان

موجود تھے۔ سر آئزک نے دوبارہ مجھے تمام روداد پڑھ کر سنائی اور یہ بھی بتایا کہ یونیورسٹی انتظامیہ میرے تحریری جواب سے مطمئن نہیں ہو پائی لہٰذا میرے ایک سمسٹر کے لیے معطلی کا فیصلہ برقرار رکھا گیا ہے۔ مَیں نے براہِ راست سر آئزک کی آنکھوں میں دیکھا لیکن وہ نظر چُرا گئے، میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آج ہفتے کا دن ہے۔۔۔ اور مَیں جانتا ہوں کہ چیئرمین انکوائری کمیٹی مسٹر آئزک کے لیے یہ کس قدر مقدس دن ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ آج کے دن کوئی جانبدارانہ فیصلہ نہیں کریں گے۔“

ہفتہ یہودیوں کے لیے ویسا ہی مقدس دن ہوتا ہے، جیسا ہمارے لیے جمعہ، مسٹر آئزک میرے اس طنز کو سمجھ گئے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ جیوری نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے مزید اپنی صفائی میں تو کچھ نہیں کہنا۔ مَیں نے انکار میں سر ہلایا۔ جیوری نے فیصلے پر دستخط کے لیے اپنے قلم اُٹھا لیے۔

پھر اچانک ہی دروازہ کھلا اور سارہ کسی آندھی کی طرح اندر داخل ہوئی۔ سر آئزک نے ناگواری سے اُسے دیکھا۔

”مس سارہ۔۔۔ کیا آپ نہیں جانتیں کہ آج ڈین آفس میں روزانہ کے معمولات نہیں نپٹائے جا رہے۔ آج یہاں ایک اہم انکوائری کا فیصلہ سنایا جا رہا ہے۔“ سارہ نے جلدی سے اپنی سانس درست کی۔

”مَیں بھی اُسی انکوائری کے سلسلے میں جیوری کی مدد کرنے آئی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیان کمیٹی کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد دے گا۔“

سر آئزک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارہ کو کسی بھی طریقے سے کمرے سے باہر بھجوا دیں۔ لیکن بات چونکہ دوسرے ممبران پر بھی کھل چکی تھی لہٰذا انہیں مجبوراً سارہ کو برداشت کرنا پڑا۔ انہوں نے پھر بھی حتمی لہجے میں کہا اور اس بار ان کے لہجے میں شدید سختی تھی۔

”مَیں نہیں سمجھتا مس سارہ کہ اس موقعے پر کسی مزید بیان کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ مسٹر حماد خود اپنا فائنل بیان دے چکے ہیں۔ اور ہم نے فیصلہ بھی سنا دیا ہے بس اس فیصلے پر ہمارے دستخط ہونا باقی ہیں۔“

سارہ شاید ان کے لہجے میں چھپی دھمکی کو محسوس کر گئی۔ اُس نے بھی حتمی لہجے میں ہی کہا۔

”کوئی بھی فیصلہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انصاف کے تمام تقاضے نہ پورے کیے جائیں۔ مَیں اس واقعے کی عینی گواہ ہوں اور مجھے آج تک کمیٹی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ مسٹر حماد نے میرا نام بطور گواہ کمیٹی کو پیش کیا تھا۔۔۔؟ بہر حال میں یہ بیان دینے آئی ہوں کہ اس تمام واقعے میں مسٹر حماد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ جم نے ہی جھگڑا شروع کیا تھا اور میرے سامنے حماد کو یونیورسٹی سے نکل جانے کے لیے کہا تھا۔ جواب میں حماد نے جم سے کچھ نہیں کہا۔“

سر آئزک کا بس چلتا تو اُسی وقت سارہ کو وہاں سے غائب کروا دیتے۔

سارہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی ایک لمبی سی فہرست لہرائی۔

”یہ ان چالیس طلباء کی فہرست ہے جن کے سامنے یہ سارا واقعہ اس دن پیش آیا تھا۔ یہ سب بھی اس وقت میرے ساتھ ہی آئے ہیں اور آپ کے آفس کے باہر اپنا بیان ریکارڈ کروانے کے لیے جمع ہو چکے ہیں۔ اگر کمیٹی اجازت دے تو ان سب کا بیان بھی ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔“

گویا سارہ پورا انتظام کر کے آئی تھی۔ سر آئزک کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا۔

”نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، ان بدلے ہُوئے حالات میں کمیٹی کو اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنا ہوگی، جیوری ممبرز کی کیا رائے ہے۔“

تمام جیوری کے ممبران نے یہ بات تسلیم کی کہ سارہ کے بیان کے بعد صورت حال بالکل مختلف ہوگئی ہے۔ لہٰذا نظرِ ثانی کے لیے انہیں تین دن کی مہلت دی جائے۔ سر آئزک کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ بازی ہار چکے ہیں۔ مجھے جانے کی اجازت دے دی گئی اور جب مَیں ڈین کے کمرے سے باہر نکلا تو میری پوری کلاس اور یونیورسٹی کے اور بہت سے طلباء باہر میرے انتظار میں اکٹھے تھے۔ سارہ نے جب انہیں بتایا کہ میرے خلاف فیصلہ واپس لے لیا گیا ہے تو سب سے پہلے چلّانے اور نعرہ لگانے والی ربیکا تھی۔ پھر اس کے بعد تو

وہ شور مچا کہ اندر سے سر آئزک کا پی۔اے گھبرا کر باہر نکل آیا اور سب کی منت کرنے لگا کہ ہم یہاں سے دُور چلے جائیں کیونکہ سر آئزک ناراض ہو رہے ہیں۔ ربیکا نے فوراً ہی پوری یونیورسٹی کو اسی وقت ایک بڑی ٹریٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ بقول اس کے، اس کے باپ کے آسٹریلین پاؤنڈ کس دن کام آئیں گے۔ سب لوگ ہنستے، شور مچاتے کیفے ٹیریا کی طرف چل پڑے لیکن سارہ خاموشی سے دوسری جانب پلٹ گئی۔ میری نظر اس پر تب پڑی جب وہ مرکزی عمارت سے باہر جانے والی راہداری میں مُڑ رہی تھی۔ مَیں فوراً اس کے پیچھے لپکا۔ تب تک وہ کافی آگے جا چکی تھی۔

''سارہ۔۔۔۔ میری بات سنو۔۔۔۔ پلیز رکو۔''

وہ ٹھہر گئی، مَیں اُس کے قریب پہنچا۔

''شکریہ۔''

''کس بات کا۔''

''میرا ساتھ دینے کا، آج اگر تم وقت پر نہ آتیں تو کیس میرے خلاف جا رہا تھا۔''

''مَیں نے تمھارا نہیں سچ کا ساتھ دیا ہے۔ اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں۔''

''اس دنیا میں سچ کا ساتھ دینے والے کم ہی لوگ رہ گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم بھی اُن میں سے ایک ہو۔''

سارہ ہلکے سے مسکرائی۔ ''تو پھر خدا کا شکریہ ادا کرو کہ اس نے ان نایاب لوگوں میں سے ایک سے تمھاری ملاقات کروادی۔''

مَیں بھی اس کی بات سُن کر مسکرا دیا۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن وہ شکریہ مَیں اس سے اکیلے میں کہہ دوں گا۔ فی الحال تمھارا شکریہ۔'' مَیں پلٹا اور واپس جانے لگا۔ سارہ نے کچھ سوچ کر مجھے آواز دی۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ تم نے انکوائری کے سامنے گواہی کے لیے میرا نام کیوں دیا۔ مَیں تو خود ان میں سے ایک تھی جو تم سے جھگڑ رہے تھے۔''

''پتہ نہیں کیوں۔۔۔۔ مجھے تم ایک سچی لڑکی لگتی ہو، سوچا کہ ایک بار اپنا یہ بھرم بھی آزما ہی لوں۔

سارہ ہنسی، پہلی مرتبہ مجھے پتہ چلا کہ ہنسنے سے اُس کے گالوں میں دو ننھے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

''واہ۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔ کیا موقع ڈھونڈا ہے جناب نے اپنے بھرم آزمانے کا، مَیں اگر وقت پر نہ پہنچتی تو۔۔۔؟

''میرا سچ پر سے یقین اُٹھ جاتا۔''

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''کافی خطرناک لگتے ہو۔'' وش یو بیسٹ آف لک'' Wish you best of luck۔

سارہ ہنستی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ یہ ہماری دوستی کا پہلا دن تھا۔ بعد میں ربیکا نے مجھے بتایا کہ سارہ کو انکوائری کمیٹی نے گواہی کے لیے طلب ہی نہیں کیا تھا۔ نہ ہی اس نے خود اس کی ضرورت محسوس کی تھی کیونکہ جم بہر حال اس کا بہت پُرانا اور سب سے اچھا دوست تھا، لیکن جب ربیکا نے سارہ کو یہ بتایا کہ خود مَیں نے انکوائری کمیٹی کے سامنے سارہ کا نام بطور گواہ دیا ہے تو وہ چند لمحوں کے لیے تو سن ہو کر ہی رہ گئی تھی۔ اُسے بالکل بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسی پر یہ سارا معاملہ ڈال دوں گا۔ ربیکا کو اب تک اس بات پر حیرت تھی کہ سارہ میرے حق میں گواہی دینے پر کیسے راضی ہوگئی۔ نہ صرف خود بلکہ اس نے آدھی یونیورسٹی کو بھی اس بات کے لیے راضی کر لیا تھا۔ ربیکا سے ہی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ سر آئزک سارہ سے اس بات پر اس قدر ناراض ہوئے کہ کئی دن انہوں نے اس سے بات ہی نہیں کی۔ جانے سارہ نے اس سارے معاملے کو کس طرح سے نپٹایا ہوگا۔ واقعی وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔

تیسرے دن کمیٹی نے مجھے اور جم دونوں کو ڈین کے کمرے میں بلایا اور بتایا کہ میرے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا لہٰذا مجھے بری کیا جا رہا ہے، جبکہ جم کو ایک سمسٹر کے لیے یونیورسٹی چھوڑنی پڑے گی۔ اس کے بعد بھی یونیورسٹی انتظامیہ اُسے واپس لینے سے پہلے کمیٹی بٹھائے گی۔ جم کا چہرہ لٹک گیا۔ مَیں نے ڈین سے کچھ کہنے کی درخواست کی۔ ڈین نے اجازت دے دی۔

''سر میری جم سے کوئی ذاتی جنگ نہیں ہے۔ اس دن میں شاید اس کی بات ٹھیک طرح

سے سمجھ نہیں پایا جب کہ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ جم اور ڈیوڈ کا ایک سنجیدہ قسم کا مذاق تھا۔ لیکن ردعمل اس تیزی سے ہوا کہ ہم میں سے کسی کو بھی سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں جیوری سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی معمولی بات کے لیے جم کو یونیورسٹی سے خارج نہ کیا جائے۔ ہم دونوں کو اس مذاق کے لیے بھاری جرمانہ کر دیا جائے تو بھی ہم اسے انتظامیہ کی میزبانی سمجھیں گے۔"

جم حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ جیوری نے میرے "سچ" کی تعریف کی اور ہم دونوں کو ایک تنبیہہ کے بعد کلاس لینے کی اجازت دے دی گئی۔ جم کو کچھ کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے روک لیا گیا اور مَیں ڈین آفس سے نکل آیا۔

اگلے دن مَیں کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ نینسی میڈیم اکنامکس کا لیکچر دے رہی تھیں کہ جم کلاس میں داخل ہوا۔ وہ ویسے بھی کلاس میں آنے جانے کے لیے کبھی اجازت لینے کا تکلف نہیں کرتا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف بڑھا اور میرے ڈیسک کے قریب خاموش کھڑا ہوگیا۔ ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ خود نینسی میڈیم کی آواز بھی حلق سے نہیں نکل پا رہی تھی۔ کچھ دیر وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر گھورتا رہا۔ کلاس پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ریکا نے میرا ہاتھ زور سے تھام رکھا تھا۔ پھر جم نے بنا کچھ کہے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر پھیلا دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ جم نے مجھے کھینچ کر گلے لگا لیا۔ ساری کلاس نے ڈیسک بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ریکا نے جانے کہاں سے سیٹی مارنا سیکھ لی تھی۔ اُس کی سیٹیاں کلاس میں گونجتی رہیں۔ میری نظر سارہ پر پڑی وہ دُور بیٹھی مسکرا رہی تھی میرے دل نے کہا۔ "محبت فاتح عالم۔۔۔"

OO

بے خودی

جب مجھے ہوش آیا تو دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ لیکن یہ جگہ تو میرے لیے کچھ غیر مانوس سی تھی۔ میں کچھ دیر تک گم صم سا لیٹا یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کہاں ہوں۔ رات کو تو خیرو مجھے تانگے میں لاد کر اسٹیشن کے لیے ہی نکلا تھا۔ پھر یہ کشادہ سا کمرہ صاف ستھرا بستر، اُجلے اُجلے سے پردے اور بڑے بڑے سے روشن دانوں اور کھڑکیوں والا ٹین کی سیون ٹائپ چھت والا کمرہ کس کا تھا؟

کچھ فاصلے سے ٹرین کا بھونپو بجا اور ٹی ٹی کی سیٹی سنائی دی۔ مطلب یہ جگہ اسٹیشن کے قریب ہی تھی۔ پر یہ کس کا گھر ہے؟ مَیں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر اُٹھاتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے سر کی جگہ لوہے کا کوئی بھاری گولہ میرے کاندھوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہو۔ میں ایک کراہ کے ساتھ سر پکڑ کر دوبارہ ڈھے سا گیا۔ میری آواز سن کر باہر کچھ آہٹ ہوئی اور پھر صدیقی صاحب ہاتھ میں کچھ گولیاں اور جوس کا گلاس لیے اندر داخل ہوئے۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر انہوں نے جلدی سے مجھے کاندھے سے پکڑ کر دوبارہ لٹا دیا۔

"لیٹے رہو۔۔۔ ابھی تمھاری حالت پوری طرح سنبھلی نہیں ہے۔"

"لیکن سر مَیں۔۔۔ یہاں۔ کیسے؟"

"میاں تم خود تو کبھی کچھ بتاتے نہیں ہو۔۔۔ جانے سارا درد خود ہی سہنے کی یہ کیا ضد ہے تمھاری۔ پر تمھارا بھی قصور نہیں ہے۔ شاید یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔" انہوں نے مسکرا کر دو گولیاں میرے منہ میں ڈال کر زبردستی آدھا گلاس پانی میرے حلق سے نیچے اُتار دیا۔ مجھے انہیں یوں اپنی خدمت کرتے دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوئی۔ مَیں نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی۔

"سر مَیں اب ٹھیک ہوں۔ پر میں یہاں آیا کیسے؟"

انہوں نے تکیہ میری پشت پر سیدھا کر کے مجھے بیٹھنے میں مدد دی۔

''خیر وتمھیں شدید بخار اور ہذیان کی کیفیت میں تین دن پہلے رات کو یہاں اپنے تانگے پر ڈالے لایا تھا۔''

میں اُچھل ہی تو پڑا۔

''تین دن پہلے۔۔۔۔لیکن مَیں تو کل رات۔''

''ہاں میاں۔۔۔تم تین دن تک تقریباً بے سدھ ہی بخار میں پڑے سڑتے رہے ہو۔ میں نے سوچا ریلوے کے ہسپتال سے بہتر ہے کہ یہیں گھر پر ہی تمھاری نگہداشت کی جائے۔ ڈاکٹر روزانہ تین وقت آتا رہا ہے۔ شکر ہے کہ آج صبح سے بخار کچھ ٹوٹا ہے۔ لیکن ابھی تم کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا کسی بھی قسم کی ضد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ٹھیک نہ ہو جاؤ یہاں سے ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔''

یا خدا۔۔۔ میں تین دن سے اس بیماری کی حالت میں یہاں اس شریف انسان پر بوجھ بنا رہا۔ مجھے اپنی کیفیت پر غصہ آ گیا۔ مَیں نے انہیں اتنی تکلیف پہلے ہی دے دی تھی۔ اب مزید نہیں۔

''سر آپ یقین کریں مَیں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ پہلے ہی تین دن آپ اور آپ کے گھر والوں پر بوجھ بنا رہا ہوں، مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔''

''میاں پہلے تو یہ بوجھ والی بات واپس لے لو۔ دوسری بات یہ کہ میں اس گھر میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ بیوی سے مزاج مل نہیں پایا لہٰذا وہ سال میں دس مہینے میکے میں ہی گزارتی ہیں۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ بس مَیں ہوں اور گھر کے دو چار نوکر ہیں۔ خوب مزے میں کٹ رہی ہے۔''

وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''ویسے بھی آدمی بنا شادی کے تنہا رہے تو اتنا مزہ نہیں آتا جتنا شادی کے بعد بیوی کے میکے جا کر رہنے کی صورت میں تنہائی میسر آنے کے بعد آتا ہے۔ یقین نہ آئے میری بات پر تو شادی کے بعد بیوی کو میکے بھیج کر کبھی تنہا رہ کر دیکھنا۔''

میں بھی مسکرا دیا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہے سر۔۔۔۔لیکن میں اس طرح یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔ میں

جانتا ہوں میں آپ کی تنہائی میں مخل ہوتا رہا ہوں۔''

''ارے یار تنہائی تو اپنی جنم جنم کی ساتھی ہے، وہ بھی میرے ساتھ رہتے رہتے کبھی کبھی اُکتا سی جاتی ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔''

''میری لاکھ ضد کے باوجود صدیقی صاحب نے مجھے اس گھر سے تو کیا اس کمرے سے بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔ البتہ شام کو جب نوکر نے برآمدے میں چائے لگ جانے کی اطلاع دی تب وہ مجھے لیے برآمدے میں آ گئے۔

کوئٹہ میں ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے ہوتی ہوئی ایک ذیلی سڑک آگے جا کر بائیں ہاتھ کو ایک مرکزی سڑک سے مل جاتی ہے۔ اسی سڑک سے ملی ہوئی ہے یہ ٹھنڈی سڑک جسے عرف عام میں کالون روڈ کہتے ہیں۔ اسی ٹھنڈی سڑک پر ریلوے کے بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ صدیقی صاحب کا چھوٹا سا بنگلہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ریلوے کی مخصوص برٹش دور کی طرز تعمیر والے سُرخ ٹین کی چھت والے یہ بنگلے خاص طور پر کوئٹہ کے موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی راج میں تعمیر کیے گئے تھے۔ کمروں کے باہر برآمدہ جس میں تھوڑے فاصلوں پر مخصوص لکڑی کے سبز رنگ کیے ہوئے ستون، برآمدے کو تھامے ہوئے تھے اور برآمدے کے سامنے کشادہ سا باغیچہ جس میں انار، انگور، سیب اور ناشپاتی کے درخت اور بے تحاشا پھول لگے ہوئے تھے۔ صدیقی صاحب کافی اعلیٰ ذوق معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔

''اپنی بے ہوشی کے ہذیان میں تم بہت کچھ بولتے رہے ہو۔ لیکن اس میں سے زیادہ تر باتیں تم اُردو میں نہیں بلکہ انگلش میں کر رہے تھے۔ شاید تم اپنے گھر میں زیادہ اُردو نہیں بولتے تھے؟''

جس بات کا مجھے ڈر تھا، صدیقی صاحب نے وہی بات آخر پوچھ ہی لی۔ میں پہلے ہی یہ سن کر چونک گیا تھا کہ میں تین دن بے ہوشی کے عالم میں یہاں پڑا رہا ہوں جانے اپنے ہذیان میں کیا کیا بک گیا تھا مَیں۔۔۔؟

میں چند لمحے چُپ رہا، صدیقی صاحب نے بات جاری رکھی۔

''اگر تم نہ بتانا چاہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میں جس دن تم سے پہلی مرتبہ ملا

تھا۔ اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جو تم دوسروں کو نظر آتے ہو۔ تمھاری آنکھیں، تمھارا لہجہ، تمھارے ہاتھ ۔۔۔ سب تمھیں ان لوگوں سے الگ دکھاتے ہیں جن میں تم اتنے دنوں سے رہ رہے ہو۔ مَیں نہیں جانتا کہ تمھاری کیا مجبوری ہے۔ لیکن بے ہوشی کے دوران تمھارے منہ سے اس قدر شستہ انگریزی سُن کر مجھے کچھ زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی۔ لیکن زمانے سے اس قدر ناراضگی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کہہ دینے سے بھی دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو جاتا ہے۔''

مَیں آہستہ سے بولا۔

''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ خاص زیادہ ہے بھی نہیں۔ ایک مقصد کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا جو اَب میری زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔ اب میری زندگی اور میرے دن اور رات کا مقصد ہی صرف یہ کھوج ہے۔ اور شاید یہ مختصر زندگی اب اسی کھوج میں کٹ جائے گی۔ بس اتنا سا فسانہ ہے میرا۔''

صدیقی صاحب کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔

''ہوں ۔۔۔ خوش نصیب ہو گویا ۔۔۔ کوئی مقصدِ عشق تو ہے زندگی میں اور سچ مانو تو یہی زندگی کا حاصل بھی ہے۔ اگر کبھی میں اس سلسلے میں تمھارے کسی کام آ سکوں تو مجھے ضرور بتانا۔ اپنی بھی حسرت ہے میاں کہ زندگی میں کچھ تو ایسا کر جائیں جس پر ہمیں بھی ناز ہو۔ عشق نہ سہی ۔۔۔ معاونتِ عشق ہی سہی۔''

صدیقی صاحب نے کچھ اس طرح سے ''معاونتِ عشق'' کی اصطلاح استعمال کی جیسے خالص پولیس والے کسی کے لیے ''معاونتِ جرم'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔

دو دن مجھے صدیقی صاحب نے بالکل کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تیسرے دن بڑی مشکل سے میں نے اپنی واپسی کے لیے رضامند کیا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ میں ہر روز شام کو چائے پر ان سے ملنے ضرور آؤں گا۔ انہوں یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی دن ناغہ کیا تو وہ خود ڈرائی پورٹ کے گوداموں سے مجھے لے جانے کے لیے آ پہنچیں گے۔ ان کا آخر تک یہی اصرار رہا کہ مَیں ان کی طرف ہی منتقل ہو جاؤں۔ مجھے مطمئن کرنے کے لیے انہوں نے

مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ مجھ سے میری گذشتہ زندگی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کریں گے۔ مَیں نے انہیں بصد مشکل یقین دلایا کہ میرے وہاں نہ رکنے کی وجہ میرا ماضی یا صدیقی صاحب کے سوالوں کا خوف نہیں ہے۔ بلکہ میرے وہاں رکنے سے میرے اس مقصد کو ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ جس کے لیے میں گھر بار تیاگ کر یہاں اسٹیشن پر آ بیٹھا تھا۔

بڑی حُجت کے بعد مَیں نے ساتویں دن کی شام انہیں ان کے بنگلے کے گیٹ سے مل کر واپس اندر بھیجا ورنہ وہ مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے کے لیے جانے پر بضد تھے۔ ان کے گھر سے نکل کر مَیں ٹھنڈی سڑک پر پیدل اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا عجیب اور مہربان شخص ہے۔ ایک اجنبی کو اس نے سات دن میں ہی اتنا اپنا لیا کہ اس کی واپسی پر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ واقعی، انسان ہی انسان کا سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر میرے پہنچتے ہی سب کو خبر ہو گئی اور وہ سب میرے آس پاس یوں جمع ہوتے گئے جیسے شہد کے چھتے پر مکھیاں ۔۔۔

سب ہی کو فرداً فرداً یقین دلانا پڑا کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ان میں سے کئی تو مجھ سے یوں پرتپاک انداز میں گلے ملتے رہے جیسے میں کسی محاذِ جنگ سے واپس لوٹا ہوں۔ پھر مجبوراً غفورے کو مداخلت کرنا پڑی اور اُس نے اپنی گرج دار آواز میں سب کو حکم دیا کہ بابو حماد کی طبیعت ابھی مشکل سے سنبھلی ہے۔ اگر سب میرے گرد یونہی جمع رہے تو مجھے آرام کا موقع نہیں ملے گا لہٰذا فی الحال سب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ غفورے کا حکم ٹالنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا بھیڑ رفتہ رفتہ چھٹ ہی گئی۔ غفورے نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بینچ پر بٹھا دیا اور خود میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''میں جانتا تھا باؤ ۔۔۔ تم زیادہ دن صدیقی صاحب کے گھر نہیں ٹکو گے۔ اور سیدھے یہیں واپس آؤ گے۔ تم اس گھر کا آرام اور سکھ زیادہ دن برداشت نہیں کر پاؤ گے، تمھیں اَب بے آرامی اور بے سکونی میں ہی سکھ ملتا ہے۔''

وہ شاید میرے صدیقی صاحب کے گھر سے واپس چلے آنے پر خفا تھا۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ناراض ہو؟''

''جانے دے باؤ۔۔۔اپنی ناراضی کس کام کی۔ تُو نے غفورے کو کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں، ورنہ اس مولوی والی بات کو مجھ سے نہ چھپاتا۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں باؤ۔۔۔خیرو تانگے والے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس دن جب تم بخار میں اس مسجد میں اندر گئے اور پھر بہت دیر تک باہر نہیں نکلے تو خیرو گھبرا کر تمھارے پیچھے اندر مسجد میں گھس گیا تھا کہ کہیں تمھاری طبیعت زیادہ خراب نہ ہوگئی ہو۔ پر اندر جانے سے پہلے ہی اس نے تمھاری اور مولوی صاحب کی باتیں سن لی تھیں۔ پر خیرو بھی یاروں کا یار ہے۔ اس نے یہ باتیں اور کسی کو نہیں بتائی ہیں۔ وہ تمھیں صدیقی صاحب کے گھر چھوڑ کر سیدھا میرے پاس آیا تھا۔ شاید وہ مجھے بھی کچھ نہ بتاتا۔ پر وہ تیری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوگیا تھا کہ خدانخواستہ کہیں تجھے کچھ ہو ہی نہ جائے۔ اگر ایک آدھ دن مزید تیری حالت نہ سدھرتی تو ہم سیدھے تیرے گھر چلے جاتے بتانے کے لیے۔''

میں پھر حیرت سے چونکا۔

''میرے گھر۔۔۔؟''

''ہاں باؤ۔۔۔خیرو نے سن لیا تھا جو بھی اس مولوی نے کہا تھا۔ تُو لاٹ صاحب کا بیٹا ہے، ہمیں سب پتہ چل گیا ہے۔''

شاید غفورا کمشنر صاحب کو ہی لاٹ صاحب کہہ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اس دن مجھ سے کہا تھا کہ تم جہاں بھی جاؤ گے کمشنر کے بیٹے ہی کہلاؤ گے۔ مطلب میرا ہر راز کھل چکا تھا۔ شاید اب یہاں سے بھی میری رخصت کا وقت ہو ہی چلا تھا۔ آج نہیں تو کل یہ سب لوگ میری اصلیت جان جائیں گے۔ مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ غفورا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے۔

''لیکن خبردار جو تو نے اب یہاں سے کہیں اور جانے کا سوچا بھی تو۔ قسم مولا کی، میں تجھے رسیوں سے باندھ دوں گا اور سب کو بتا دوں گا کہ یہ کون سا شہزادہ اتنے دن سے ہمارے بیچ رہ رہا ہے۔''

مجھے غفورے کی بات پر ہنسی آ گئی۔ اس نے فوراً میرے ہاتھ پکڑ لیے اور روہانسا ہو کر بولا۔

''دیکھ باؤ۔۔۔تجھے میری دوستی کا واسطہ۔۔۔اب یہاں سے کہیں نہ جانا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیری کوئی بھی بات باہر نہیں نکلے گی۔ پر تُو اگر یہاں سے چلا گیا تو غفورا زندگی بھر اپنا چہرہ نہیں دیکھ پائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔میں کہیں نہیں جاؤں گا۔۔۔لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ میں روزانہ کی طرح اپنا سارا کام خود ہی کروں گا۔ تم مجھ سے دوستی میں یا میرے گھر کی حیثیت کی وجہ سے کوئی خاص سلوک نہیں کرو گے۔ ورنہ میں ایک دن بھی یہاں نہیں رکوں گا۔'' غفورے نے خوشی سے میرے ہاتھ چوم لیے۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی کی لہر دوڑ گئی۔

''تُو واقعی اس دنیا کا نہیں ہے، پر تیری محبت کی قدر یہاں کون جانے گا۔۔۔''؟ تو بولے تو میں خود جا کر اس مولوی کے پیروں میں گر جاؤں گا۔ ساری زندگی اس کی غلامی کروں گا۔ بس تو ایک بار حکم کر دے۔''

''نہیں۔۔۔یہ معاملہ حکم کا نہیں ہے۔ عرض کا ہے۔۔۔ میں نے بھی اپنی عرضی ڈالی ہوئی ہے۔ اب سوائے انتظار کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

غفورے کی آنکھوں میں میرے لیے ایک خاص سی عقیدت در آئی تھی۔ وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے خیرو تانگے والا بھی آیا اور بہت دیر تک مجھ سے گلے مل کر اس نے مجھے جکڑ رکھا۔ یہ غریب لوگ بھی جذبوں کے معاملے میں کتنے امیر ہوتے ہیں۔ جس کسی کو ایک بار دل میں بٹھا لیں تو پھر اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ بس شرط صرف اتنی سی ہے کہ کوئی ان کے دل کو چھو لینے والا ہونا چاہیے۔ خیرو اور غفورے دونوں نے میرے دل کی آرزدگی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دوبارہ مجھ سے مولوی صاحب یا میرے گھر والوں کی کوئی بات نہیں کی۔ بس ادھر ادھر کی ہانکتے رہے۔ وہ دونوں ایک معاملے میں ایک دوسرے کے حریف بھی تھے۔ دونوں کا پسندیدہ فلم اداکار دلیپ کمار تھا اور دونوں ہی ہمہ وقت خود کو دلیپ کمار کا حقیقی پرستار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش میں لگے رہتے تھے۔

خیرو ہر وقت کسی ایک فلم کا حوالہ دیتا تھا جس میں دلیپ صاحب نے تانگے بان کا

کردار ادا کیا تھا اور خیرو بتاتا تھا کہ جس دن سے اس نے وہ بلیک اینڈ وائٹ فلم دیکھی ہے تب سے وہ دلیپ کمار کی طرح ہی تانگہ چلاتا ہے۔

وہاں غفورے کو ایک ایسی فلم یاد تھی جس میں اس کے پسندیدہ ہیرو نے مزدور لیڈر کا رول بالکل اسی طرح ادا کیا تھا جس طرح غفورا خود اصل زندگی میں تھا۔ عام طور پر جب یہ دونوں اکٹھے ہوتے تھے تو میں جان بوجھ کر دلیپ کمار صاحب کی کوئی بات چھیڑ دیتا تھا جس کے بعد گھنٹوں ان دونوں کی بحث جاری رہتی اور یہ بحث آخر کار دونوں کے اس دن کے جھگڑے کی صورت میں ختم ہوتی۔ اس دن بھی خیرو غصے میں روٹھ کر چلا گیا کیونکہ غفورے نے اس سے کہہ دیا تھا کہ دلیپ کمار جیسے بڑے اداکار کو تانگے بان جیسا معمولی کردار ادا ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔

ہم دونوں خیرو کے اس جذباتی پن میں اُٹھ کر چلے جانے پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔ پھر اچانک جیسے غفورے کو کچھ یاد آ گیا اور اس نے اپنے ہی سر پر زور سے ایک چپت ماری۔

”دھت تیرے کی غفورے۔۔۔ پھر بھول گیا نا۔۔۔“

میں نے حیرت سے غفورے کی جانب دیکھا۔

”کیا ہوا، کچھ بھول گئے ہو کیا۔“

”باؤ تیرے آنے کی خوشی میں دیکھ ذہن سے ہی نکل گیا تھا۔ تیرے بیمار پڑنے کے بعد پچھلے ہفتے میں ایک داڑھی والا جوان سالڑ کا دوبارہ [illegible] پوچھتے ہوئے اسٹیشن آیا تھا۔۔۔ بھلا سا نام بتایا تھا اُس نے۔۔۔۔“

غفورا ماتھے پر ہاتھ رکھے نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک سی گئی اور مَیں نے سرسراتی سی آواز میں نام دہرایا۔

”عبداللہ“

غفورے نے خوشی میں زور سے تالی ماری۔

”ہاں۔۔۔ عبداللہ۔۔۔ یہی نام بولا تھا اُس نے۔۔۔ بڑا پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے تیری بیماری کے بارے میں اسے بتا دیا تھا۔ کل پھر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تجھے یہ پیغام دے دوں کہ ٹھیک ہوتے ہی شاکر صاحب سے مل لینا۔۔۔ شاید کوئی ضروری کام ہو؟

میرے ذہن میں جیسے دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ عبداللہ یہاں کیوں آیا تھا؟ اس نے مجھے شاکر سے ملنے کا کیوں کہا ہے؟۔۔۔ کہیں مولوی صاحب کی طبیعت۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ لیکن عبداللہ تو خود یہاں نہیں تھا۔ وہ تو ایمان اور اُن کے گھر والوں کو لے کر مچھ گیا ہُوا تھا۔ اور جس دن میں مولوی صاحب سے آخری مرتبہ مسجد میں ملا تھا تب تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔ میرا دل جانے کیوں ڈوبنے لگا تھا۔ مغرب کی اذان کا وقت تھا۔ میں نے خیرو کو فوراً پیغام بھجوایا کہ تانگہ تیار رکھے۔ ہم ابھی کہیں کے لیے نکل رہے ہیں۔ غفورے نے مجھے لاکھ منع کیا کہ ابھی دیر ہو گئی ہے اور میری حالت بھی پوری طرح نہیں سنبھلی ہے۔ میں کل شاکر سے ملنے چلا جاؤں لیکن اب میرے دل کو ایک پل بھی قرار نہیں تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پلک جھپکتے ہی پُرانی حویلی پہنچ جاؤں۔

خیرو جس رفتار سے تانگہ بھگا سکتا تھا، بھگا رہا تھا۔ میں نے اسے جلد از جلد پُرانی حویلی پہنچنے کا کہا تھا۔ شہر کی مرکزی سڑکوں پر کچھ خاص رش نہیں تھا، جلد ہی ہم شہر کے مضافات میں حویلی کو جاتی ہوئی لمبی سڑک پر پہنچ چکے تھے۔ میں اپنے ہی وسوسوں اور خیالات میں ڈوبا ہوا تھا خدا خیر ہی کرے۔۔۔

میں اس وقت چونکا جب خیرو نے حویلی کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر زور سے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں، میں نے خیرو کو وہیں رکنے کے لیے کہا۔

نگہت حویلی کے دالان میں ہی کچی خوبانیوں کو جو شاید دھوپ میں سوکھنے کے لیے ڈالی گئی تھیں، حویلی کے نوکروں سے جمع کروا رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی وہ سب چھوڑ چھاڑ کر بھاگتی ہوئی تیزی سے میری طرف آئی۔ کچھ دیر تو اسے اپنا سانس سنبھالنے میں ہی لگ گئی۔ وہ میرے چہرے اور ہاتھوں کو بے تابی سے ٹٹولتی رہی۔

”کیا ہو گیا تھا آپ کو بھیا۔۔۔ بیمار کیسے ہو گئے تھے۔۔۔ کتنے کمزور لگ رہے ہیں۔۔۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے۔“

مجھے اس کے سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اپنی بیماری کے بارے میں مختصراً بتانا پڑا پھر میں نے چھوٹتے ہی اس سے شاکر کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ میں نے نگہت کو عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی بتایا۔

نگہت نے شاکر کے بارے میں تو یہ بتایا کہ وہ ابھی ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ وہ عبداللہ کے پیغام کے بارے میں بھی جانتی ہے لیکن بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔۔۔

مجبوراً مجھے اس کو اپنی قسم دینی پڑی۔ نگہت شاید پہلے ہی بہت دیر سے ضبط کر رہی تھی۔ میرے یوں اصرار کرنے پر اس کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ میرا دل تو پہلے ہی ہول کھائے جا رہا تھا۔ نگہت کی یہ حالت دیکھ کر تو جیسے ہی میں بالکل ہی بوکھلا گیا۔

''خدا کے لیے نگی۔۔۔ کچھ تو بتاؤ۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ مولوی صاحب کے گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔۔۔ ایمان تو ٹھیک ہے نا؟۔۔۔''

نگہت نے عجیب زخمی سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے کوئی پانی پلانے والا حسرت سے کسی دم توڑتے سپاہی کو میدان جنگ میں آخری گھونٹ سے پہلے ہی اس کی سانس رکتے ہوئے دیکھتا ہے۔

''مولوی صاحب نے ایمان کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ اگلے ماہ کی پندرہ کو اس کی رخصتی ہے۔''

چند لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری سننے، سمجھنے، دیکھنے اور بولنے کی تمام حسیات چھین لی گئی ہوں۔ مجھے اپنے آس پاس صرف اک خلا سا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اتنی غیر متوقع بات بھی نہیں تھی۔ اس دن میری مولوی صاحب سے جو آخری گفتگو ہوئی تھی اس کے بعد حفظِ ماتقدم کے طور پر انہیں کچھ ایسا ہی قدم اُٹھانا چاہیے تھا۔ وہ پہلے ہی مجھ پر واضح کر چکے تھے کہ وہ کسی صورت میرا ایمان کے لیے رشتہ قبول نہیں کریں گے۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی بدنامی اور زمانے کی باتوں کا خوف بھی ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ میری دیوانگی اور وحشت بھری حالت کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شریف باپ کو وہی کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے کیا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ خبر میرے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ نگہت کو میری اندرونی حالت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اسی لیے وہ بہت دیر تک میرے لرزتے ہاتھ پکڑے وہیں کھڑی رہی۔

انسانی اعصاب کا کھیل بھی عجیب ہے۔ شاید ایک انسان کے اندر بیک وقت یہی ایک چیز ہوتی ہے جو سب سے کمزور اور سب سے زیادہ مضبوط ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہم سب کو ایک دن مر جانا ہے۔ پھر بھی کسی اپنے کی موت کی خبر سن کر کچھ دیر کے لیے تو ہمارے اعصاب سُن سے ہو جاتے ہیں۔ شاید ہم جانتے ہوئے بھی ہر لمحہ خود کو اس انہونی کے نہ ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ ایمان کے کہیں رشتہ طے ہو جانے کی بات بھی میرے لیے اور میرے اعصاب کے لیے بھی کچھ ایسی ہی خبر تھی۔ دراصل کچھ باتوں کی سنگینی کا ہمیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب وہ سرزد ہو جاتی ہیں۔ میرے لیے یہ احساس ہی روح نچوڑ دینے والا تھا کہ وہ نازنین کسی اور کی ہونے والی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی۔ ہم دونوں میں تو آج تک کبھی کھل کر بات بھی نہ ہونے پائی تھی، تب میرا یہ حال تھا اگر کہیں اس کی طرف سے بھی قول و اقرار ہو چکا ہوتا تو شاید میرا دل وہیں پھٹ جاتا۔

بہت دیر تک مَیں اور نگہت خاموش کھڑے رہے۔ حویلی کے بلند و بالا درختوں کے پرندے بھی ڈھلتی شام کے ساتھ گھر واپسی پر شور مچاتے مچاتے چُپ ہو گئے تھے۔ اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ پھر مَیں نے ہمت مجتمع کی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں نگہت سے پوچھا۔

''کون ہے وہ۔۔۔ کس کے ساتھ ایمان کا رشتہ طے ہوا ہے۔''

''اس کے چچازاد۔۔۔ عبداللہ کے ساتھ۔''

''عبداللہ۔۔۔ لیک۔۔۔ لیکن۔۔۔''

لفظ میرے منہ میں ہی ٹوٹ گئے۔ یہ دوسرا پہاڑ تھا جو انہی چند لمحوں میں میرے سر پر ٹوٹا تھا۔ عبداللہ تو میری دیوانگی کا خود شاہد تھا۔ پھر عبداللہ۔۔۔ لیکن کیسے۔۔۔؟ میرے ذہن میں خیالات گڈمڈ سے ہونے لگ گئے تھے۔ نگہت نے بتایا کہ مچھ میں مولوی صاحب کی جو بڑی بہن رہتی تھیں وہ عبداللہ کی پھوپھی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی منہ بولی ماں بھی تھیں۔ مولوی صاحب نے مچھ جاتے ہوئے ان کے نام خط اپنے گھر والوں کے ہاتھ ہی بھیج دیا تھا۔ واپسی پر وہ بھی ایمان لوگوں کے ساتھ ہی آ گئی تھیں۔ مولوی صاحب نے ان کے سامنے ایمان کے رشتے کی بات رکھی تو انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ کا نام ہی تجویز کر دیا بلکہ بڑی بہن ہونے کے ناطے انہوں نے مولوی صاحب سے بطور حق ایمان کا رشتہ مانگا

شاید مولوی صاحب کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں اندر یہی خواہش پل رہی تھی، تبھی انہوں نے رات بھر سوچنے کے بعد ہاں کر دی۔ لیکن عبداللہ۔۔۔۔ عبداللہ سے کیا کسی نے اس کی رائے نہیں پوچھی۔۔۔؟ اس نے کیوں ہاں کر دی۔۔۔؟ لیکن وہ کیوں ہاں نہ کرتا۔۔۔۔ اس نے ایمان کے لیے میری دیوانگی ہی تو دیکھی تھی۔۔۔۔ اس پردہ نشین نے تو مجھ پر کھل کر آج تک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایمان کا اس تمام قصے میں کوئی قصور نہیں تھا۔۔۔۔ میرا ذہن خود ہی سوال کر رہا تھا اور پھر خود ہی ان کے جواب بھی تلاش کر لیتا تھا۔ بہت دیر تک میں وہیں بیٹھا اپنی قسمت کو روتا رہا۔۔۔۔

نہ جانے شاکر کو اس دن اتنی دیر کیوں ہو گئی تھی۔ مجھے باہر تانگے میں بیٹھے خیرو کا بھی خیال تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی اس لیے نگہت کے بے حد اصرار کے باوجود مَیں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا، چلتے چلتے نگہت نے مجھ سے پوچھا کہ اَب کیا کرنا ہے؟

اس سوال کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں تھا۔ انسان ہزار دشمنوں سے لڑ سکتا ہے لیکن جب اس کی تقدیر ہی اس کی دشمن بن جائے تو پھر اس سے مقابلہ کون کرے۔ میری تقدیر کا وار بھی جانے کب سے میرے درپے تھا۔ اس جیسے اور نہ جانے کتنے حادثے ابھی میرے تعاقب میں تھے۔ مَیں نگہت کو جھوٹی تسلی دے کر گھر سے نکل آیا۔ خیرو نے مجھے دیکھتے ہی تانگے کو ایڑھ لگائی اور ہم دوبارہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مجھے خیرو کی سب سے اچھی عادت یہی لگی تھی کہ وہ از خود کبھی سوال کر کے دوسروں کی تنہائی میں مخل نہیں ہوتا تھا۔ چپ رہ کر اس بات کو کھلنے کا انتظار کرتا تھا۔ خاموشی بھی تو بہت بڑا صبر ہوتی ہے۔ اور خیرو اس معاملے میں بہت صابر تھا۔

مجھے اسٹیشن کے دروازے پر اُتار کر وہ اپنا تانگہ اسٹینڈ میں کھڑا کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ مَیں لٹا پٹا سا چلتا ہوا پلیٹ فارم میں داخل ہوا۔ اسٹیشن ویران سا پڑا تھا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹی تھیں۔ لیکن اس رات کی تنہائی اور اس رات کے درد کا بیان ہی کچھ مختلف کچھ سوا تھا۔

صبح مَیں دوبارہ شاکر کی جانب جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں میں غفورے کی آواز آئی۔

"وہ رہے حماد باؤ۔۔۔"

میں اس وقت صبح کی گاڑی میں سے مال اُتروانے کی تیاری میں تھا۔ اور پلیٹ فارم کے آخری سرے پر بنے گارڈ روم کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے چونک کر نظر اٹھائی۔ وہ عبداللہ تھا۔۔۔ جو میری جانب بڑھ رہا تھا۔ جانے کیوں مَیں عبداللہ سے نظریں نہیں ہٹا پایا۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے مَیں اس نوجوان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ تو یہ تھا وہ خوش نصیب جس کے نام میری ایمان کا قرعہ نکلا تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔۔۔۔ میں تو اُسے اپنا رقیب بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ حالانکہ وہ میرا رقیب ہی تو تھا۔ عبداللہ کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی اپنے لفظ بھول گئے تھے شاید، پھر مجھے ہی رسم ادا کرنی پڑی۔

"کیسے ہو۔۔۔؟ گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔۔۔؟ اس کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔۔۔۔ "جی۔۔۔ سب خیریت ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں آپ سے یہاں معافی مانگنے آیا ہوں۔"

"میں اس قابل نہیں ہوں۔۔۔۔ مجھے شرمندہ نہ کرو۔"

"میں پہلے صبح شاکر صاحب کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ رات آپ وہاں آئے تھے۔۔۔ میں پہلے بھی دو مرتبہ آپ کی تلاش میں یہاں آ چکا ہوں۔"

"ہاں۔۔۔۔ مجھے خبر مل گئی، نیا رشتہ مبارک ہو۔"

شاید شدید کوشش کے باوجود بھی مَیں اپنے لہجے کی تلخی نہیں چھپا سکا۔ عبداللہ نے تڑپ کر سر اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں میں اِک عجیب سی شکایت تھی۔ مجھے اپنے الفاظ کے چناؤ پر شرمندگی ہونے لگی۔

"آپ کو حق ہے۔۔۔۔ جو چاہے کہہ لیں۔۔۔۔ شاید مَیں آپ کو کبھی اپنا سینہ چیر کر اپنے دل کی حالت نہ دکھا پاؤں۔"

"میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔ شاید کبھی کبھی لفظ اپنے معنی خود ہی طے کر لیتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا ان کو ادا کرنے کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو دوسرے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔"

عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"یہ بھی آپ ہی کا ظرف ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی آپ ہی معذرت کر رہے ہیں۔

میں بچپن سے مولوی صاحب کے اس قدر احسانوں تلے دبا ہوا ہوں کہ اگر میں ان کا شمار بھی کرنا چاہوں تو کم از کم اس زندگی میں نہیں کر سکتا۔ انہوں نے مجھے چچا بن کر نہیں۔۔۔ بلکہ باپ سے بھی بڑھ کر پالا ہے۔۔۔ خود تکلیفیں اُٹھائیں لیکن مجھ پر کبھی کوئی سخت وقت نہیں آنے دیا۔ ان کے اپنے ہاتھ چھل گئے پر انہوں نے کبھی میرے پیروں میں کوئی چھالا نہیں بننے دیا۔''

''تو کیا تمھارے اِقرار کی وجہ بھی صرف اُن کے احسانوں کا بوجھ ہی تھا۔'' عبداللہ نے پھر اسی کرچی کرچی نظر سے میری طرف دیکھا۔

''اس وقت اُن کی حالت ایسی ہے کہ ذرا سی ٹھیس بھی انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ سکتی ہے۔ ہاں۔۔۔ یہ سچ ہے کہ جب انہوں نے پھپھو اور تمام گھر والوں سے چھپ کر اکیلے کمرے میں میرے سامنے اپنے سر کی دستار ڈال دی تھی تو میں نے اپنی زبان کو بالکل گنگ پایا تھا۔ وہ جانتے ہیں کہ میں آپ کی ایمان کے لیے دیوانگی سے واقف ہوں۔۔۔ شاید اسی لیے انہیں اپنی عزت کو یوں میرے سامنے گروی رکھنا پڑا۔ حالانکہ ان کی ہمیشہ سے یہی مرضی تھی شاید۔۔۔ لیکن آپ کے درمیان میں آجانے سے وہ بہت ڈر گئے تھے۔۔۔ وہ اس بات سے بھی بے حد خوفزدہ تھے کہ ایمان کے کسی دوسرے گھر میں رشتے کے بعد کہیں کسی مقام پر آپ اپنی دیوانگی کے ہاتھوں اگر اس کے سسرال والوں کے سامنے آگئے یا اگر بات ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے کھل گئی تو ان کی عزیز از جان بیٹی کی زندگی پل میں برباد ہو جائے گی۔۔۔

۔۔۔ ان سب باتوں کے پس منظر کو اور اپنے ایک ایسے محسن کی حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ خود ہی بتائیے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کیا کرتے؟''

عبداللہ میرے سامنے سرتاپا سوال بنا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں بھی وہی کرتا۔۔۔ جو تم نے اس وقت کیا۔''

عبداللہ کے اکڑے ہوئے بدن میں جنبش سی ہوئی اور اس کی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔

''میں نے کہا تھا نا۔۔۔ یہ صرف آپ کے ظرف کا ہی حوصلہ ہو سکتا ہے۔ ایک اور

سچ کا اقرار کرنا چاہتا ہوں آج آپ کے سامنے۔۔۔ میں بچپن ہی سے جانتا تھا کہ میری شادی ایمان کے ساتھ ہی ہوگی۔ چچا کی نظر میں ہمیشہ سے میرے لیے وہ خاص پسند موجود رہی ہے جو کسی بھی باپ کی آنکھ میں اپنے ہونے والے فرزند کے لیے ہو سکتی ہے۔ جب لڑکپن سے جوانی میں قدم رکھا تو میری پہلی نظر بھی ایمان کی طرف ہی اٹھی تھی۔ اور اس پہلی نظر سے لے کر آج تک میں ایمان سے شدید محبت کرتا ہوں۔ محبت کی شدت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جس نے خود کبھی محبت کی ہو۔ لیکن آج تک کبھی اس محبت کے اظہار کی نوبت نہیں آئی۔ پہلے اظہار کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کیونکہ ایمان تو ہمیشہ سے ہی میرے نام لکھی جا چکی تھی۔ سوچا کہ شادی کے بعد پہلی رات اُسے اپنی زندگی بھر کی بے تابیوں کی کہانی سناؤں گا۔۔۔ اُسے ایک ایک بات یاد دلا کر بتاؤں گا کہ تب میرا اس کی کتاب میں مور کے پر رکھ دینے کا کیا مقصد ہوتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے جان بوجھ کر اس سے پانی کیوں مانگتا تھا۔ اپنے استری شدہ کپڑے پھر سے اُسے استری کرنے کے لیے کیوں دے دیتا تھا۔ شدید سردیوں کی رات میں چچا سے چُھپ کر اس کے لیے اتنی دُور سے پان کیوں لاتا تھا۔''

عبداللہ جانے کیا کیا بولے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگتی جا رہی تھیں اور میرے دماغ میں جیسے آندھیوں کا شور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اچھا۔۔۔ تو ایک مرتبہ پھر محبت ہی تھی جو اس نوجوان کو ہمیشہ بھیڑ میں بھی سب سے الگ دکھاتی تھی۔ عبداللہ کی بات جاری تھی۔

''لیکن پھر آپ آگئے، میں جانتا ہوں کہ ایمان نے آج تک پلٹ کر آپ کو کوئی جواب نہیں دیا ہوگا۔ کوئی اُمید نہیں دلائی ہوگی کیونکہ میں اس لڑکی کو بچپن سے جانتا ہوں۔ شرم و حیا اور رواداری کی جس مٹی سے گوندھ کر خدا نے اُسے بنایا ہے۔ اس میں شاید ایسی محبت کی آمیزش ہی نہیں رکھی گئی۔ اس کی زندگی کا مقصد مولوی صاحب کی خوشی ہے اور وہ اس خوشی کے لیے ان کے ہونٹوں پر ایک پل کی مسکراہٹ لانے کے لیے اپنی زندگی تو کیا۔۔۔ اپنا ایمان تک تیاگ سکتی ہے۔۔۔۔

لیکن جانے کیوں۔۔۔ آپ مجھے باقی سب سے مختلف لگے۔ مجھے دھیرے دھیرے ایسا لگنے لگا کہ آپ مولوی صاحب کے دل میں گھر کر ہی لیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سوچ سوچ کر ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں چچا آپ کے سامنے ٹوٹ ہی نہ جائیں۔۔۔

میری خودغرض سوچیں تنہائی میں مجھے رلاتی تھیں کہ اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو کیا ہوگا۔ آپ کی محبت کی طاقت سے مَیں بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ آپ کی محبت ایک ایسا طوفان ہے جو سب کچھ بہا کر لے جا سکتا ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود مَیں کبھی آپ کے خلاف کچھ نہیں سوچ سکا، کبھی آپ سے دل میں بھی نفرت نہیں کر سکا۔ شاید یہ بھی آپ کی محبت کا ہی کمال ہوگا۔"

لیکن پھر جس دن مَیں نے آپ کو اس اسٹیشن پر ریلوے قلی کے روپ میں دیکھا اس دن میرا دل بھی آپ کے سامنے ہار مان گیا۔ آپ سے جیتنا مجھ جیسے کمزور شخص کے بس کی بات ہی نہیں۔ میری محبت نے اسی دن آپ کی محبت کی عظمت کو سجدہ کر دیا تھا۔۔۔ افسوس ۔۔۔ چچا اس محبت کو نہیں سمجھ پائے۔۔۔ وہ ایک ڈرے ہوئے مجبور باپ ہیں۔ اور ان کی تربیت اور ماحول میں ایسی کسی محبت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ مَیں یہاں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میرے گھر والوں نے آپ کی، آپ کی عظیم محبت کی قدر نہیں کی۔۔۔ آپ ہم سب کو معاف کر دیں۔۔۔ معاف کر دیں۔"

عبداللہ کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔ مَیں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ وہ جوانِ رعنا آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لیے، اپنے ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑے میرے سامنے کھڑا تھا۔ مَیں نے تڑپ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور ایک جھٹکے سے کھینچ کر اُسے اپنے گلے لگا لیا۔ پھر ہم دونوں ہی رو پڑے۔ ہم دونوں کے پاس مزید کچھ کہنے کو تھا بھی نہیں۔ بس یہ آنسوؤں کی بولی ہی تھی جو ہم دونوں کو ایک دوسرے کی بات سمجھا سکتی تھی۔

کتنا عجیب منظر تھا، دُنیا نے آج تک رقیبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کرتے، لڑتے اور ایک دوسرے کی جان لیتے ہوئے تو دیکھا ہوگا۔۔۔ یہ کیسے دو رقیب تھے جو ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو رہے تھے۔۔۔ ان میں سے ایک سب کچھ پا کر رو رہا تھا تو دوسرا سب کچھ لٹا کر۔۔۔

اس کے بعد عبداللہ زیادہ دیر تک وہاں نہیں رکا۔ مجھ سے علیحدہ ہو کر اس نے لمحہ بھر کے لیے میرے ہاتھ پکڑے، انہیں اپنی بھیگی آنکھوں سے لگایا اور پلٹ کر وہاں سے چل دیا۔ مَیں وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ دُنیا میں اتنے ہمت والے لوگ مَیں نے کم ہی دیکھے ہیں۔

وہ آیا، اس نے کس دیدہ دلیری سے اپنا سچ مجھے بتایا اور واپس چلا گیا۔ ہم میں سے زیادہ تر ایسا کوئی فیصلہ کرنے میں ہی اپنی عمر گنوا دیتے ہیں۔ اس سے کہیں چھوٹا سچ بولتے ہوئے ہماری زبانیں سالہا سال پھسلتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ سچ ہمارے منہ سے نکل نہیں پاتا۔ جھوٹ در جھوٹ کی تہیں ہمارے ضمیر کو ڈھانپتی رہتی ہیں اور آخرکار ہم سچ بولنا ہی بھول جاتے ہیں۔ واقعی ۔۔۔ سچ بولنا صرف محبت کرنے والوں کا ہی شیوہ ہے۔ کیونکہ شاید دُنیا میں صرف محبت ہی سچ ہے۔ باقی سارے، جذبے کسی نہ کسی منافقت کی پیداوار ہیں۔

اگر عبداللہ میرے سامنے ایمان سے اپنی محبت کا اقرار نہ کرتا تو مجھے ساری زندگی اس کا پتہ نہیں چلتا نہ ہی اُسے کوئی اور مجبوری تھی کہ وہ میرے سامنے یہ راز کھولتا۔ لیکن یہ اس نوجوان کے اندر کا سچ تھا جس نے اُسے یہاں مجھ نامُراد تک چل کر آنے پر مجبور کیا۔ عبداللہ اپنا سچ بول کر چلا گیا تھا، جب کہ مجھے اپنی زندگی کے بہت سے بھیانک سچ تنہا جھیلنے تھے اور ان میں سب سے زیادہ تلخ سچ یہ تھا کہ ایمان اَب کسی اور کے نام سے منسوب ہو چکی تھی۔

OO

جادوگر

ربیکا نے جم کے میری طرف دوستی کے لیے ہاتھ بڑھانے کے بعد میرا نام جادوگر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ جادوگری میری شخصیت کا حصہ بنانے والی دُور میرے دیس کی ایک گل فام ہے، جو مجھے جینے کا ہر قاعدہ سکھا گئی ہے۔

اس دن بھی وہ کلاس میں بیٹھی میرے کان کھا رہی تھی۔

''نہیں۔۔۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب کیسے کر لیتے ہو۔ سارہ جیسی لڑکی نے تمھارے لیے باپ سے جھگڑ کر گواہی دے دی۔ جم جیسا مغرور اور بدتمیز امیر زادہ خود تمھارے پاس چل کر دوستی کے لیے آ گیا۔ یہ سب جادو نہیں تو کیا ہے۔۔۔؟ مجھے بھی سکھا دو نا یہ سب کچھ۔''

''میں نے ایسی کوئی انہونی نہیں کی ہے جس کی وجہ سے تم اتنی حیران ہو رہی ہو۔ میں، تم، سارہ اور جم۔۔۔ یہ سب انسان ہی تو ہیں، بس انسان کو اک ذرا سا انسان ہی کی طرح سمجھنے کی بات ہے۔ اور کچھ نہیں۔''

''یہی تو سب سے مشکل کام ہے مائی ڈیئر میڈی۔۔۔ انسان کو سمجھنا ہی تو محال ہے۔ لیکن تمھارے ساتھ رہوں گی تو یہ بھی سیکھ لوں گی۔''

اتنے میں ربیکا کو اس کی کسی سہیلی نے آواز دے دی اور مجھے نہر کنارے کھڑے جوزف کا پیغام آ گیا۔ آج وہ پھر مصوری کے موڈ میں تھا۔ آج لندن میں چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور اس چیز کا فائدہ اُٹھانے کے لیے تمام اسٹوڈنٹس کلاس سے غائب باہر گھاس کے میدانوں میں آڑھے ترچھے پڑے نظر آ رہے تھے۔ سچ ہے لندن میں رہ کر مجھے بھی دھوپ کی اس نایابی کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں جوزف کی طرف بڑھ گیا۔ جوزف نے تصویر ابھی مکمل نہیں کی تھی لیکن مجھے اس نے اپنی تصویر کے لیے نہیں بلکہ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کھڑی سارہ کی

پینٹنگ دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ سارہ اپنے دمکتے رنگ پر دھوپ کی گرمی جھیلتی ہوئی گہرے نیلے سکرٹ میں آسمانی رنگ کی سویٹر پہنے دُنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی تصویر مکمل کر رہی تھی۔ جوزف مجھے اس کی طرف بڑھنے کا اشارہ کر کے خود اپنی تصویر مکمل کرنے میں مصروف ہو گیا۔

مَیں سارہ کو اور اس کی تصویر کو آخری اسٹروک دیتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سارہ نے تصویر مکمل کر کے میری طرف رائے طلب نظروں سے دیکھا۔

''بہت اچھی ہے۔۔۔ لیکن ابھی مکمل نہیں ہوئی۔۔۔ ایک تشنگی۔۔۔ ایک نامکمل پن کا احساس ہو رہا ہے تمھاری تصویر کو دیکھ کر۔''

''بہت خوب۔۔۔ گویا رنگوں کی زبان بھی جانتے ہو۔ ٹھیک کیا تم نے۔۔۔ میری ہر تصویر میں تمھیں اس نامکمل پنے کا احساس ملے گا۔ لیکن سر جوزف کے بعد تم پہلے انسان ہو جسے اس کمی کا احساس ہوا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، مَیں تصویر مکمل کرنے سے پہلے ہی ختم کر دیتی ہوں۔''

''شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھاری ہر تصویر کا موضوع کوئی تلاش، کوئی کھوج ہوتی ہے۔ اور شاید وہ کھوج پوری ہونے سے قبل ہی تم ہمت ہار دیتی ہو؟''

سارہ نے اُلجھ کر میری طرف دیکھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے، مجھے بھلا کس چیز کی کھوج ہو سکتی ہے۔''

''سچ کی کھوج۔''

''سچ۔۔۔ سچ کو کھوج کی بھلا کیا ضرورت۔۔۔ وہ تو سامنے ہی روشن اور عیاں ہوتا ہے، تم یہ بتاؤ تمھارا ٹرم پیپر کہاں تک پہنچا۔''

''ابھی درمیان میں ہوں، لیکن اس ٹرم پیپر کی وجہ سے، بہت سے لوگ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میرا اشارہ سر آئزک کی طرف تھا۔ سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہیں۔''

''اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔''

''لیکن مجھے تو تم سے ڈر نہیں لگتا۔''

''مَیں نے کہا نا۔۔۔ تم سچی لڑکی ہو۔۔۔ اور سچ کو اُجالے کا خوف کیسا؟''

ساره زور سے ہنسی۔

"میں نے بھی کہا تھا نا۔۔۔تم واقعی بہت خطرناک ہو، کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔"

میں بھی ہنس پڑا۔

"بے فکر رہو، تمھیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"ویسے تم نے جم کو معاف کر کے اس کا دل ہی پلٹ دیا ہے، کل تک جو تمھارا جانی دشمن تھا، آج سارا دن تمھاری خوبیوں کے گن گاتا رہتا ہے۔"

"میں یہاں دشمنیاں پالنے تو کبھی نہیں آیا تھا، مجھے تو اس بات کا بھی افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمھارے اور سر آئزک کے درمیان تلخی پیدا ہوئی۔"

ساره نے سر پیٹ لیا۔

"اف۔۔۔یہ ربیکا بھی نا۔۔۔اس کے پیٹ میں کبھی کوئی بات نہیں رہ سکتی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پاپا اور میرے درمیان ایسی نوک جھونک چلتی ہی رہتی ہے۔ انہیں دراصل اس بات کا بُرا لگا تھا کہ تیس سال میں آج تک یونیورسٹی میں کسی نے ان کے فیصلے کے خلاف سَر اُٹھانے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ ہر نئے کام کی ایک دن ابتداء ہونی ہی ہوتی ہے۔ وہ مزید بگڑ گئے اور پھر مجبوراً مما کو بیچ میں کودنا پڑا۔ پھر حسب معمول پاپا کو ہار ماننا ہی پڑی۔"

"لگتا ہے تمھیں اپنی مما سے بہت پیار ہے۔"

ساره کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اوہ ہاں۔۔۔میری مما ہی تو میری جان ہیں۔ پاپا تو ہمیشہ مجھے بیٹوں کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ مجھ سے بہت زیادہ توقعات لگاتے ہیں لیکن مما ہمیشہ میری مرضی کو ترجیح دیتی ہیں، وہی میرے دل کی حالت سب سے بہتر جانتی ہیں۔"

ساره کی اس کی ماں سے محبت اس کے لہجے سے صاف جھلک رہی تھی۔

"اب تو وہ تمھارے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہیں۔ کبھی ملواؤں گی تمھیں ان سے۔"

"ضرور۔۔۔میں ایسی خاتون سے ضرور ملنا پسند کروں گا جو بیک وقت سر آئزک اور تمھارے دل پر راج کرتی ہیں۔"

میری تعریف کے انداز پر ساره کھلکھلا کر ہنس دی۔

"میں مما کو تمھاری یہ بات ضرور بتاؤں گی۔"

میں اور ساره اس روز بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس بات سے بے خبر کہ دُور کہیں دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے کوئی شخص بہت دیر سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔۔۔اور یہ شخص کوئی اور نہیں تھا۔ میرے ساتھ کھڑی اس صاف دل لڑکی کا باپ آئزک تھا۔ جس کا دل اَب میری طرف سے اتنا صاف نہیں تھا۔

ٹرم پیپر جمع کروانے کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی۔ میرے دن اور رات کا بیشتر حصہ "ہالوکاسٹ" سے متعلق ریسرچ کی کتابوں کی ورق گردانی اور نوٹس بنانے میں گزر رہا تھا۔ اس دن بھی میں لائبریری میں سہ پہر دیر تک اپنے مطلب کی چیزیں دیکھتا رہا۔ مجھے دراصل اپنی یونیورسٹی سے "ہالوکاسٹ" کے حق میں ہی مواد مل سکتا تھا۔ لیکن وہ بھی میرے لیے فائدہ مند ہی ثابت ہوا تھا کیونکہ مجھے ہالوکاسٹ کے حق میں اور اس کے مخالف نظریے میں مقابلہ کر کے حقائق جاننے کا مزید موقع میسر آ گیا تھا۔ اب میں دلیل در دلیل بحث کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔

یونیورسٹی کے گیٹ سے نکلتے ہوئے مجھے ساره کی سفید بیٹل نے کراس کیا۔ گاڑی آگے جا کر رک گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے جھانکا۔ ساره کے ساتھ ایک میٹھی سی مسکراہٹ والی پکی عمر کی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے گاڑی تک چل کر آنے کے وقت میں شاید ساره اُسے میرے بارے میں کچھ بتا چکی تھی۔ عورت نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"اچھا تو یہ ہے تمھاری کلاس کا باغی۔۔۔بھئی یہ تو بہت اچھا لڑکا ہے۔" ساره مسکرائی۔

"حماد۔۔۔یہ میری مما ہیں، مسز جینی آئزک۔"

میں نے سر جھکا کر مسز جینی کو آداب کیا، انہوں نے مسکرا کر جواب دیا، ساره بولی۔

"کہاں جا رہے ہو، آؤ میں تمھیں چھوڑ دوں گی۔"

''ہاں ہاں ---- آ جاؤ ---- راستے میں گپ شپ بھی رہے گی۔'' مسز جینی نے جلدی سے کہا۔

''نہیں ---- میں یہاں قریب ہی پنوراما اسکوائر کے قریب والی لائبریری تک جا رہا ہوں۔ بس اگلے سگنل کے پاس ہی ہے، آپ لوگ جائیں۔''

''نہیں بھئی، اتنی آسانی سے تو ہم تمھیں نہیں جانے دیں گے۔'' مسز جینی ہنس کر بولیں۔ اگر آج رات ہماری طرف کھانے پر آنے کا وعدہ کرو تو جان چھوٹے گی۔''

سارہ نے بھی سر ہلایا، اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا میرے پاس۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں رات کو ان کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

OO

دشمنِ خدائی

اس دن عبداللہ کے واپس جانے کے بعد جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایک دم سے ہی جانے کیوں مجھے ساری خدائی ہی دشمن لگنے لگی تھی۔ ایک دم ہی میرا دل جیسے ہر اچھے احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ میں جس دن سے صوفی رحمت اللہ سے ملا تھا تب سے اس دن عبداللہ کی مجھ سے اسٹیشن پر ملاقات ہونے تک، میری ایک بھی نماز نہیں چھوٹی تھی۔ لیکن اس دن عبداللہ کے واپس چلے جانے کے بعد میرا دل مذہب سے بالکل ہٹ گیا تھا۔ جیسے میرے اندر کا یقین ہی بالکل ختم ہو گیا تھا۔ دُعا اور اس کی قبولیت سے میرا بھروسہ بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب ایک ڈھکوسلہ لگنے لگا تھا، میری ساری نمازیں چھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے ہر دم یہ احساس رہنے لگا تھا کہ یہ نمازیں، یہ دُعائیں سب بے فائدہ ہیں۔ اگر ان نمازوں سے ان دُعاؤں سے کچھ فرق پڑنا ہوتا تو خدا مولوی صاحب کا دل میرے لیے نرم کر دیتا۔ آج ایمان عبداللہ سے منسوب ہونے کی بجائے مجھ سے منسوب ہوتی۔

مجھے مولوی صاحب کی ہر بات بھی صرف ایک ڈھونگ لگنے لگی تھی، مجھے لگتا تھا کہ وہ شخص سر سے پیر تک صرف ایک دکھاوا ہی تو ہے، جو زمانے کے سامنے اپنی پارسائی کا سوانگ رچانے کے لیے میری محبت کے درپے ہے۔ اسے صرف یہ فکر ہے کہ کہیں اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے مقتدیوں اور نمازیوں کی تعداد کم نہ ہو جائے۔ جو صرف یہ چاہتا ہے کہ آتے جاتے اور اُسے بازاروں سے گزرتے دیکھ کر لوگ اس کی تعظیم کے لیے اُٹھ اُٹھ کر اسے سلام کرتے رہیں اور اس کے گزر جانے کے بعد اونچی سرگوشیوں میں اس کی نیکیوں اور پاک بازی کے گُن گاتے رہیں۔ جنھیں سُن کر وہ اپنی عظمت کے نشے میں خود ہی ہمہ وقت سرشار رہے۔

ایسے اور اس جیسے جانے کتنے خیالات دن رات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے

تھے۔ شاید مجھ سے یہ توفیق ہی چھین لی گئی تھی کہ مَیں کوئی مثبت بات سوچ سکوں۔ مولوی صاحب کے پاس جب مَیں عشاء کی نماز پڑھنے جاتا تھا تو نماز کے بعد کے درس میں عجیب و غریب قسم کے مسائل سننے کو ملتے تھے۔ مثلاً ایک دن نماز کے بعد ایک نوجوان مولوی صاحب کو بتانے لگا کہ اس کے ساتھ ایک انوکھا مسئلہ ہے۔ اور وہ یہ کہ جب وہ گھر سے کہیں دُور کسی کام کے لیے نکلتا ہے، یا پھر جب وہ دوسرے شہر پڑھنے کے لیے جاتا ہے اور اُسے بورڈنگ میں رہنا پڑتا ہے تو اس سے ساری نمازیں چھوٹ جاتی ہیں۔ وہ چاہ کر بھی نماز نہیں پڑھ پاتا کیوں کہ نماز پڑھنے سے اُسے گھر کی یاد اور زیادہ ستاتی ہے؟ اُسے لگتا ہے کہ اگر وہ نماز پڑھے گا تو اور زیادہ غمگین ہو جائے گا، لہٰذا وہ نماز پڑھنے کے بجائے ان اوقات میں دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے اور فلم وغیرہ دیکھنے چلا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک دن ایک اور صاحب تشریف لائے جو اُس بات سے بے حد پریشان تھے کہ ان کا دل حج پر جانے کو نہیں مانتا۔ حالانکہ وہ صاحب استطاعت ہونے کے ساتھ ساتھ تندرست بھی تھے اور ان پر کوئی ایسی ذمہ داری بھی نہیں تھی کہ وہ خود اور اپنی بیگم کو لے کر حج کے لیے نہ نکل پاتے۔ لیکن بقول ان کے، ان کا دل ہی اس طرف مائل نہیں ہو پاتا تھا۔ انہیں حج پر جانا ایک بڑی خواری کا کام لگتا تھا، اور جو محبت خدا کے گھر کو دیکھنے کے لیے دل میں ہونی چاہیے تھی، وہ اس محبت سے بالکل عاری تھے۔

ان دنوں میں بڑی حیرت سے لوگوں کے یہ مسئلے سنا کرتا تھا اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مولوی صاحب کے جواب ہوتے تھے۔ مثلاً ان حج والے صاحب کو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ ساری بات توفیق ملنے کی ہے۔ فی الحال ان کے لیے یہی غنیمت ہے کہ وہ کم از کم اس بات پر پریشان تو ہوتے ہیں کہ انہیں حج سے رغبت کیوں محسوس نہیں ہوتی۔ فی الحال انہیں پریشان ہونے کی توفیق عطا کی گئی ہے۔ جس دن حج پر جانے کی توفیق نصیب ہوگی، وہاں جانے کی محبت اور عجلت خود بخود دل میں پیدا ہو جائے گی۔ ہاں البتہ دُعا ضرور کرتے رہیں کیونکہ پریشانی کی بات تب ہوگی جب دل سے حج نہ کرنے کی پریشانی بھی جاتی رہے گی۔ ایک دن اسی طرح دُعا کے متعلق ایک عجیب بات سننے کو ملی۔ ایک نوجوان مولوی صاحب کے سامنے پریشان حال بیٹھا اس بات کا رونا رو رہا تھا

کہ اس کی دُعا میں خلوص شامل نہیں ہوتا۔ وہ بس برائے نام ہی خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہے۔ نہ ہی اس کی توبہ اور معافی میں کچھ سچائی ہوتی ہے۔ وہ منافقانہ انداز میں خدا سے اپنے گناہوں کی معافی تو مانگ لیتا ہے لیکن اندر سے اُسے اِس گناہ پر خوشی محسوس ہو رہی ہوتی ہے اور دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ اگر کبھی دوبارہ موقع ملا تو وہ یہ گناہ ضرور دوبارہ بھی بنا کسی حجت اور ندامت کے کر گزرے گا۔

مولوی صاحب نے اُسے بھی جواب میں یہی بات کہی۔ ''توفیق۔'' اسے بھی یہی دلاسا دیا گیا کہ ابھی کچی اور منافقانہ معافی کی توفیق ملی ہے۔ پُرخلوص معافی کی بھی وقت آنے پر مل جائے گی۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ اس منافقانہ اور دکھاوے کی معافی کا دامن بھی نہ چھوڑا جائے۔ ندامت چاہے دکھاوے کی ہو یا چاہے منافقانہ اُسے پیش کر دینا چاہیے۔

اسی لیے مجھے بھی لگ رہا تھا کہ مجھ سے ہر اچھی بات سوچنے کی اور ہر نیک کام کرنے کی توفیق بھی شاید عبداللہ سے ہوئی اس ملاقات کے ساتھ ہی چھین لی گئی تھی۔ میں سارا سارا دن یونہی خالی الذہن بیٹھا رہتا اور اپنے سامنے ہونے والے دُنیا کے تماشے کو دیکھتا رہتا تھا۔

اب مَیں نے شاکر کی طرف جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ خیرو اور غفورے سے بھی کم ہی بات چیت ہوتی تھی۔ صدیقی صاحب بھی میری راہ تکتے رہتے تھے اور پھر انتظار سے اکتا کر خود ہی اسٹیشن پر چلے آتے اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتے۔ بھی یہ جانتے تھے کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے لیکن میرے اندر ہونے والی اس تبدیلی کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ خیرو روزانہ اس اُمید پر صبح و شام ٹانگہ جوت کر میرا اسٹیشن کے باہر انتظار کرتا رہتا کہ شاید مجھے اپنی منت پر جانا ہو، لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میری ہر منت دم توڑ گئی تھی۔ ایمان کو مانگنے کے بعد میرے پاس مانگنے کو کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ نہ ہی کسی مُراد کے پورے ہونے کا یقین ہی دل میں باقی بچا تھا۔ مَیں دُنیا کی ہر خوشی اور ہر غم سے لاتعلق ہو گیا تھا۔ مَیں ایمان کی قریب آتی ہوئی شادی کے دن یوں گن رہا تھا جیسے کوئی پھانسی کا قیدی کال کوٹھڑی میں اپنی موت کی گھڑیاں گنتا ہے۔

وہ ایک ایسا ہی دن تھا، بوجھل، بے نُور، انتہائی طویل اور اُکتا دینے والا۔ میں سہ پہر

کو پلیٹ فارم نمبر 2 پر مال گاڑی لگنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جو کسی وجہ سے پچھلے پھاٹک پر بہت دیر سے رُکی ہوئی تھی۔ تھک کر مَیں لیمپ پوسٹ کے نیچے بڑے تھڑے پر بیٹھ گیا اور جس طرف سے مال گاڑی کو اسٹیشن میں داخل ہونا تھا اس طرف کے سگنل کو دیکھنے لگا۔ آج غفورا بھی نہیں تھا اور تمام مال مجھے ہی اتروانا تھا، دفعتاً میری نظر سگنل سے ہوتی ہوئی نیچے پٹریاں کراس کر کے پلیٹ نمبر 2 کی طرف آتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ کچھ دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا۔ پر کون تھا یہ آدمی۔ اچانک مَیں اپنے حواس میں ایک جھٹکے سے لوٹ آیا۔ ارے ---یہ تو شاکر تھا، اپنی مخصوص ڈرائیوروں والی سفید وردی میں، جس کی وجہ سے مَیں دُور سے اُسے ریلوے کا ہی کوئی اہلکار سمجھ بیٹھا تھا۔ شاکر میری طرف ہی آ رہا تھا۔ مَیں بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ شاکر نے قریب آتے ہی مجھے زور سے بھینچ لیا اور بہت دیر تک بنا کچھ کہے چُپ چاپ مجھے گلے لگائے کھڑا رہا اور جب مجھ سے علیحدہ ہوا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''حماد بابا---کیا میرا گھر اس قابل بھی نہیں تھا کہ آپ وہاں کچھ دن رہ سکتے۔''

''تم جانتے ہو ایسی بات نہیں ہے---وہ میرا دوسرا گھر ہے---لیکن اگر گھر میں ہی رہنا ہوتا تو پھر پہلا گھر ہی کیوں چھوڑتا---؟ لیکن تمھیں یہاں کا پتہ کس نے دیا---

''مَیں جانتا تھا نگہت زیادہ دن تک یہ بات چھپا نہیں پائے گی۔''

''مَیں چاہتا تو آپ کو گھر سے نکلنے کے بعد پہلے دن ہی تلاش کر لیتا بابا---لیکن مَیں نے صرف آپ کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ آپ بُرا مان جائیں گے۔ آج بھی واقعی مَیں نگہت کے بتانے پر ہی سیدھا یہاں آیا ہوں۔ اس نے آپ کو ابھی گھر بلایا ہے۔ کہہ رہی تھی بہت ضروری کام ہے۔ آپ کو ابھی میرے ساتھ گھر چلنا ہوگا۔''

''ابھی---لیکن مجھے اس وقت بہت کام ہے---مَیں شام کو۔''

''نہیں بابا---آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔ اگر جلدی نہ ہوتی تو نگہت مجھے کبھی آپ کا پتہ نہ دیتی۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کی بات کا کتنا مان رکھتی ہے۔''

شاکر کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے مال گاڑی کا معاملہ ایک دوسرے سینئر قُلی کے ہاتھوں میں سونپ کر اس کے ساتھ اسٹیشن سے نکلنا ہی پڑا۔ باہر ایک پُرانی اوپل کھڑی

تھی۔ شاکر جانتا تھا کہ مَیں کمشنر صاحب یا گھر کی کسی گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا اس لیے وہ شاید کسی جاننے والی کی کار لے کر آیا تھا۔ ہم دونوں پُرانی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں شاکر نے بتایا کہ امی اب اندر سے ٹوٹ چکی ہیں اور میری تلاش میں عباد کو ہر طرف دوڑا چکی ہیں۔ لیکن کمشنر صاحب کے ڈر سے کوئی کھلے عام میری جدائی کا ذکر گھر میں نہیں کرتا۔ اب وہ سب ہی جان چکے ہیں کہ مَیں اپنے کسی دوست کی طرف نہیں گیا تھا اور گھر سے نکلنے کے بعد سے ہی تنہا کہیں رہ رہا تھا۔ امی نے شاکر سے بھی مجھے تلاش کرنے کو کہا تھا اور آخر کار شاکر کو ان کی تسلی کے لیے انہیں بتانا پڑا تھا کہ مَیں کبھی کبھار پُرانی حویلی میں نگہت اور شاکر سے ملنے کے لیے آتا رہا ہوں اور خیریت سے ہوں۔ امی نے شاکر سے یہ بھی کہا تھا کہ اب اگر کبھی مَیں پُرانی حویلی آؤں تو شاکر چپکے سے امی یا عباد کو اطلاع کر دے۔ مَیں نے چونک کر شاکر کی طرف دیکھا۔ کہیں میرا بلاوہ اسی پروگرام کا ہی تو کوئی حصہ نہیں۔ لیکن پھر میں نے خود ہی کو ملامت کی۔ شاکر کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ ورنہ وہ مجھے یہ سب تفصیل بتاتا ہی کیوں؟

کچھ ہی دیر میں ہم پُرانی حویلی کے پھاٹک نما گیٹ تک پہنچ چکے تھے۔ شاکر نے مجھے گیٹ پر اُتارا اور مجھے گاڑی واپس کر کے جلد آنے کا کہہ کر وہیں سے واپس مڑ گیا۔ شام کے ساڑھے چار کا وقت ہوگا۔ حویلی پر اک سکوت سا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ سے اندر گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر نگہت پر پڑی جو بے چینی سے حویلی کے بغلی دالان میں ٹہل رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھی۔

''اوہ بھیا---کہاں رہ گئے تھے آپ---کتنے دن سے آپ کی راہ دیکھ رہی ہوں مجبوراً مجھے آج ابا کو آپ کے پیچھے بھیجنا پڑا۔ کیا آپ نے ہم سب سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیا ہے---تبھی آپ مجھ سے بھی ملنے نہیں آئے نا۔''

نگہت کی آنکھوں میں شکوہ تھا، مَیں نے ایک ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی۔

''بڑی چالاک ہو---جانتی ہو کہ میرا پتہ بتانے پر ڈانٹ پڑے گی مجھ سے اس لیے پہلے ہی سے تیاری کر رکھی ہے مجھ سے ناراض ہونے کی---ہاں؟''

''بات ہی ایسی تھی---ورنہ میں آپ کا پتہ کبھی کسی کو نہ دیتی۔ دراصل حیا آپ

سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ پہلے بھی ایک مرتبہ یہاں آ چکی ہے۔ لیکن تب بھی آپ کا کچھ اتا پتہ نہیں تھا۔ مَیں نے اُسے تب یہ کہا تھا کہ شاید آپ ایک آدھ دن میں آئیں گے تو مَیں آپ کو آج کے دن دوبارہ آنے کا کہوں گی۔ تب وہ بھی آ جائے اور آپ سے بات کر لے۔ لیکن دن گزرتے گئے اور آپ مجھ سے ملنے آئے ہی نہیں اور آج کا دن بھی آ گیا جب مَیں نے حیا کو یہاں دوبارہ آنے کا کہا تھا۔ بس اسی پریشانی میں ابا کو آپ کی طرف بھیجنا پڑا۔"

میرے لیے حیا کی آمد واقعی بہت حیرانی کا باعث تھی۔ وہ نازک سی لڑکی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھی جس کے لیے اُسے دو مرتبہ اپنے قفس جیسے گھر سے نکل کر اتنی دُور تک یہاں آنا پڑا تھا۔ مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ اس گھر سے نکلنا حیا کے لیے کس قدر مشکل مرحلہ ثابت ہوا ہوگا۔

"کہاں ہے حیا۔۔۔؟"

"مَیں نے اُسے حویلی کے بڑے برآمدے والے گول کمرے میں بٹھایا ہے۔ ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی وہ یہاں پہنچی ہے۔ مَیں اسی پریشانی میں یہاں ٹہل رہی تھی کہ اگر آپ ابا کو اسٹیشن پر نہ ملے تو مَیں حیا کو کیا جواب دُوں گی۔ آپ اس سے دو گھڑی وہیں مل لیں، مَیں ابھی آتی ہوں۔"

نگہت نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا۔ میں گومگو کی کیفیت میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر چلتے چلتے مجھے کچھ خیال آیا۔ مَیں نے جاتی ہوئی نگہت سے آواز دے کر پوچھا۔

"لیکن حیا یہاں تک اکیلی آئی کیسے۔۔۔؟"

"وہ اکیلی نہیں آئی، اُس کی امی بھی اس کے ساتھ آئی ہیں۔ وہ اندر ہماری طرف اماں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔"

نگہت پلٹ کر چلی گئی، مَیں مزید اُلجھن کا شکار ہو گیا۔ حیا اپنی امی کے ساتھ آئی ہے۔۔۔ تو کیا اس کی ماں کو بھی اس بات کی خبر ہے جو حیا مجھ سے کہنے کے لیے اتنی دُور آئی ہے؟ میں اسی شش و پنج میں مبتلا چلتا ہوا حویلی کے بڑے برآمدے تک پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر دروازے پر کھڑے ہو کر مَیں نے اپنے ذہن کو یکسو کرنے کی کوشش کی اور پھر مَیں قدم بڑھا

کر اندر داخل ہو گیا۔ حیا نے آہٹ سُن کر چونک کر مجھے اندر آتے دیکھا اور بوکھلاہٹ میں وہ کھڑی ہو گئی۔ جلدی میں اُس نے مجھے سلام کیا۔ اس دن مَیں نے پہلی مرتبہ حیا کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ ایمان سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔ شاید عمر میں دو تین سال ہی اُس سے چھوٹی ہوگی۔ اس کی پلکیں بھی ہر لحہ ایمان کی پلکوں کی طرح لرزتی ہی رہتی تھیں۔ وہ بھی ایمان کی طرح ہی بڑی سی چادر میں لپٹے سر جھکائے کھڑی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی ان جانے جذبے کی طاقت سے یہاں تک تو آ گئی ہے لیکن یہاں مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ مجھے اس کی دلجوئی کے لیے خود ہی بات شروع کرنی چاہیے۔ ورنہ شاید ہم دونوں ہی یوں خاموش کھڑے رہتے۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیے۔"

حیا چُپ چاپ بیٹھ گئی، مَیں بھی سامنے والے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

"معافی چاہتا ہوں آپ کو میری وجہ سے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی نگی نے بتایا کہ آپ آئی ہوئی ہیں۔"

حیا نے پلکیں اُٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔

"آپ اپنے آپ کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔"

مجھے اس براہِ راست طرزِ تخاطب کی توقع نہیں تھی۔

"شاید میری قسمت میں ہی یہ سزا لکھ دی گئی تھی۔ اور پھر تقدیر سے کیا اُلجھنا۔۔۔؟"

"آپ جو محبت کر رہے ہیں وہ اب صرف کتابوں اور افسانوں میں باقی رہ گئی ہے۔۔۔ ایسی محبت کو سمجھنے والے اب اس دُنیا میں باقی نہیں ہیں۔"

مَیں نے حیرت سے اس نازک سی گل اندام لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی اسکول، کالج سے واپس آئی ہوئی لگتی تھی۔ مجھے اس سے اتنی بڑی بڑی باتوں کی توقع ہرگز نہ تھی۔ لیکن شاید کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لڑکیاں اپنی عمر سے دس سال آگے کی سوچ رکھتی ہیں۔

"محبت کرنا نہ کرنا اپنے اختیار میں ہی ہوتا تو پھر مسئلہ کس بات کا تھا۔ محبت کا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ نہ ہی محبت کو اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ کوئی اسے سمجھ گیا یا نہیں۔"

وہ غور سے میری بات سنتی رہی۔

''کاش آپ کا اور ایمان آپی کا میل ممکن ہوتا۔ لیکن ایک اس میل کے نہ ہونے سے آپ باقی ساری دُنیا کو تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔ آپ کے لیے ایمان باجی کا یہی پیغام لائی ہوں مَیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ خدا کے لیے یوں در بدر کی ٹھوکریں نہ کھائیں۔ واپس اپنے گھر چلے جائیں۔ یہ ان کی آپ سے آخری التجا ہے۔''

اوہ۔۔۔ تو حیا اُسی ماہ رُو کا پیغام لے کر آئی تھی۔ گویا اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا تھا۔ شاید وہ اس دن اسٹیشن پر میری حالت کو ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ لوگ کتنے معصوم اور بھولے ہوتے ہیں۔ بھول جانے کا کہہ کر سمجھتے ہیں کہ دوسرا شاید سب بھول ہی جائے گا۔ چلو اس سنگ دل کو مجھ پر اتنا رحم تو آیا کہ اُس نے نامہ بر بھیج کر مجھے اپنا درد اور اپنی وحشت بھول جانے کا پیغام تو بھیجا۔ اس ایک جنم کے لیے تو اس کی یہ مہربانی بھی کچھ کم نہ تھی۔

''اگر آپ کی ایمان آپی کی تسلی اس بات سے ہوتی ہے کہ مَیں واپس اپنے رشتوں کے پاس چلا جاؤں تو آپ ان سے جا کر یہی کہہ دیجئے گا کہ میں واپس چلا گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اپنی اگلی ساری زندگی اس احساس کے ساتھ گزاریں کہ ان کی وجہ سے کوئی گھر سے بے گھر ہوا تھا۔''

حیا نے تڑپ کر میری طرف دیکھا۔

''میں جانتی تھی کہ آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ کیوں سارا کچھ خود ہی سہنا چاہتے ہیں۔ کیوں خود کو اتنی اذیّت دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی آپ کو آپی کے احساسات کا ہی خیال ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ وہ صرف میرے کہہ دینے سے اس بات پر یقین کر لیں گی کہ آپ واپس گھر چلے گئے ہیں۔۔۔۔؟''

''پھر آپ ہی بتایئے۔۔۔ میں انہیں یقین دلانے کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔''

''آپ اس دُنیا کے نہیں لگتے۔۔۔۔ یہ دنیا آپ جیسوں کے لیے بنی بھی نہیں ہے۔ لیکن ہو سکے تو میری درخواست پر غور ضرور کیجیے گا۔ یہ صرف آپی کی ہی خواہش نہیں ہے۔ یہ میری بھی آپ سے یہی التجا ہے۔ اس دن آپ کو اسٹیشن پر دیکھ کر ہماری کیا حالت ہوئی تھی۔ آپ نہیں جانتے۔۔۔۔ اس دن امی نے بھی آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ انہیں بھی آپ

ساری دنیا سے الگ نظر آئے تھے۔ کاش ہماری بدنصیبی کے ستاروں کا سایہ آپ پر کبھی نہ پڑتا۔''

اتنے میں نگہت کمرے میں داخل ہوئی۔ حیا اُسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ نگہت نے اسے بتایا کہ اس کی امی جانے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ حیا نے مجھ سے رخصت لی اور جانے کے لیے پلٹی۔ میں گم سم سا بیٹھا ہی رہ گیا۔ اچانک حیا رکی اور اُس نے اپنے ہاتھ میں چھپاتہ کیا ہوا کاغذ کا رقعہ نکالا۔ اور میرے قریب آ کر اُسے میری طرف بڑھایا۔

''یہ آپی نے مجھے اس وقت آپ کو دینے کا کہا تھا جب مجھے لگے کہ میری درخواست آپ کی قبولیت پانے کے قابل نہیں ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔۔ حیا پلٹ کر چلی گئی اور ہاتھ میں سفید کاغذ کی وہ پرچی تھمی کی تھمی رہ گئی۔ کچھ دیر تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ نگہت بھی حیا کو چھوڑنے باہر چلی گئی تھی۔ مَیں نے کاغذ کی تہیں کھولیں۔ محبوب کا خط کھولنے اور اُسے پڑھنے کی لذت سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جنھوں نے خود اس تجربے سے گزر کر دیکھا ہوتا ہے، وہ چند لمحے کسی قارون کے خزانے سے کم نہیں ہوتے، میرے لیے تو ویسے بھی یہ اس مہ جبیں کے پہلے چند لفظ تھے جو تحریر کی صورت میں اُس نے بھیجے تھے۔ ورنہ لوگ تو ہزاروں مرتبہ کے کہے، سنے اور پڑھے ہوئے لفظوں کو بھی کسی تبرک کی طرح سنبھال کر رکھتے ہیں دن میں ہزار ہزار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار انہیں وہ تحریر اتنی ہی نئی لگتی ہے جتنی پہلی مرتبہ لگی تھی۔ میری نظریں تیزی سے کاغذ پر پھسلتی جا رہی تھیں۔ خوبصورت لکھائی میں صرف چند جملے ہی لکھے ہوئے تھے۔ بنا کسی القابات اور روایتی سلام و دُعا کے بغیر۔

''آپ کے ارادے اور اس کی سچائی کی عظمت پر شک نہیں ہے۔ بس اتنا کہنا تھا کہ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔۔۔۔ ضد تو دشمنی کی پہچان ہے۔

آپ گھر واپس چلے جائیں اور یہ دشمنی ختم کر دیں۔ یہ میری آپ سے پہلی اور آخری التجا ہے۔''

☆☆☆☆

شاید ان چند لمحوں میں مَیں نے بیسیوں بار اس رقعے کو پڑھا ہوگا۔ ہر دفعہ اس اُمید پر کہ شائد کوئی لفظ مجھ سے پچھلی مرتبہ چھوٹ گیا ہو۔ شائد مجھ سے پڑھنے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو۔ دراصل مَیں اب تک خود کو یقین ہی نہیں دلا پایا تھا کہ میرے ہاتھوں میں اس گل رُخ کی تحریر ہے جو اس نے صرف میرے لیے لکھی ہے۔ صرف میرے لیے۔۔۔۔ حماد امجد رضا کے لیے۔۔۔۔ کیا زندگی مزید جینے کا اس سے بڑا کوئی اور بہانہ ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کاغذ کے ٹکڑے میں، ان لفظوں کی پور پور سے اور اس روشنائی کے ہر نکتے سے اس کی تصویر جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ کاغذ نہ ہو۔ ایمان خود میرے سامنے بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی ہو۔ یہ خط میرے لیے پوری ملاقات سے بھی بڑھ کر تھا۔

میں نے آس پاس نظر ڈالی، قریب ہی چند کاغذ اور ایک پینسل میز پر دھری پڑی تھی۔ مَیں نے پینسل اُٹھائی اور کاغذ پر چند سطور کھینچ دیں۔

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زُلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تُم کو خبر ہونے تک

مَیں نے اس کے گھر میں غالب کو بکھرے پایا تھا، غالب اُس کا پسندیدہ شاعر تھا، مَیں نے اسی کے پسندیدہ شاعر کی زبان اپنا حال بیان کر دیا تھا۔ میری بات تو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ شاید اپنے شاعر کی بات اس کو سمجھ میں آ جائے۔ دوسرے کاغذ پر میں نے نگہت کے لیے ایک پیغام لکھا کہ اگر حیا اب تک نہیں گئی ہے تو وہ اس کے ذریعے یا پھر کس اور طریقے سے یہ پیغام ایمان تک پہنچا دے۔ مَیں ان دونوں کاغذوں پر سنگ مرمر کا بنا ہوا خوبصورت سا چھوٹا وزن رکھ کر کمرے سے نکل آیا۔ باہر کوئی نہیں تھا، مَیں زیادہ دیر وہاں نہیں رکنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ امی نے شاکر کے علاوہ بھی حویلی کے کسی نوکر کو میرے آنے پہ اطلاع دینے کا پابند کر رکھا ہو۔ میں حویلی کے پھاٹک سے گزرتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔ کچھ ہی دور مجھے ایک تانگہ مل گیا اور مَیں اسے اسٹیشن کا پتہ دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

مَیں اپنے خیالوں میں اور اس کاغذ کے ٹکڑے کے دل کے اتنے پاس ہونے کے

احساس میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اسٹیشن پہنچ گیا۔

شام ڈھل رہی تھی، پلیٹ فارم پر پہنچا تو صدیقی صاحب کا خاص بنگالی نوکر جوان کا باورچی بھی تھا، پلیٹ فارم پر میری ہی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کا ایک رنگ لہرایا، وہ جلدی سے میری طرف بڑھا۔

''وہ حماد شاب۔۔۔۔ آپ کو اُدھر بلاتے ہیں۔۔۔۔ آپ کے لیے چاول موسکلی بنایا ہے ہم نے۔''

مَیں نے تھکن کا عذر پیش کیا لیکن مَیں جانتا تھا کہ ابراہیم اب مجھے ساتھ لیے بنا یہاں سے نہیں ٹلے گا۔ صدیقی صاحب نے اُسے کچھ اِسی قسم کی ہدایات دے کر بھیجا ہوگا۔ مجبوراً مجھے اس کے ساتھ ہی صدیقی صاحب کے بنگلے جانا پڑا۔ وہ برآمدے میں ہی کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر وہ بھی کھل سے گئے۔

''ہاں میاں۔۔۔۔ اب بھلا ہماری یاد کیوں آنے لگی۔ اب تو جناب کی صورت دیکھے بھی ہفتہ ہفتہ ہو جاتا ہے۔''

مَیں مسکرایا۔۔۔۔ ''ایسی بات نہیں ہے، آپ سے ملاقات ہو یا نہ ہو آپ ہر دم میرے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔''

صدیقی صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''لفظوں کی کبھی بھی کمی نہیں رہی تمھارے پاس۔ کبھی تو کسی کو ناراض ہونے کا موقع دیا کرو حماد میاں۔''

صدیقی صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جانے مَیں انہیں کس طرح اور کیا جواب دیتا رہا۔ میرا دھیان تو کہیں اور ہی تھا۔ بس صدیقی صاحب کی دلجوئی کے خیال سے ان کا ساتھ دیتا رہا۔ ابراہیم نے جلد ہی کھانا لگا دیا۔ وہ ہمیشہ سے چاول مچھلی بہت لذیذ بناتا تھا۔ اور پھر کھانے کے دوران وہ آس پاس ٹہلتا رہتا تاکہ ہم اس کے کھانے کی تعریف کر سکیں۔

انسان ہمیشہ سے صرف اپنے ہنر کی تعریف کا ہی تو بھوکا رہا ہے۔ دُنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی کے پیچھے کی تاریخ کو اگر کھنگالا جائے تو آپ کو کہیں نہ کہیں اس بھوک کا سراغ

ضرور ملے گا۔ یہی بھوک انسان کو کچھ انوکھا، کچھ الگ، کچھ سب سے بڑھ کر کر دکھانے پر مجبور کرتی ہے، تب انسان سے تاج محل جیسے شاہ کار سرزد ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں مجھے کبھی کبھی ایسا کیوں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ تعریف اور سراہنے کا جذبہ انسان میں نہ ہوتا تو ہم ابھی تک پتھر کے دور میں ہی جی رہے ہوتے۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے صدیقی صاحب سے اجازت چاہی۔ وہ میرے ساتھ ہی باہر صحن میں بنے لکڑی کے چھوٹے سے سفید پھاٹک نما گیٹ تک آئے۔ میں رخصت لے کر نکلنے لگا تو انہوں نے پلٹنے سے مجھے روک لیا کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے جیسے میرے چہرے پر کچھ کھوج رہے ہوں۔

''زندگی کسی ایک رشتے کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ اور پھر ہمیں اسے اکیلے ختم کرنے کا حق ہی کہاں ہے۔ ہم اپنی زندگی اپنے لیے جی ہی کب پاتے ہیں، یہ مختصر زندگی تو دوسروں کے لیے جینے میں ہی کٹ جاتی ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم دوسروں کے لیے جینا خوب جانتے ہو۔''

صدیقی صاحب میرا کندھا تھپک کر واپس اندر مڑ گئے۔ میں بھی باہر نکل آیا۔ ٹھنڈی سڑک سنسان پڑی ہوئی تھی۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر میونسپلٹی کے لیمپ پوسٹ لگے ہوئے تھے جن کی پیلی (Yellow) روشنی سڑک پر دائروں کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ رات کو سڑک پر دُور دُور پھیلی یہ گول روشنیاں ہمارا فاصلہ تو کم نہیں کرتیں البتہ ہمارا سفر آسان کر دیتی ہیں۔ اچھے دوستوں کی طرح، جو اگر ساتھ ہوں تو غم بھی خوشی کی طرح کٹ جاتے ہیں۔ مجھے اُس وقت کامران کی بہت کمی محسوس ہوئی۔ میں نے گھر سے نکلنے کے بعد اب تک فرداً فرداً تمام حالات کے بارے میں اپنے خطوط کے ذریعے باخبر رکھا تھا، لیکن عبداللہ سے ملاقات کے بعد میں اُسے بھی خط نہیں لکھ پایا تھا۔ میں پیدل ہی پلیٹ فارم کی طرف چلتا رہا۔ جانے صدیقی صاحب نے آج میرے گھر سے واپسی کے وقت دوسروں کے لیے جینے والی بات کیوں کہی تھی، کتنی عجیب بات تھی، اپنے حالات سے صرف میں ہی واقف نہیں تھا باقی میرے پاس رہتے بھی لوگ میرے پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ کتنے لوگ صرف ایک میری وجہ سے پریشان تھے۔ مجھے اب اس شہر سے کہیں

اور چلے جانا چاہیے۔ بنا کسی کو کچھ بتائے، کچھ بولے۔۔۔۔ ہاں واقعی۔۔۔۔ اب مجھے کس بات کا انتظار تھا، میں کیوں اس کی رخصتی قریب آنے کے دن گننے کے لیے یہاں بیٹھا تھا۔ یہ کہانی تو اب ختم ہو چکی تھی، پردہ کتنے دن بعد گرنا ہے، اب اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔۔۔۔؟

یہ کیسا ستم تھا۔۔۔۔۔ میری محبت لٹ رہی تھی اور صدیقی صاحب اور ان جیسے اور کتنے ہوں گے جو اس وقت بھی مجھ سے کسی ڈوبتے جہاز کے کپتان کا سا وقار توقع کرتے تھے، ایک ایسے بحری جہاز کا کپتان جو یہ جانتا ہو کہ اس کے آدھے ڈوبے ہوئے جہاز کو پورا غرق ہونے سے اَب دُنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی، پھر بھی وہ اپنے عملے اور مسافروں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جہاز کے شکستہ عرشے پر سینہ تانے کھڑا رہتا ہے۔ اور آخر کار جہاز کے ساتھ ہی غرق ہو جاتا ہے، جانے ان لوگوں نے مجھے اتنا دلیر اور اتنے بڑے دل والا کیسے سمجھ لیا تھا۔۔۔؟

OO

یہودی بستی

شام کو جب مَیں سارہ کے گھر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا تب کامران آ گیا۔

"کیا۔۔۔ تم اس یہودی بستی میں جاؤ گے، ناممکن۔"

"اوہو۔۔۔ مَیں کسی یہودی بستی میں نہیں بلکہ سارہ کے گھر جا رہا ہوں جو یونیورسٹی کے پچھلے بلاک میں ہی واقع ہے۔"

"جانتا ہوں، اُسی کو مَیں یہودی بستی کہتا ہوں۔ تمھارے ایڈمیشن سے پہلے دو مرتبہ تمھارے ہی کام سے گزر ہوا تھا میرا وہاں سے۔ ایک عجیب سی حقارت تھی ان سب کی نظروں میں میرے لیے جیسے میں کوئی انسان نہیں، کسی نالی کا کیڑا ہوں۔ کسی نے میری بات کا صحیح جواب تک نہیں دیا۔ تم نہیں جانتے، صرف تمھارے فارم اس آئزک سے تصدیق کروانے میں مجھے کس قدر مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ میری مانو تو وہاں جانے کا ارادہ بدل دو۔"

مَیں نے مُسکرا کر کامران کے کاندھے کو تھپتھپایا اور اس کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے لی۔

"فکر مت کرو، تمھارا دوست اتنی میٹھی گولی نہیں ہے جسے وہ لوگ اتنی آسانی سے نگل جائیں گے۔ مَیں صرف سارہ اور اس کی مما کی وجہ سے وہاں جا رہا ہوں۔ ان لوگوں سے ملنا میرے ٹرم پیپر میں بھی میری مدد کرے گا۔ مَیں ان لوگوں کا رہن سہن قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کامران نے ٹھنڈی سی سانس لی۔

"اچھا۔۔۔ پھر اس یہودی حسینہ کو میرا اسلام بھی کہہ دینا۔۔۔ اور یہ بھی کہنا کہ آئندہ جب بھی تمھیں اپنے گھر کھانے پر بلائے تو ساتھ ہی تمھارے جگری دوست کامران کو بھی ضرور بلائے۔ کیونکہ تم اس کے بغیر کھانا حلق سے نیچے نہیں اُتار سکتے۔"

مَیں آٹھ بجے کے لگ بھگ سر آئزک کے بنگلے پہنچ گیا۔ سارہ نے گیٹ پر ہی میرا استقبال کیا۔ مسز جینی اندر لاؤنج میں موجود تھیں لیکن سر آئزک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ سارہ کا گھر بہت سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ گھر کی ہر چیز سے نفاست اور اعلیٰ معیار ٹپک رہا تھا۔ سارہ کی بنائی ہوئی بہت سی پینٹنگز دیواروں پر سجی ہوئی تھیں۔ گھر کے ایک کونے میں چھوٹا سا عبادت خانہ بھی بنا ہوا تھا۔ جس کے چوبارے کے گرد بہت سی موم بتیاں ایک خاص ترتیب میں رکھی گئی تھیں۔ ضرور ان موم بتیوں کا تعلق بھی ان کی عبادت کے کسی خاص حصے سے ہوگا۔ سارہ انتظامات میں لگ گئی اور مسز جینی میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"ہاں تو اب بتاؤ، یہاں تک کیسے پہنچے؟ تمھارے ملک کے بارے میں مَیں نے بہت سنا ہے، لیکن تم اتنے پُراسرار نہیں لگتے جتنی پُراسرار کہانیاں تمھارے لوگوں کے بارے میں سنی تھیں؟"

"ایسا کچھ خاص ہے نہیں میرے پاس بتانے کے لیے، اور دوری ہمیشہ چیزوں کو پُراسرار بنا دیتی ہے۔ قریب آنے پر چیزوں اور لوگوں کی پُراسراریت ختم ہو جاتی ہے تبھی میں آج آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔"

سارہ جو قریب ہی میز پر پھلوں کی ٹوکری سجانے میں مشغول تھی میری بات سُن کر ہنس پڑی اور ماں سے کہنے لگی۔

"آپ ان سے کسی بات کے سیدھے جواب کی توقع مت کیجیے گا۔ اسے سوالوں کے جواب میں سوال کرنے کی عادت ہے۔"

مسز جینی ہنس پڑیں۔ مَیں نے اپنے بارے میں انہیں مختصراً بتا دیا۔ مسز جینی غور سے سنتی رہیں۔ مَیں نے ان سے سر آئزک کے بارے میں پوچھا۔

"وہ ابھی آتے ہوں گے۔ یہ ان کی عبادت کا وقت ہے۔ دراصل تمھارے معاملے کی وجہ سے ان میں اور سارہ میں کچھ تناؤ سا چل رہا ہے۔ اس لیے وہ کچھ اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ اس لیے ذرا دیر سے ہی آئیں گے۔"

مَیں حیرت سے اس باوقار سی عورت کو دیکھتا رہا، کس قدر آسانی سے انہوں نے بنا کچھ لگی لپٹی رکھے سب سچ بتا دیا تھا۔ سارہ بھی یقیناً انہی کا پرتو ہوگی۔ وہ بھی انہی کی طرح

صاف دل اور سچی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو کوئی بھی بات بنا دیتا لیکن اپنے گھر کی اندرونی بات کبھی نہ بتاتا۔

"اوہ۔۔۔۔ پھر تو آپ کو مجھے یہاں مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس سے باپ بیٹی کے بیچ تناؤ مزید بڑھنے کا اندیشہ ہے۔"

"نہیں۔۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔ سارہ نے تمھارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مجھے، میں خود بھی تم سے ملنا چاہتی تھی۔ سارہ کبھی کسی غلط آدمی کی حمایت نہیں کر سکتی۔ تم سے مل کر مجھے اس بات کا ایک بار پھر سے یقین ہو گیا ہے۔"

کچھ ہی دیر میں سر آئزک بھی گھر کے پچھواڑے سے نمودار ہو گئے۔ آج واقعی وہ اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔ سر پر چھوٹی سی سفید ٹوپی، جسم پر لمبا سا چغہ اور ہاتھوں میں لکڑی کی بڑی سی تسبیح۔ مجھ سے انہوں نے خندہ پیشانی سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر ہم موسم کی اور اِدھر اُدھر کی معمول کی باتیں کرتے رہے پھر سارہ نے ہمیں کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ کھانا واقعی بہت لذیذ تھا۔ سارہ اور مسز جینی نے مل کر اپنے ہاتھوں سے بہت سی ایسی ڈشز تیار کی تھیں جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں چکھی تھیں۔ مثلاً کھجور کا ایک خاص قسم کا حلوہ جو ناریل کی قاشوں میں اُبال کر بھرا گیا تھا۔ ہرن کے گوشت کے نمکین کباب اور اس جیسی اور جانے کیا کیا سوغاتیں۔

میں نے مسز جینی سے کھل کر کھانے کی تعریف کی اور انہیں یہ بھی کہا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ سارہ بھی واقعی اتنا کچھ بنا سکتی ہوگی۔ جواب میں سارہ صرف مسکراتی رہی۔ سر آئزک نے سارہ سے کھانے کے دوران کوئی بات نہیں کی۔ کھانے کے بعد مسز جینی اور سارہ کچن میں مصری قہوہ بنانے کے لیے چلے گئے۔ میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ گھر میں جو دو چار ملازمائیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں، انہوں نے صرف کھانا لگانے اور برتن اُٹھانے میں ماں بیٹی کی مدد کی ورنہ زیادہ تر کام خود سارہ اور مسز جینی نے ہی خود اپنے ہاتھوں سے کیا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہ یہودیوں کا دوسروں کو عزت دینے کا ایک خاص انداز تھا۔ مجھے کامران کی بات یاد آئی جو اس نے یہاں کے لوگوں کے بارے میں بتائی تھی۔

سارہ اور جینی کے جانے کے بعد میں اور سر آئزک ڈائننگ ٹیبل پر تنہا رہ گئے، انہوں

نے غور سے میری طرف دیکھا۔

"تمھارا ٹرم پیپر کہاں تک پہنچا۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے کہ تم کوئی بہتر پرچہ تیار کرو گے۔ کیونکہ یہ آئندہ ہمیشہ یونیورسٹی کے ریکارڈ میں رہنے والی ایک چیز ہوگی۔" میں ان سے اس سوال کی توقع کر رہا تھا۔

"یقیناً سر۔۔۔۔ میں پوری تحقیق کے بعد ہی اپنا نظریہ اس پرچے کی صورت میں جمع کراؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس کی کتنی اہمیت ہے۔"

"تم نے اس سلسلے میں لائبریری میں موجود کتابوں سے تو کافی مدد لی ہوگی۔"

"جی بالکل۔۔۔۔ نہ صرف یونیورسٹی کی لائبریری سے بلکہ شہر کی دیگر لائبریریوں سے بھی میں نے کافی مدد لی ہے۔ شہر میں اور انٹرنیٹ پر جتنا مواد مجھے مل سکتا تھا میں نے اکٹھا کر لیا ہے۔" میری بات پر سر آئزک نے چونک کر سر اُٹھایا۔

"کس کس کتاب سے حوالے جمع کیے ہیں تم نے۔"

میں نے انہیں سر ڈیوڈ رونگ کی کتاب سے لے کر اب تک اس موضوع پر چھپنے والی تمام کتابوں کے نام گنوا دیے۔ سر آئزک کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ کچھ تلخ لہجے میں بولے۔

"اتنے اہم موضوع پر لکھنے کے لیے تم نے ان گھٹیا اور بے تحقیق قسم کی کتابوں کا سہارا لیا ہے۔ اگر تمھیں مدد کی ضرورت تھی تو مجھے کہتے میں تمھیں ان سے ہزار درجہ بہتر کتابوں کے نام بتا سکتا تھا۔"

"اتنے میں سارہ اور مسز جینی بھی قہوہ لے کر میز پر آ چکی تھیں۔ سارہ نے اپنے باپ کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر کہا۔

"پاپا بہتر ہوگا کہ ہم یونیورسٹی کی باتیں یونیورسٹی میں ہی ڈسکس کریں، یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

لیکن سر آئزک کے لہجے کی تلخی اَب بھی برقرار تھی۔

"یہ بات صرف یونیورسٹی یا لائبریری میں جمع کیے جانے والے ایک ٹرم پیپر کی بات نہیں ہے۔ یہ ہمارے عقیدے اور نظریے کی بات ہے۔ اور میں کسی کو بھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اور دوسرے لوگوں کے بیچ ممتاز اور منفرد نظر آنے کے لیے اپنے اس نظریے

کا غلط پرچار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"سر میں نے کبھی سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے یا منفرد نظر آنے کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ اور پھر میں غلط ہوں یا صحیح، اس کا فیصلہ آپ ابھی سے کیسے کر سکتے ہیں۔ پہلے میرا پرچہ تو جمع ہو جانے دیں۔ پھر میں اس پر کیے گئے اعتراضات کا جواب بھی پوری ایمان داری اور سچائی کے ساتھ دوں گا۔"

سر آئزک نے کڑے تیوروں کے ساتھ میری بات سُنی۔ پھر انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنایا اور وہاں سے اُٹھ گئے۔ لیکن جاتے جاتے انہوں نے عبرانی میں مسز جینی سے کہا کہ وہ سمجھتے ہیں کہ گھر میں ایک غلط مہمان کو مدعو کیا گیا ہے۔

سارہ نے احتجاجی انداز میں زور سے سر آئزک سے صرف اتنا کہا۔

"پاپا۔۔۔"

"سر آئزک اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ وہ اس بات سے شاید بے خبر تھے کہ میں عبرانی زبان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ سارہ کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور وہ پیر پٹختے ہوئے باپ کے پیچھے اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں نے مسز جینی سے اجازت طلب کی۔ انہوں نے کھلے دل سے اپنی غلطی تسلیم کی کہ ان کے شوہر کی وجہ سے بدمزگی سی پیدا ہو گئی تھی اور اس بات کے لیے انہوں نے مجھ سے معذرت کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے فوراً انہیں روک دیا۔

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔۔ مجھے یہاں آکر واقعی بہت اچھا لگا۔ آپ سے ملنا بھی زندگی کا ایک بہت خوبصورت تجربہ ہے۔ آپ کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"دراصل میں سمجھتی تھی کہ تمھارے یہاں آنے سے آئزک کو تمھارے بارے میں مزید جاننے کا موقع ملے گا۔ اور اُن کے اور سارہ کے بیچ میں تناؤ میں کچھ کمی آئے گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ میں نے آج تک پوری زندگی میں کبھی آئزک کو اس قدر بد تہذیب برتاؤ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ یقیناً کسی شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔"

میں مسز جینی کا ہاتھ تھپک کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ انہوں نے باہر تک مجھے چھوڑنے کے لیے آنا چاہا لیکن میں نے انہیں روک دیا کہ ہمارے ہاں بڑے چھوٹوں کو یوں شرمندہ نہیں

کرتے۔ میں باہر نکلا تو ہوا خنک تھی اور ہوا میں برف کے چھوٹے چھوٹے ذرّے شامل ہو کر اِدھر اُدھر ڈولتے ہوئے گر رہے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اُٹھا لیے اور دور اینٹوں سے بنی پکی روش پر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اندر سے سارہ مجھے آوازیں دیتی، اور تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اُس نے جلدی میں کوئی گرم چیز بھی اوپر اوڑھنے کے لیے نہیں لی تھی اور مجھ تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ کپکپانے لگی تھی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔ تم مجھ سے وداع لیے بغیر کیسے نکل پڑے۔۔۔۔ میں تو پاپا سے بات کرنے کے لیے دو گھڑی اندر کیا گئی تم تو باقاعدہ رخصت ہی ہو لیے۔؟"

"جس غصے میں تم وہاں سے گئیں تھیں۔ مجھے نہیں لگا تھا کہ تم جلد واپس آؤ گی۔ اور تمھاری مما بے چاری خواہ مخواہ میرے سامنے معذرتیں پیش کر کر کے تھک جاتیں۔ سو میں نے سوچا کہ نکل جانا ہی بہتر ہے۔ ہاں البتہ میں رات دیر گئے تمھیں فون ضرور کرتا۔"

سارہ کے چہرے پر بھی خجالت سی تھی۔

"مجھے پاپا سے اس رویے کی اُمید نہیں تھی۔۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔۔ پلیز۔۔۔"

"آج مجھے احساس ہوا کہ اس باہمت لڑکی کے اندر بھی ایک بے حد نازک سا دل دھڑکتا ہے۔ اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں، میں نے جلدی سے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو، یقین جانو مجھے سر آئزک کی کوئی بھی بات بُری نہیں لگی۔ انسان اپنے نظریات کے بارے میں جذباتی ہو ہی جاتا ہے۔ وہ تو انہوں نے خود اس بات کا ذکر چھیڑ دیا تھا ورنہ میں اس جگہ کبھی ان سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرتا۔ تم یقین کرو، یہاں آکر میرے دل میں تمھاری، تمھاری مما اور سر آئزک کی عزت اور زیادہ بڑھی ہے۔ اس میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ اور یہ میں پورے خلوص دل سے کہہ رہا ہوں۔"

سارہ کچھ دیر تک یونہی چپ سی کھڑی رہی۔ میں جانتا تھا اُس جیسی وضع دار لڑکی کے لیے یہ کس قدر مشکل مرحلہ ہو سکتا تھا۔ ہوا میں تیزی آگئی تھی اور اَب باقاعدہ برف باری شروع ہو گئی تھی۔ برف کے بڑے بڑے گالے ہم دونوں کے بالوں میں چاندی سی بکھیرنے لگے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ اُتار کر سارہ کے کاندھوں پر ڈال دی، اور اس کے بال بکھیر دیے۔

"چلو اَب تم اندر جاؤ۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ کہیں تمھیں کچھ ہو گیا تو سر آئزک واقعی میرا داخلہ یونیورسٹی میں بند کر دیں گے۔"

میرا یہ وار کارگر رہا اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔ اس کے دل کا بوجھ کم ہوتا دیکھ کر مجھے بھی بہت سکون محسوس ہوا۔ اُس نے ہلکے سے مجھے چھیڑا۔

"آج احساس ہو رہا ہے کہ تم لوگوں کو کیسے جیت لیتے ہو۔ لیکن یاد رہے یونیورسٹی میں تمھاری اور تمھارے نظریات کی سب سے بڑی مخالف اَب بھی مَیں ہی ہوں۔ مَیں اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔"

مَیں مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ مَیں نے اگنیشن آن کی اور کھڑکی سے سر نکال کر اسے جواب دیا۔

"چلو تم نے آج اتنا تو تسلیم کر لیا کہ تم کبھی نہ کبھی ہارو گی ضرور۔۔۔۔ چاہے آسانی سے نہ سہی۔۔۔۔ بہت جدوجہد اور جستجو کے بعد ہی سہی۔۔۔۔"

اُس نے مسکراتے ہوئے مجھے الوداع کہا۔ جب مَیں گاڑی اس کے محل نما گیٹ سے باہر نکال رہا تھا، تب میں نے بیک ویو مرر Back view mirror میں دیکھا کہ وہ ابھی تک تیز گرتی برف میں وہیں کھڑی مجھے جاتا دیکھ رہی تھی۔ برف اس کے بالوں اور ہلکے سے گڑھے پڑے گالوں کو چھو چھو کر زمین پر گر رہی تھی۔ جیسے برف کی کوئی شہزادی اپنی سلطنت میں کھڑی ہو۔ میری گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا اور مَیں رفتہ رفتہ اس کے محل سے دُور ہوتا چلا گیا۔ لندن سنسان تھا، رات گہری تھی اور سڑکیں خالی تھیں۔ میرا دوست دریائے ٹیمز بھی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ سفید برف کی رضائی نے اُسے ڈھانپ رکھا تھا۔ سڑکوں کے کنارے لمبے لمبے درخت ایک دوسرے کو کہانی سناتے سناتے چُپ سے ہو گئے تھے اور حیرت سے برف کے گالوں کو خود سے شرارت کرتا دیکھ رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں گرتی برف کا منظر اور لطف وہی لوگ جانتے ہیں جو خود کبھی رات میں تنہائی میں کسی ویرانے میں برف گرتی دیکھ چکے ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آسمان سے ننھے سفید گالوں کی صورت میں نور کی برسات ہو رہی ہو۔ گرتی برف کی اپنی ایک سفید دودھیا سی روشنی ہوتی ہے جیسے بہت سے جگنو بیک وقت آپ کو راستہ دکھا رہے ہوں۔ ایسے ہی بہت سے جگنو اس وقت میری دوڑتی گاڑی کے آس

پاس گر رہے تھے۔ مجھے اس وقت بچپن میں نانی اماں سے سُنی ایک لوری بہت شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جس کے بول کچھ یوں تھے۔

"چندا کو ڈھونڈنے بھی۔۔۔

تارے نکل پڑے

محلوں کی نیند چھوڑ کر

سارے نکل پڑے۔۔۔۔"

میری گاڑی سفید برف سے بھری سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ مَیں بھی تو اک ٹوٹا تارہ تھا۔ جو اپنے چاند سے بچھڑ کر جانے کب سے اُسے ڈھونڈ رہا تھا۔

OO

وہ اِک ملاقات

اس روز صبح سے ہی آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے شریر بچوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ آخرِ ستمبر کی میٹھی سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ دھوپ اپنی تمازت کھو چکی تھی اور سائے لمبے اور سرد تھے۔ بالآخر بادلوں کے ان شریر ٹکڑوں نے ایک دوسرے کو پکڑ ہی لیا اور سارا آسمان گہرے کالے بادلوں سے ڈھک گیا۔ مَیں اس وقت گیارہ بجے والی مال گاڑی سے مال اُتروا رہا تھا جب پہلی بوند نے میرا ماتھا چوما تھا۔ کچھ ہی دیر میں آسمان سے مینہ کی جھڑی برسنا شروع ہوگئی۔ مزدوروں نے بھاگ کر اِدھر اُدھر چھپنے کی جگہ تلاش کرنا شروع کردی۔ غفورے نے ایک برآمدے کے لکڑی اور ٹین سے بنے چھت کے نیچے پہنچ کر مجھے آوازیں دینا شروع کردیں کہ مَیں وہاں کھڑا بھیگتا نہ رہوں بلکہ برآمدے کی طرف چلا آؤں۔ جانے لوگ بارش سے کیوں چھپتے ہیں۔ بارشیں تو تن اور من کو بھگو کر اُجلا کردیتی ہیں۔۔۔۔۔

اتنے میں دُور سے صدیقی صاحب کے دفتر کا چپڑاسی چھتری سر پر تانے بارش میں سڑپ سڑپ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پلیٹ فارم کے آخری سرے سے نمودار ہوا۔ اور میرے قریب آکر کہنے لگا۔

''حماد بابو۔۔۔۔ صدیقی صاحب کے دفتر میں آپ کا فون آیا ہے، وہ بلاتے ہیں آپ کو۔''

''میرا فون۔؟''

مَیں حیرت سے بڑبڑایا۔ لیکن زیادہ سوال جواب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں اس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ غفورے کو ہاتھ کے اشارے سے دُور ہی سے سمجھایا کہ میرا فون آیا ہے۔ صدیقی صاحب کے دفتر تک پہنچتے پہنچتے میں پورا شرابور ہو چکا تھا۔ اس لیے دروازے

کے باہر کھڑے ہو کر باقاعدہ خود کو جھاڑنا پڑا۔

اندر داخل ہوا تو دو چار ملاقاتی یا شاید مسافر صدیقی صاحب کی میز کے گرد جمع تھے۔ صدیقی صاحب کے کمرے میں ایک ہی نمبر کی دو لائنیں تھیں۔ ایک فون ان کی میز پر اور دوسرا سامنے بیٹھے ہیڈ کلرک میز پر رکھا تھا۔ زیادہ تر فون ان کا ہیڈ کلرک بشیر ہی وصول کرتا تھا۔ لیکن اس وقت دونوں ہی فون خاموش کریڈل پر پڑے تھے۔ مَیں نے سوالیہ نظروں سے بشیر کی طرف دیکھا۔ صدیقی صاحب نے فائلوں پر سے نظر اُٹھائے بغیر مجھ سے کہا۔

''لائن لمبی ہوتی جارہی تھی، مَیں نے دوبارہ کرنے کا کہا ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی کال آتی ہی ہوگی۔''

مَیں وہیں ہیڈ کلرک کی میز کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بشیر نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''کسی لڑکی کا فون تھا۔''

مَیں نے چونک کر بشیر کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ کے علاوہ دیگر کوئی خبر نہیں تھی۔ یہ کون سی لڑکی تھی جو مجھے صدیقی صاحب کے نمبر پر فون کر رہی تھی۔؟

باہر موسلا دھار بارش مزید تیز ہوگئی تھی اور کمرے کی کھڑکی سے باہر جہاں تک اسٹیشن اور پلیٹ فارم دکھائی دیتا تھا وہاں ہر چیز جیسے ڈھل سی گئی تھی۔ کالی چھتریاں تانے لوگ اِدھر اُدھر تیزی سے چلتے ہوئے گزر رہے تھے، کچھ دُور اندیش جو صبح کے وقت موسم کے تیور دیکھ کر گھر سے نکلتے تھے اور وہ اپنی لمبی لمبی برساتیاں پہنے، کالر اُٹھائے دوسروں کی طرف دادطلب نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ دیکھو ہم جانتے تھے کہ آج بارش ہوگی۔ اتنے میں اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ مَیں اپنے خیالات میں اس قدر مگن تھا کہ بس اُچھلتے اُچھلتے رہ گیا۔ بشیر نے فون اُٹھایا۔

''جی۔۔۔۔ جی جی۔۔۔۔ یہ لیں بات کریں۔''

بشیر نے فون میری طرف بڑھایا، مَیں نے ریسیور کان کے ساتھ لگایا۔

''ہیلو۔۔۔۔ حماد بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے ایک نازک اور مخملی سی آواز اُبھری۔

"جی۔۔۔ہیلو۔۔۔"

"جی کون بول رہی ہیں۔"

"مَیں۔۔۔مَیں حیا بول رہی ہوں۔"

میرے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔ حیاء۔۔۔؟ فون پر۔۔۔۔ یہاں۔۔؟ اس وقت۔۔۔؟

"آپ۔۔۔آپ کو یہ نمبر کیسے۔۔۔؟ میرا مطلب ہے، سب ٹھیک تو ہے نا۔"

حیا کچھ جلدی میں اور کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔

"جی۔۔۔سب ٹھیک ہے۔ کیا آپ آج شام چار بجے پُرانی حویلی آ سکتے ہیں۔"

"پُرانی حویلی۔۔۔۔جی ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔۔۔۔لیکن۔"

"کوئی سوال نہ پوچھیئے گا، مَیں ہمسایوں کے ہاں سے بڑی مشکل سے فون کر رہی ہوں بس آپ تک ایمان آپی کا یہ پیغام پہنچانا تھا۔ دیکھیں وقت پر آ جایئے گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ باقی بات وہیں ہوگی۔ آیئے گا ضرور۔ خدا حافظ۔

ایمان کا پیغام۔۔۔یا خدا۔۔۔۔ یہ لڑکی کیا کہہ رہی تھی۔ کیا ایمان بھی وہاں آنے والی تھی، مَیں نے فوراً اسے روکنے کے لیے کہا۔

"ہیلو۔۔۔ہیلو میری بات۔۔۔۔"

لیکن دوسری طرف سے لائن کٹ چکی تھی۔ باہر زور سے بادل گرجا اور پھوار کا ایک تیز ریلا ہوا کے ایک شدید جھونکے کے ساتھ کھڑکی سے آ کر ٹکرایا۔ کھڑکی کے پٹ کھل گئے اور پانی کی بوندیں اندر کمرے میں بہت کچھ بھگو گئیں۔ بشیر نے جلدی سے اُٹھ کر کھڑکی بند کی۔ مَیں اَب تک ویسے ہی گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ یہ حیا کیا کہہ گئی تھی۔ ایمان نے مجھے پُرانی حویلی پہنچنے کا پیغام کیوں دیا۔۔؟۔۔۔ کیا واقعی وہ خود بھی حویلی آ رہی تھی۔۔۔؟ نہیں نہیں۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تین ہفتوں کے بعد اُس کی رخصتی ہونے والی ہے۔ وہ ایسے ہی گھر سے کیسے نکل سکتی ہے، تو پھر۔۔۔۔ حیا نے مجھے حویلی یہ کہہ کر کیوں بلایا ہے کہ یہ ایمان کا پیغام ہے۔۔۔؟ ہو سکتا ہے ایمان نے میرے اس دن کے غالب والے شعروں کے بدلے میں

کوئی پیغام دیا ہو۔۔۔۔لیکن کیا۔۔۔۔؟۔۔۔۔

کچھ دن سے صدیقی صاحب نے مجھے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بنا ہوا ہٹ الاٹ کر دیا تھا جس کی چھت ٹین کی تھی۔ یہ اسٹیشن کے عقب میں درختوں بھری اِک سڑک کے اختتام پر واقع تھا۔ کسی زمانے میں ایسے بہت سے ہٹ ریلوے کے چھڑے اور کنوارے افسروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ جیسے ان ہٹس میں سے یہ ایک ہٹ خالی ہوا تو صدیقی صاحب نے عارضی طور پر میرے نام الاٹ کر دیا۔ مَیں بشیر کی میز سے فون سن کر گم صم سا اُٹھا اور اپنے ہٹ میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹین کی چھت پر بارش کی بوندیں اپنا مخصوص جلترنگ بجا رہی تھیں۔ لگتا تھا آج آسمان نے بھی کھل کر برسنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو مَیں بارش اور اس ٹین کے چھت کے جلترنگ کا خوب لطف لیتا کیونکہ بچپن میں میں اور کامران ایسی بارش میں فوراً میری دادی اماں کی حویلی کے ٹین کے چھت والے کمرے میں بھاگ کر آ جاتے اور پھر ہم ٹین کی چھت پر گرنے والی بارش یا پھر اولوں سے پیدا ہونے والی آوازوں کو میز بجا بجا کر مختلف دھنوں میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کرتے اور چیخ چیخ کر اپنے بچپن کے گانے گاتے تھے۔

لیکن اس وقت میرا سارا دھیان حیا کے فون کی طرف تھا۔ میری اپنی سوچوں میں دن کے تین بج گئے، مَیں اس وقت زور سے چونکا جب اسٹیشن کے بڑے گھڑیال نے تین بجے کا گھنٹہ بجایا۔ ٹن، ٹن، ٹن۔۔۔۔

اوہ۔۔۔۔اس وقت تک تو مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ اتنی تیز بارش میں جانے کوئی سواری بھی ملتی ہے یا نہیں۔ میں نے آس پاس نظر دوڑائی۔ ابراہیم میری اکلوتی پینٹ اور شرٹ حسبِ معمول دھلوا کر اور ریلوے کے دھوبی سے استری کروا کر کمرے میں لٹکا گیا تھا۔ مَیں نے جلدی سے کپڑے تبدیل کیے۔ لیکن پھر مجھے خود پر ہی ہنسی آ گئی۔ مَیں نے ایک بھیگا جوڑا جو میری وردی کی صورت میں تھا، وہ تو اُتار دیا تھا، لیکن میرے پاس بھلا کون سی چھتری تھی جو مَیں اس دوسرے جوڑے کو بھی بھیگنے سے بچا پاتا۔ بہر حال، اب یہ وقت چھتری ڈھونڈنے کا نہیں تھا۔ مَیں تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا پلیٹ فارم جانے والی پٹڑی سے ہوتا ہوا پلیٹ فارم تک جا پہنچا۔ بارش کی وجہ سے آس پاس

کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں نے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکل کر کسی سواری کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک آدھ تانگہ اور ایک دو ٹیکسیاں وہاں سے گزریں لیکن بھی میں سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ خیر وہ بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر وقت ضائع کرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ میں پیدل ہی بڑی سڑک پر چل پڑوں۔ شاید راستے میں کوئی سواری مل ہی جائے۔ بارش میرے پورے وجود کو بار بار کسی چھلنی کی طرح چھل رہی تھی۔ اسٹیشن سے کافی دُور آنے کے باوجود مجھے ابھی تک کوئی سواری نہیں ملی تھی۔ اب مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں وقت پر پُرانی حویلی نہیں پہنچ پاؤں گا۔ کیونکہ ساڑھے تین تو مجھے یہاں شہر میں ہی ہو گئے تھے۔ مجھے خود پر شدید غصہ آنے لگا کہ میں پہلے ہی اسٹیشن سے کیوں نہیں نکل آیا تھا۔

پھر جیسے اچانک ہی قدرت کو میری بے بسی اور جھنجلاہٹ پر رحم آ گیا۔ میں اس وقت لٹن روڈ کی بڑی سڑک سے ہوتا ہوا چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہو چکا تھا اور اسٹاف کالج روڈ کے قریب پہنچنے والا تھا کہ اچانک ایک موڑ سے ایک خالی تانگہ جو شاید کسی فوجی سواری کو اسٹاف کالج چھوڑ کر واپس جا رہا تھا، نمودار ہوا۔ میں نے فوراً تانگے والے کو رکنے کا اشارہ کیا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر جتنے بھی روپے ہاتھ میں آئے میں نے اُسے تھما دیے اور اُسے تیز اور جلدی پُرانی حویلی کی طرف چلنے کو کہا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور پکی ڈھلی سڑک پر تانگہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ آس پاس گھنے بادلوں اور کالی گھٹا کی وجہ سے گہری شام جیسا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ایسے میں جب بجلی زور سے چمکتی تو یوں لگتا کہ جیسے کسی نے پل بھر کے لیے تمام ماحول پر قلعی سی پھیر دی ہے۔ بادل ویسے ہی زور زور سے گرج رہے تھے اور برستی بارش کی بوچھاڑ میں بھاگتے ہوئے پانی سے شرابور گھوڑے کے نتھنوں سے ہر لیتی سانس کے ساتھ گرم بھاپ کے مرغولے سے اُٹھ رہے تھے۔ پکی سڑک سے اُتر کر گھوڑا گیلی کچی زمین پر جے پانی کے گڑھوں اور کیچڑ میں چھپ چھپ کرتا پُرانی حویلی کے راستے پر رواں دواں تھا۔

تانگے والے نے اپنے معاوضے کا پورا حق ادا کیا اور مجھے ٹھیک چار بجے حویلی کے پھاٹک پر اُتار دیا۔ وہاں پہلے ہی سے ایک اور تانگا بھی کھڑا تھا۔ لگتا تھا کوئی سواری آئی تھی

جس نے موسم کے تیور دیکھ کر اُسے واپسی کے لیے یہیں روک لیا تھا۔ میرے تانگے والے نے بھی مجھے پیش کش کی کہ میں اگر واپسی کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ یہیں انتظار کرے گا۔ میں نے اُسے بھی رکنے کا کہہ دیا۔ دونوں تانگے والے آپس میں خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ میں برستی بارش سے بھیگا لکڑی کا پھاٹک کھول کر حویلی میں داخل ہو گیا۔ ایک عجیب سا سناٹا اور ایک عجیب سی اُداسی چھائی ہوئی تھی پورے ماحول پر۔

اچانک حویلی کا پُرانا چوکیدار اللہ بخش کسی جانب سے نمودار ہوا اور مجھے سلام کر کے بتانے لگا کہ نگہت بی بی ابھی بڑے گول کمرے کی طرف گئی ہیں۔ پُرانی حویلی کے یہ سارے پُرانے نوکر میرے بچپن کے گواہ تھے اور شاید میرے راز دار بھی۔ ان سبھی کو یہ پتا تھا کہ میں نے گھر چھوڑ دیا ہے اور میں شاکر اور نگہت وغیرہ سے ملنے یہاں آتا ہوں۔ سبھی یہ بھی جانتے تھے کہ میرے گھر والے میری یہاں آمد کے بارے میں باخبر نہیں تھے لیکن ان میں سے کبھی کسی نے جا کر بابا یا امی کو میرے بارے میں خبر نہیں دی تھی۔ شاید اس طرح سے ان سب نے میرے گھر چھوڑنے کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی۔

میں چوکیدار سے مل کر آگے دالان کی طرف بڑھ گیا جس کے سرے پر برآمدہ تھا جس کے سامنے گرمیوں میں ایک قطار سے لکڑی کی بڑی بڑی سے چقیں ڈلی رہتی تھیں۔ اس وقت بارش کی وجہ سے تمام چقوں کو گول سمیٹ کر اوپر بندھی برآمدے کی ڈوری سے باندھ دیا گیا تھا۔ برآمدے کی چھت پر بنے پرنالوں سے بارش کا مٹیالا پانی پوری رفتار کے ساتھ نیچے گر رہا تھا اور اینٹوں سے بنے صحن میں بنی ہوئی چھوٹی کچی اینٹ کی نالیوں سے ہوتا ہوا مختلف کیاریوں میں گر رہا تھا۔ فضا میں صرف ایک ہی پانی گرنے اور بہنے کی آواز تھی باقی سب کچھ جیسے جامد تھا۔

جیسے ہی میں گول کمرے والے برآمدے کی طرف مڑا۔ مجھے برآمدے کے کونے میں سفید چادر میں لپٹی حیا دکھائی دی جو برآمدے کی چھت سے گرتے پانی کے ایک پرنالے سے بنتی پھوار کو اپنی ہتھیلی میں جذب کرنے کی کوشش میں ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

آہٹ سن کر اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، اور جلدی سے مجھے سلام کیا۔
میں اس کی طرف چلا آیا۔

''آپ اس موسم میں یہاں تک کیسے پہنچ گئیں۔ سب خیریت تو ہے نا۔''

وہ ہلکے سے مسکائی۔

''ہم تو عام اور اچھے موسم میں بھی گھر سے نہیں نکل پاتے، لیکن آپ کی ان چار لائنوں نے آنے پر مجبور کر دیا۔ آپ نے کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔''

مجھے اس کے جواب سے کچھ اُلجھن سی ہوئی۔

''مَیں سمجھا نہیں۔۔۔۔ آپ۔''

پھر مجھے فوراً نگہت کا خیال آیا۔

''نگہت کہاں ہے۔ آپ اکیلی یہاں کیا کر رہی ہیں۔''

اُس کی آنکھوں میں اَب وہی مخصوص سی شرارت تھی۔ وہ سامنے والے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''مَیں اکیلی نہیں ہوں، جائیے مِل لیجیے۔۔۔۔''

مَیں اسی حیرت اور اُلجھن میں اس نازک اندام کو دیکھتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اگر نگہت اندر کمرے میں تھی تو پھر وہ یہاں باہر برآمدے میں برستی بارش میں کیوں کھڑی تھی۔ بجلی بھی شاید بارش آتے ہی جا چکی تھی۔ اندر کمرے میں دو چار شمعیں روشن تھیں۔ مَیں نے دروازہ کھولا تو چند لمحے تو مجھے اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ دفعتاً بادل زور سے گرجا اور بجلی کی لپک نے پل بھر کے لیے سب کچھ روشن کر دیا اندر کمرے میں دیوار کے ساتھ سکڑی بیٹھی ہوئی ریشمی وجود کی ایک گٹھڑی میں پل بھر کے لیے ایک جنبش ہوئی۔ اس کے ساتھ طاق پر رکھی موم بتی کا شعلہ زور سے پھڑکا اور کسی کے ماتھے پر وہی اک مخصوص شرارتی سی لٹ لہرا گئی۔ سارا کمرہ اس کی جبیں کے نُور سے روشن ہو گیا۔ وہ ایمان تھی۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ وہ ایمان ہی تھی۔۔۔۔ مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔ میں وہیں دروازے کے پاس اس معجزے کے ہو جانے کا یقین کرنے کے لیے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ شاید نہیں۔۔۔۔ یقیناً یہ کوئی خواب ہی تھا۔ میری تقدیر مجھ پر اتنی مہرباں تو اِک زمانے سے نہ تھی۔

لیکن وہ ایمان ہی تھی۔ سرتاپیر مجسم ایمان، اُس نے سادہ سا سفید لباس پہنا ہوا تھا اور

ایک کالی شال میں ڈھکی ہوئی تھی۔ شاید باہر کھڑے تانگے میں ایمان اور حیاء وغیرہ بھی آئی تھیں۔ کیونکہ ایمان کے ماتھے پر اور بالوں میں ابھی تک برسی بوندوں کے ستارے ٹمٹمار ہے تھے۔ ماتھے کی لٹ بھی بھیگی ہوئی تھی۔ اور وہ اس کونے میں بیٹھی حسبِ معمول اپنے نازک پاؤں کے ناخنوں سے نیچے بچھے قالین کو کرید رہی تھی۔ اُس نے دھیرے سے ویسے ہی سر جھکائے مجھے سلام کیا۔ چند لمحے تو مَیں اسے کچھ بول ہی نہیں پایا، جیسے میری آواز ہی گنگ ہو گئی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے میری زبان سے کچھ نکلا۔

''آپ۔۔۔۔؟ یہاں۔۔۔۔؟ ٹھہریئے۔۔۔۔ کچھ دیر لگے گی مجھے اپنی قسمت اور خوش نصیبی پر یقین کرنے میں۔''

پہلی مرتبہ مَیں نے ایمان کے چہرے پر حیاء کی ایک سُرخ لہر کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، وہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی لیکن مجھے یوں بارش میں بھیگا ہوا دیکھ کر وہ پریشان سی ہو گئی۔

''آپ۔۔۔۔ آپ تو بہت بھیگ چکے ہیں۔ میں نگہت سے کہتی ہوں آپ کے لیے کوئی تولیہ وغیرہ۔۔۔۔''

اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلدی سے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ جیسے مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ اس کمرے سے نکل گئی تو میرا یہ زندگی کا سب سے خوبصورت خواب اُدھورا ہی ٹوٹ جائے گا۔

''پلیز۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔ آپ بیٹھی رہیں۔۔۔۔ مَیں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔۔ کچھ دیر میں خود ہی سب خشک ہو جائے گا۔۔۔۔ آپ کہیں نہ جائیں۔۔۔۔ پلیز۔''

مَیں جلدی سے دروازے سے ہٹ کر اُس کے قریب آ گیا۔ ایمان اُٹھتے اُٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ اب وہ مجھ سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ اتنے قریب۔۔۔۔ کہ مَیں اس کے وجود کی لرزش کو یہاں سے محسوس کر سکتا تھا۔ مَیں وہیں اس کے قریب بیٹھ گیا، اور بیٹھتے وقت مَیں نے اس زہرہ جبیں کے حجاب بھرے سمٹنے کے انداز کو بھی محسوس کیا۔ یہ لڑکی تھی، یا پھولوں بھری اِک لچکتی ڈال۔۔۔۔

چند لمحے ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی اپنے وجود کی لرزش پر

قابو پانے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور مَیں پلکیں جھپکے بنا اُسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پلکیں جھپکنے کا وقفہ بھی اس وقت مجھے بے حد بُرا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مَیں اس کو دیکھوں یا اس سے بات کروں۔ اتنی مشکل تو مجھے کبھی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی بیچ کی خاموشی کا خلا صرف باہر برستی تیز بوندیں پورا کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ جیسے ہم دونوں بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن اس وقت ہم دونوں کے لفظ ہی خاموش ہو گئے تھے۔ پھر اُس نے اپنے مرمریں ہاتھ میں پکڑا وہ تہہ کیا ہُوا کاغذ کا ٹکڑا نکالا جس پر مَیں نے اس دن وہ چند شعر لکھے تھے مَیں جانتا تھا نگہت اس تک یہ کاغذ کسی نہ کسی طور ضرور پہنچائے گی۔

''آپ نے یہ کیا لکھ بھیجا تھا مجھے۔۔۔؟۔۔۔مَیں نے تو آپ سے صرف اتنی درخواست کی ہے کہ آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔۔۔گھر واپس چلے جائیں۔'' آپ میری بات مان کیوں نہیں لیتے۔''

بولتے بولتے اُس کی آواز ہلکی سی بھرّا گئی۔ مَیں نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے نازک سے ہاتھوں کی پشت پر نیلی نیلی سی رگیں نظر آ رہی تھیں اور چہرے پر بھی ایک پیلا پن سا تھا۔

''آپ تو مجھے بیمار لگ رہی ہیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''

اُس نے مجھ پر اک نظر ڈالی۔ اِک زخمی سی نظر جس میں نہ جانے کیا کچھ چھپا تھا۔

''مَیں یہاں آپ سے صرف یہ وعدہ لینے آئی ہوں کہ آپ اپنے آپ کو مزید سزا نہیں دیں گے۔ اس دن۔۔۔ آپ نہیں جانتے اس دن آپ کو اسٹیشن پر دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی تھی۔ مَیں نے اپنے آپ کو کتنا ملامت کیا تھا کہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہُوا ہے۔ نہ آپ مجھے دیکھتے اور نہ۔۔۔''

''خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔۔۔ آپ کو دیکھنا میری زندگی کا سب سے حسین حادثہ تھا اور آپ کی محبت میری اس بے معنی زندگی کا سب سے حسین تجربہ ہے۔ اس محبت نے مجھے آپ سے ملوا دیا۔۔۔ ورنہ میں تو بنا خود کو پہچانے ہی اس دُنیا سے چلا جاتا۔۔۔ اب مجھے اپنی زندگی سے کوئی گلہ نہیں ہے۔۔۔ موت بھی آئی تو۔۔۔''

میری بات اُس نے تڑپ کر کاٹ دی۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، کیوں مجھے میری نظروں میں بار بار گراتے ہیں ۔۔۔کیوں۔۔۔''

وہ اپنی بات پوری کرنے سے پہلے ہی رو پڑی۔ دو موٹے موٹے آنسو اُس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے چھلکے اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی مَیں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی ہتھیلی پر انہیں سمو لیا۔ اور پھر مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اور کس جذبے کے عالم میں، مَیں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے اُس کے دونوں کومل مخمل جیسے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ باہر بادل زور سے گرجے اور بارش کی جھڑی اور تیز ہو گئی۔ باہر آسمان رو رہا تھا اور اندر ہم دونوں۔ جانے اس کے ہاتھ پکڑتے ہی خود میرے اندر سے یہ آنسوؤں کا سیلاب کہاں سے باہر اُمڈ پڑا۔ بجائے اس کے کہ مَیں اُسے چُپ کرواتا خود میری آنکھوں سے بھی آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس کے نرم ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی، کیا سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے لیے اس سے زیادہ حسین اور کسی گھڑی کی تمنا کی جا سکتی تھی؟

ایمان نے نظر اُٹھا کر بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس کے حسن کو اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کی ستارہ جبیں، بڑی بڑی کالی آنکھوں ستواں سی چھوٹی ناک اور لال زمرد جیسے نازک سُرخ لبوں کی پنکھڑیاں، ٹھوڑی کا خم جیسے کسی مصوّر نے بڑی ادا سے رنگوں کو ایک مخصوص زاویے پر لا کر موڑ دیا ہو۔ کہیں بھی تو کچھ کمی نہیں تھی۔ اِک عجب سا نور تھا اس مہ رُخ کے چہرے پر۔

مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں سے اُس کی آنکھوں کے بھیگے کنارے پونچھ ڈالے اُس نے دھیرے سے پھر کہا۔

''آپ میری بات مانیں گے نا حماد۔''

زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا نام مجھے اس قدر مقدس، اس قدر محترم اور اس قدر خوابناک محسوس ہوا کہ پہلی مرتبہ اُس نے میرا نام پکارا تھا۔

''اگر تمھیں اس سے خوشی ملتی ہے تو مَیں تمھاری خاطر یہ بھی کر گزروں گا۔'' میرے منہ سے اپنے آپ اس کے لیے تم نکل گیا۔'' اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ مجھ سے چھڑائے

اور اپنے دوپٹے کے سر پر لگی گانٹھ کھول کر۔ جانے کیا چیز ہتھیلی میں بھر لی، پھر اُس نے ہتھیلی میرے سامنے کی اور کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر وہی دو موتی جگمگا رہے تھے جو مَیں نے نگہت کے ہاتھ اُسے واپس بھجوائے تھے۔

''یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ کی یہی ضد تھی نا کہ مَیں خود انہیں آپ کو واپس کروں۔ آج مَیں نے آپ کی یہ ضد بھی پوری کر دی۔ اب انہیں اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔''

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں پھر چھلک اٹھیں۔ اُس نے جلدی سے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مَیں اس گل اندام کو کیسے سنبھالوں۔۔۔۔ کیا تسلی دوں۔ یہ تو مجھ سے زیادہ گھائل نظر آ رہی تھی۔ مَیں نے دونوں موتی اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں چوما اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

''ایمان۔۔۔ پلیز چُپ ہو جاؤ۔ یہ دو موتی میرے لیے دو جہانوں کی تمام نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی مجھے کیا دے گا۔ سچ کہوں تو آج مجھے اپنی محبت بُری لگ رہی ہے۔ اس نے مجھے تو رونا سکھا ہی دیا تھا۔ آج تمھاری آنکھوں میں بھی آنسو بھر دیے ہیں۔ واقعی۔۔۔۔ بہت بُرا ہوں مَیں۔۔۔۔ اور بہت بُری ہے میری محبت۔''

اُس نے تڑپ کر سر اٹھایا اور اضطراری طور پر میرا ہاتھ پکڑ لیا جیسے میری بات کاٹنا چاہتی ہو۔ مجھے اپنی محبت کو بُرا بولنے سے روکنا چاہتی ہو۔

''ایسے نہ کہیں، اگر کوئی بُرا ہے تو صرف مَیں ہوں۔۔۔۔ اگر کوئی قصوروار ہے تو صرف میں ہوں۔۔۔۔ میں آپ کی محبت کے بدلے کچھ نہیں دے پائی آپ کو۔۔۔۔ آپ نہیں جانتے حماد۔۔۔۔ مَیں کتنی مجبور ہوں۔۔۔۔ کتنی بے بس ہوں۔۔۔۔ ابا نے ساری زندگی کسی خوشی کا منہ نہیں دیکھا۔ میں اور حیا ابھی بہت چھوٹے تھے جب ہمارے بڑے بھیا آناً فاناً بیماری کا شکار ہو کر ہم سب سے منہ موڑ گئے۔ ابا ان کا غم ابھی تک دل سے نہیں نکال پائے۔ انہوں نے مجھے اور حیا کو دنیا کی ہر وہ نعمت لا کر دی جس کی کوئی اولاد خواہش کر سکتی ہے۔ خود پیوند لگے کپڑے پہنتے رہے لیکن ہمیں کبھی کسی سخت وقت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ بھیا کے بعد انہوں نے اپنی ساری توقعات مجھ سے وابستہ کر لی تھیں۔ تبھی انہوں نے گھر پر ہی

مجھے دنیاوی اور دین کی ہر تعلیم سے آراستہ کیا۔ وہ مجھے ساری دنیا سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نئی کتابیں لا کر دیتے ہیں۔ مجھ سے مسائل پر بحث کرنے میں انہیں سب سے زیادہ مزہ آتا ہے۔ میں ہی ان کا سارا جہاں ہوں۔ میں ہی ان کا دن ہوں۔۔۔۔ میں ہی ان کی رات ہوں میرے سفید دامن پر ایک دھبہ ان کی جان لے لے گا۔ وہ آپ کی طوفانی محبت سے بہت گھبرا گئے تھے۔ تبھی انہوں نے عجلت میں میرا رشتہ بھی طے کر دیا ورنہ وہ ابھی مجھے مزید پڑھانا چاہتے تھے۔ میرا بی۔ اے کا داخلہ بھی بھیجا جا چکا تھا۔ لیکن آپ کی دیوانگی، آپ کے جنون کے آگے سب بہہ گیا۔''

میں چپ چاپ خاموش بُت بنا اس سنگِ مرمر کے حسین مجسمے کے لبوں سے لفظوں کے موتی گرتا دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم بھی میری محبت، میرے عشق، میری دیوانگی، میرے جنون کو غلط سمجھتی ہو۔''

میرے ہاتھ پر ایمان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ مجھے لگا وہ میرے ہاتھوں کو تھام کر آج میری روح ہی کھینچ لے گی۔۔۔۔ ''شروع میں جب آپ نے نگہت کے ذریعے مجھے اس حویلی میں بات کرنے کے لیے بلایا تھا تب مجھے واقعی بہت بُرا لگا تھا۔ مَیں بھی ابا کی طرح ایسی باتوں کو نہایت بُرا سمجھتی تھی۔ مجھے بھی اُس وقت آپ کی وہ سب کوششیں کسی امیرزادے کا اپنا دل بہلانے کی ترکیب ہی لگیں۔ پھر جب ایک دن آپ کے گھر والوں نے ابا کے ساتھ بُرا سلوک کیا تو مَیں بہت روئی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کے قصور کی سزا ہمیں کیوں سنا دی۔ پھر نگہت سے پتہ چلا کہ آپ نے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اس وقت مَیں نے اسے آپ کا ایک جذباتی فیصلہ سمجھا تھا اور یہی سوچتی تھی کہ دو چار دن میں آپ گھر واپس آ جائیں گے۔ لیکن پھر مَیں نے ابا کو دوبارہ بہت پریشان دیکھا۔ جس دن آپ ہمارے گھر میرا رشتہ مانگنے آئے تھے اس دن کے بعد سے میں نے آج تک ابا کو کبھی چین کی نیند سوتے نہیں دیکھا۔ ساری ساری رات ٹہلتے رہتے تھے۔ میری اماں ایک سیدھی سادھی سی عورت ہیں جو صرف رو کر ہی اپنے شوہر کا دکھ بانٹ سکتی ہیں۔ پھر عبداللہ نے بتایا کہ آپ نے ابا کی مسجد میں آنا شروع کر دیا ہے۔ جانے کیوں۔۔۔۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی عبداللہ نے تب بھی اور نہ ہی آج تک آپ کے بارے میں کوئی سخت لفظ استعمال کیے

ہیں۔۔۔۔ میرا دل اس بات کو نہیں مانتا تھا کہ کسی اجنبی کے لیے، جس سے آپ کی زندگی بھر میں دو ملاقاتیں بھی نہ ہوئی ہوں، اس کے لیے کوئی اس طرح دُنیا تیاگ سکتا ہے۔

لیکن پھر وہ ہو کر ہی رہا جسے میرا دل اس دن تک جھٹلاتا رہا تھا، اس دن آپ کو ریلوے اسٹیشن پر مزدور کے حلیے میں دیکھ کر ایک ہی لمحے میں میری ساری زندگی کا فخر، میری ساری زندگی کا غرور، میرے سب مان، پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو گئے۔ آپ کی محبت کسی بے لگام آندھی کی طرح آئی اور ایک ہی جھٹکے میں میرے دل کے برسوں سے بند کواڑ توڑ کر اندر براجمان ہو گئی۔ میں کچھ بھی تو نہیں کر پائی۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ یہ محبت تو اس دن سے کہیں نہ کہیں میرے دل میں ہی پل رہی تھی جس دن آپ نے یہیں اس حویلی کی لائبریری میں میرا رستہ روکا تھا۔ لیکن تب شاید میں اس جذبے سے اس قدر ناواقف تھی کہ اُسے پہچان نہیں پائی۔ لیکن اس دن اسٹیشن پر آپ نے مجھے مار ڈالا۔ تب سے اب تک مجھے ایک پل بھی قرار نہیں آیا۔ میری ہر وقت یہی سوچتی ہوں کہ یہ کیسا جذبہ ہے جو پل میں شہنشاہ کو فقیر اور فقیر کو شہنشاہ بنا دیتا ہے۔ یہ کیسا درد ہے جو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ دل کو چیرتا رہتا ہے۔ کتنا بے بس کر دیا ہے اس جذبے نے مجھے۔۔۔۔ کتنا مجبور۔"

میں حیرت سے گنگ اس مہتاب کو سنتا رہا، اس کی پلکوں سے گرتے موتی چنتا رہا۔ وہ اس وقت مجھے پریوں کی کوئی شہزادی معلوم ہو رہی تھی جس کی باتیں میرے لیے کسی الف لیلوی داستان سے کم نہیں تھیں۔ ان چند لمحوں نے ہی میری بے توقیر محبت کو کس قدر معتبر بنا دیا تھا۔ میری اس لاحاصل جدوجہد کو کتنا عظیم اور کتنا معنی خیز بنا دیا تھا۔ وہ بولتی رہی۔

"اور پھر رہی سہی کسر اس دن آپ کے اُن دو اشعار نے پوری کر دی۔ میں نے سوچتا تھا کہ میں آپ کو زندگی بھر کبھی اپنی حالت کی خبر نہ ہونے دوں گی۔ کبھی آپ سے نہیں ملوں گی کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔۔ اس دن ان دو لائنوں نے میرا اندر بالکل پلٹ دیا۔ وہ شعر پڑھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس شخص کو بنا کچھ کہے چلے جانا اس کی اس لازوال محبت کی توہین ہوگی۔ شاید مجھے اسی طرح آپ سے ملنا تھا، چاہے پہلی اور آخری مرتبہ ہی سہی۔"

باہر زور سے بجلی کڑکی، ایک لمحے کے لیے کمرے میں اتنی روشنی ہوگئی کہ میں نے اس

کے لرزتے لبوں پر جمی شبنم کے قطرے بھی دیکھ لیے۔ اُس نے بتایا کہ نگہت سے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کا فون نمبر معلوم کروانے کے بعد انہیں آج موقع ملا تھا کہ وہ حیا کے ذریعے پڑوس کے ماسٹر صاحب کے گھر سے فون کروا سکے کیونکہ مولوی صاحب دو دن کے لیے شہر سے باہر کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے۔ ایمان نے بتایا کہ یہاں تک پہنچنے میں اُسے کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے یہ صرف وہ ہی جانتی ہے اور اگر ایسے میں حیا اور نگہت اس کی مدد نہ کرتیں تو اس کا مجھ سے یوں ملنا ناممکن تھا۔

جانے اتنے دنوں میں اس نازک اندام پر کیا کچھ گزر چکی تھی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ اتنی نڈھال ہو چکی تھی کہ بات کرتے ہوئے بھی باقاعدہ اس کی سانس پھول سی جاتی تھی۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا، اک سیدھی سادھی معصوم لڑکی کو میں نے یہ کس پُر خار راستے پر گھسیٹ لیا تھا۔ وہ جس کے کومل قدم پھولوں کی پنکھڑیوں پر پڑیں تب بھی ان کے چھل جانے کا ڈر ہو۔ اسے میں نے کانٹوں پر چلنے پر مجبور کر دیا تھا، محبت کا زہر اس کے رگ و روپ میں سرایت کر چکا تھا۔ ہاں۔۔۔۔ سارا قصور ہی محبت کا تھا۔ مَیں تو خود اُس کی طرح، اس سے کہیں زیادہ بے بس تھا۔ اور پھر قصوروار صرف محبت کو ہی کیوں ٹھہرایا جائے؟۔۔۔۔ اصل قصوروار تو وہ تھا جس نے ہم دونوں کے دلوں میں اس محبت کا بیج بویا، اسے پروان چڑھایا اور اس زہریلی امربیل کو اس قدر تناور کر دیا تھا کہ آج ہم دونوں اس کے زہر سے بے حال تھے۔ جاں لب دم تھے۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ سارا قصور اُسی کا تھا، جو ہم کمزور انسانوں کے دلوں میں یہ جذبہ پروان چڑھا کر پھر صرف تماشا دیکھتا تھا۔

ایمان اب تک سسک رہی تھی۔

"مَیں جانتی ہوں آج مَیں نے اس محبت کا آپ کے سامنے اقرار کر کے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید خدا مجھے اس محبت کے گناہ کے لیے کبھی نہ بخشے کہ محبت جب کسی رشتے کے بنا ہو تو گناہ بن جاتی ہے۔ لیکن میرا خدا یہ بھی جانتا ہے کہ آپ سے ملے بنا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں آپ کو اپنے لیے یوں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج کے بعد میری ساری زندگی اپنے اس گناہ کی معافی مانگنے میں ہی گزرے گی۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ اپنے آپ کو میری اس محبت کی وجہ سے مزید نہیں جلائیں گے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔

لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ میری اس پہلی اور آخری کوشش کو لاحاصل نہیں جانے دیں گے۔ مَیں چاہتی ہوں کہ آئندہ جب کبھی زندگی میں آپ کا نام کسی حوالے سے سامنے آئے تو اس کے ساتھ یہ جوگ کی، یہ خود کو جلا کر راکھ کر دینے والی باتیں نہ ہوں۔ مَیں اپنی خوشی کے لیے آپ سے آپ کی خوشی مانگنے آئی ہوں۔''

مَیں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے میری جان مانگی ہوتی جس پر کم از کم میرا اختیار تو ہے، مجھ سے وہ نہ مانگو جو خود میرے بس میں نہیں ہے۔''

''کیوں۔۔۔۔ کیا زندگی اس ایک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جا سکتی؟ کیا چند سالوں کا یہ محدود سفر صرف اسی ایک ملاقات کی یاد میں بسر نہیں ہو سکتا؟۔۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے۔۔۔۔ مَیں یہاں نہیں تو نہ سہی۔۔۔۔ پر وہاں اگلے جہاں مَیں ضرور آپ کے ساتھ ہوں گی۔۔۔۔ بس اتنا سا وعدہ نہیں دے سکتے مجھے آپ۔''

اس کی باتوں نے اس نازک سی گل رُخ کے اعتماد اور یقین نے مجھے لاجواب سا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس کرب سے گزر رہی ہے، وہ بے چاری تو اتنی بے بس ہے کہ گناہ کے احساس کی وجہ سے اپنی محبت کا اظہار بھی کھل کر نہیں کر پائی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ان لمحوں میں مجھے گناہ و ثواب اور سزا و جزا کے اس تصور سے ہی شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ مجھے پھر ایسا لگا کہ جیسے مذہب میری محبت پر ایک مرتبہ پھر ڈاکا مار رہا ہو۔

باہر کی تیز بارش، چھت پر گرنے والی بوندوں کی مسلسل ٹپ ٹپ اور اندر بڑھتے اندھیرے میں جلتی شمعوں کے لرزتے سائے۔ ایسے میں اس پری رُخ کا ساتھ، وہ ویسے ہی کانپتی ہوئی بے چین اور بے کل سی گھٹنے جوڑے بیٹھی تھی۔ اس کی وہ شریر لٹ گیلی ہو کر پھر سے لٹک کر اس کے رُخسار چومنے لگی تھی۔ مَیں بے خودی میں اپنا ہاتھ روک نہیں سکا اور میں نے اپنی انگلیوں سے اس کی لٹ کو رخسار سے ہٹا کر ماتھے پر پرے کر دیا۔ اُس نے ایک دم گھبرا کر مجھے دیکھا اور شرم سے دوہری ہو گئی اور پھر جیسے ہی اس کی نظر دیوار پر لگے قدیم گھڑیال پر پڑی تو ایک دم بوکھلا کر وہ کھڑی ہو گئی۔

''اُف۔۔۔ اتنی دیر ہو گئی۔۔۔۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں چلا۔۔۔۔ اندھیرا ہونے کو ہے۔

اماں گھر میں کتنی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ہم لوگ کبھی گھر سے اتنی دیر تک باہر نہیں رہے۔ اب مجھے جانا ہوگا۔''

میرا دل جیسے کسی نے آری سے کاٹ کر رکھ دیا ہو۔ تو اس خواب کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ ایمان جا رہی تھی۔ مَیں نے اس سے کچھ دیر اور رکنے کی التجا کی۔ جواب میں بے بسی سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں رک سکتی تھی۔

کاش قدرت ہمیں وقت کو اپنی مرضی سے روکنے کا کوئی کلیہ بھی بتا دیتی۔ تو میں آج سات زمین اور آسمان کے خزانے دے کر بھی بدلے میں صرف چند پل اور سمیٹ لیتا۔ اتنے میں باہر کسی کے چلنے کی دستک ہوئی اور پھر کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ ایمان نے جلدی سے اپنی کالی شال سنبھالی۔ دروازے سے نگہت اور حیاء کا چہرہ پل بھر کے لیے جھلک دکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ بھی ہمیں اسی قاتل وقت کے گزر جانے کا احساس دلانے کے لیے آئی تھیں۔ ایمان نے بے چینی سے میری طرف دیکھا۔

''مجھے آپ کے وعدے کا انتظار ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

مَیں نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔

''گھر سے نکلتے وقت مَیں نے بھی اپنے آپ سے اور اپنے گھر والوں سے چند وعدے کیے تھے۔ مجھے ان کا بھرم بھی رکھنا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کوئی میری محبت کی سچائی کو طعنہ دے۔ لیکن تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ تم جو چاہتی ہو۔ ویسا ہی ہوگا۔ بس مجھے کچھ وقت دے دو۔ کہیں مَیں اپنی نظروں میں ہی نہ گر جاؤں''۔۔۔۔ ایمان نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔''خدانخواستہ۔۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

اس کے چہرے پر اب سکون کی پرچھائیں تھیں۔

''مَیں جانتی ہوں، آپ میرا مان کبھی نہیں توڑیں گے۔''

وہ جانے کے لیے پلٹی، میرا دل چاہا کہ دوڑ کر اُسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لوں۔ ہمیشہ کے لیے، اور اُسے یہاں سے کبھی واپس نہ جانے دوں۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ سخت ضبط کے باوجود اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں آنسو بھر ہی آئے تھے۔ ایک لمحے کو ہماری نظر ملی۔ اور وہ پلٹ کر باہر چلی گئی۔ میں بے چین

ہوکراس کے پیچھے لپکا، برآمدے میں نگہت اور حیا اُسے لینے کے لیے کھڑی تھیں، ایمان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ دونوں بھی خود پر قابو نہیں رکھ پائیں اور وہ دونوں بھی بس رو پڑنے کے قریب تھیں۔ مجھ دیکھ کر دونوں نے جلدی سے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ حیا میرے بالکل سامنے ہی ایمان کے ساتھ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس اجنبی اور انجانی سی لڑکی نے مجھ غیر کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ آج میری ایمان کو میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ میرا ہاتھ بے اختیار اس کے جھکے سر کی طرف اُٹھ گیا۔ اپنے سر پر میرے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے اس نے چونک کر نظریں اُٹھائیں اور پھر مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھے دیکھ کر اس کا دل چھلک اُٹھا اور وہ بے اختیار پھوٹ کر رو پڑی۔ مَیں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگا کر اُسے تھپکا۔ شاید آج ساری کائنات ہی رو رہی تھی۔ برآمدے سے باہر آسمان آنسو بہا رہا تھا اور یہاں برآمدے میں نگہت اور حیا کی آنکھیں چھلک چھلک کر مینہ برسا رہی تھیں۔ باہر تانگے والے کا بگل بجا، حیا اور ایمان جلدی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئیں۔ ایمان جاتے جاتے پلٹ پلٹ کر میری طرف دیکھتی رہی۔ اس لمحے شائید اُسے اپنی بڑی سی کالی شال بھی سنبھالنے کا دھیان نہیں تھا۔ اس کا مہتاب سا چہرہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ لکڑی کے پھاٹک پر آخری دفعہ میری کالی قسمت کے سیاہ آسماں پر چمکا اور پھر ہمیشہ کے لیے بادلوں کی اوٹ میں غائب ہوگیا۔ مَیں وہیں گھٹنوں کے بل برآمدے میں ہی بیٹھ گیا۔ میرا دل اتنی زور سے چیخنے کو چاہ رہا تھا کہ جس سے آسمان وزمیں پھٹ جائیں۔

OO

اُس دن ایمان کے چلے جانے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ عشق میں پا لینے کی کسک تو اس کسک اور تڑپ سے کہیں زیادہ بڑھ کر اور کہیں زیادہ سوا ہوتی ہے جو عشق میں نہ پانے کی صورت میں مجھے ہو رہی تھی۔ مجھے کسی کروٹ بھی تو چین نہیں تھا۔ سچ ہے جنون میں وصل جدائی سے زیادہ زہریلا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے مل کر میرے سینے کی آگ بجھنے کی بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھتی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ جیسے یہ آگ سب کچھ جلا کر راکھ ہی کر دے گی۔

مَیں نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ میں اپنوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ لیکن کیسے

۔۔۔؟ اس کے بارے میں، مَیں نے ابھی تک نہیں سوچا تھا۔ کبھی سوچتا تھا نگہت کے ذریعے اسے ایک جھوٹا پیغام بھجوا کر کہ مَیں گھر واپس چلا گیا ہوں، ہمیشہ کے لیے یہ شہر ہی چھوڑ دوں۔ اس کی تسلی اور تصدیق کا ذریعہ صرف نگہت ہی تھی اور نگہت میری خاطر یہ جھوٹ بولنے پر بھی تیار ہو ہی جاتی۔ اور پھر شاید یہ ہمارا آخری جھوٹ ہی تو ثابت ہوتا۔ پھر جانے کیوں اس بات پر مجھے خود ہی اپنے آپ پر شرم آ جاتی۔ اس معصوم اور پری صفت لڑکی سے اتنا بڑا جھوٹ، جو صرف میری محبت کی لاج اور بھرم رکھنے کے لیے اپنی ساری زندگی کی کمائی لٹا کر میرے پاس چلی آئی تھی۔ صرف اس بھروسے پر کہ مَیں اس کی بات ضرور رکھوں گا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ جتنا سوچتا تھا اتنا ہی اُلجھتا جاتا تھا۔ وہ اس دن کہہ گئی تھی کہ کیا ساری زندگی بس اِک ملاقات کے سہارے نہیں کاٹی جا سکتی؟ اب مَیں سوچتا تھا کہ ضرور کاٹی جا سکتی ہے۔ پر اس کے لیے مجھ جیسے کم ظرف کے لیے ایک اور شرط کا پورا ہونا بہت ضروری تھا۔ اور وہ یہ کہ مجھ سے اس ایک ملاقات کے بعد ہی میرے ہوش و حواس بھی چھین لیے جاتے۔ اُس سے ملنے کے بعد یہ کم بخت حافظہ ہی تو میرا سب سے بڑا دشمن ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ہفتہ بیت چکا تھا اُس سے ملاقات کیے ہوئے لیکن میری آنکھوں کے سامنے اب بھی ہر پل وہی بیٹھی رہتی تھی۔ میری سانسوں میں اب بھی اُسی کی وہ مانوس سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ میری سماعتوں میں اَب بھی اس کی وہ رُوح کو کھینچ لینے والی ملائم آواز اور چوڑیوں کی کھنک ارتعاش بکھیر رہی تھی۔ میرے لمس کو اب تک اُسی کے جانفزا لمس کی عادت سی پڑی ہوئی تھی۔ یہ کیسی عجیب ملاقات تھی؟ کہ مَیں ان چند گھڑیوں کی ملاقات کے بعد اپنی اس سے پہلی گزاری ہوئی تمام عمر ہی بھول گیا تھا۔ میں اس ملاقات سے پہلے کیا تھا؟ میری پسند ناپسند کیا تھی؟ تمام ذائقے، تمام خوشبوئیں، تمام حسیات جیسے مٹ سی گئی تھیں۔ مجھ سے میرا سایہ تک جیسے چھن گیا تھا۔ بس ایمان اور صرف ایمان ہی باقی رہ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرا وجود اسی دن اس دُنیا میں وارد ہوا تھا جس دن میری ایمان سے وہ آخری ملاقات ہوئی اور شاید اسی دن میں فنا بھی ہو گیا تھا۔

وہ شاید ایمان سے ملے ہوئے نواں دن تھا۔ اکتوبر شروع ہو چکا تھا، سورج اب جلدی ڈوبنے لگا تھا اور ڈوبنے سے پہلے اس کی سنہری دھوپ ہلکی سردی میں بہت بھلی لگتی تھی۔ جیسے

جیسے سردی بڑھتی جا رہی تھی، دھوپ کا سنہرا پن بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے اس کونے پر جہاں سے سورج کو آخری وقت تک سامنے کے پہاڑ کے پیچھے ڈوبتا دیکھا جا سکتا تھا۔ بہت دیر سے بیٹھا اپنے وجود پر دھوپ کے اس سونے کو جذب کر رہا تھا۔ کہ شاکر مجھے ڈھونڈتے ہوئے وہاں آ نکلا، جانے آج کل میں اپنے کسی بھی پُرانے رشتے کو دیکھ کر آج میں ڈر سا کیوں جاتا تھا۔ وسوسے دل میں گھر کرنے لگتے تھے۔ شاکر زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ وہ نگہت کا رقعہ مجھے دینے آیا تھا۔ میرے گھر والوں کے بارے میں اُس نے بتایا کہ امی اب مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہیں۔ کمشنر صاحب سے ان کی اس موضوع پر کئی مرتبہ بحث ہو چکی ہے۔ وہ سب یہ بھی جان گئے ہیں کہ میں کراچی یا اسلام آباد اپنے کسی دوست کی طرف نہیں ہوں، نہ مَیں لندن کامران کے پاس گیا تھا بلکہ میں یہیں اسی شہر میں کہیں رہ رہا ہوں۔ شاید آتے جاتے کسی جاننے والے کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہو۔ لیکن میرے گھر والے اس ریلوے اسٹیشن کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے شہر کے فائیو اسٹار ہوٹلز یا بڑے گیسٹ ہاؤسز میں ہی تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی۔

شاکر اُٹھتے ہوئے بولا۔

''حماد بابا۔۔۔ آپ نے پورے گھر کو، اس پورے زمانے کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ آپ کے جذبے سے زیادہ بڑھ کر اس دنیا میں اور کچھ نہیں ہے۔ آپ نے زمانے کو اپنی ٹھوکر میں لا ڈالا ہے۔ اب میری صرف اتنی التجا ہے کہ اگر گھر والے آپ کو واپس بلانا چاہیں تو انکار مت کیجئے گا۔ نگہت آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ اس کی رخصتی بھی طے کر دی ہے اگلے مہینے۔ ہو سکے تو اس سے ملنے کے لیے ایک چکر لگا لیجئے گا۔ چلتا ہوں۔''

شاکر مجھے گلے لگا کر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے نگہت کا بھیجا ہوا لفافہ کھولا، لگتا تھا نگہت نے بہت کرب کے عالم میں یہ خط لکھا تھا، ہر ہر لفظ سے درد ٹپک رہا تھا۔

''بھیا۔۔۔ مَیں جانتی تھی کہ آپ کے جذبوں کے سامنے کوئی نہیں ٹِک پائے گا، بہت طاقت ہے آپ کی محبت میں، آپ کے جنون میں۔ آپ کی محبت نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا، ایمان جیسی لڑکی نے بھی آپ کے جذبے کے آگے سر جھکا ہی دیا، مجھے آپ پر ہمیشہ سے

فخر تھا، اور ہمیشہ رہے گا، لیکن وہ بہت نازک بہت معصوم سی لڑکی ہے۔ آپ اُس کے لیے دُعا ضرور کیجئے گا، کیونکہ مَیں جانتی ہوں کہ آپ کی دُعائیں رد نہیں ہوتیں۔ جس دن سے وہ آپ سے مل کر گئی ہے، اس کی حالت بہت خراب ہے۔ دن رات بخار میں تپ رہی ہے۔ اس کی اماں کہتی ہیں کہ بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اُسے سردی لگ گئی ہے۔ لیکن مَیں جانتی ہوں کہ یہ اس جذبے کی شدت ہے جو آپ کی محبت نے اس کے دل میں جگایا ہے۔۔۔ پہلی مرتبہ۔۔۔ کیونکہ وہ ایسے کسی بھی جذبے سے ہمیشہ انجان رہی ہے۔ میں آپ کو نہیں بتانا چاہتی تھی کیونکہ ایمان نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ لیکن حیا کے کہنے پر آپ سے دُعا کی التجا کرتی ہوں۔ خدا کرے کہ میری ساری خوشیاں آپ کو اور آپ کے سارے غم خدا مجھے دے دے۔''

یہ بہنیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں وہ یہ نہیں جانتیں کہ ہم سب کو اپنے اپنے حصے کا عذاب کسی نہ کسی صورت بھگت کر ہی یہاں سے جانا ہے۔ مَیں نگہت کا خط پڑھ کر بے حد فکر مند ہو گیا۔ حیا مجھ سے دُعا کی اُمید کیے بیٹھی تھی۔ وہ پگلی اتنا بھی نہیں سمجھتی تھی کہ اگر میری دُعاؤں میں اتنا ہی اثر ہوتا تو آج ایمان میری نہ ہوتی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح سے میرے پر لگ جائیں اور مَیں اُڑ کر ایمان کے پاس جا پہنچوں۔

مجھے خود پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہی تو ہو رہا تھا۔ میں نے ہی اس نازک سی لڑکی کی رگوں میں عشق کا یہ نیلگوں زہر اُتارا تھا اور لوگ مجھ سے ہی اس کے تریاق کی اُمید بھی کر رہے تھے۔ سچ ہے کہ محبت ایک نرم گلابی موسم کی طرح جسم پر اُترتی ہے لیکن رفتہ رفتہ یہی گلابی موسم ایک دہکتی آگ میں بدل جاتا ہے۔ آس پاس نیلی تتلیاں جھلس کر مر جاتی ہیں۔ سب پھول ساری پنکھڑیاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔

اور پھر اس نازنین کے کومل وجود کو جلانے کے لیے تو مذہب کی کڑی دھوپ ہی کافی تھی۔ ایک نامحرم سے بات کرنے کا احساسِ جرم ہی اس کو ساری زندگی تڑپانے کے لیے بہت تھا۔ ایسے میں اگر محبت کی آگ بھی اس تپش کو دو آتشہ کرنے کے لیے موجود ہو تو پھر اس

کی تڑپ کا اندازہ میں خوب کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا وجود اسی مذہب اور محبت کی جنگ کے بیچ جھلس رہا تھا۔ مذہب اسے مولوی علیم کی طرف کھینچ رہا تھا اور محبت اُسے میری طرف دھکیل رہی تھی۔ اور اس کھینچا تانی میں وہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ اس کا نازک بدن کٹ رہا تھا۔ روح تقسیم ہو رہی تھی۔ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مذہب ایسی محبت کے خلاف کیوں ہے؟ اور اگر ایسی محبت جرم ہے تو یہ جرم اپنے ساتھ احساسِ ندامت، خوف اور افسوس کی بجائے خوشی و مسرّت کیوں لے کر آتا ہے؟ کیوں یہ جرم بار بار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر گناہ کے بعد انسان کو چند لمحے کے لیے ہی کیوں نہ سہی، پرتاسف ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ محبت کیسا گناہ ہے جو ہر روز گزرنے کے ساتھ ساتھ اور نیا اور حسین ہوتا جاتا ہے۔ یہ کیسا گناہ ہے جو دل کو مُردہ کرنے کی بجائے ہر لمحہ اس میں نئی روح پھونک رہا ہوتا ہے۔ تو پھر کیا میں سمجھ لوں کہ مذہب کا محبت کے بارے میں یہ کلیہ ہی ہمیشہ سے غلط تھا اور غلط ہے؟ مذہب اگر انسانوں سے، رشتوں سے، جانداروں سے، حتیٰ کہ پھول پودوں اور نباتات و جمادات سے بھی محبت کرنے کا درس دیتا ہے تو پھر اس محبت کو غلط کیوں کہتا ہے۔ کیوں ایسی محبت کو بھی گناہ سمجھتا ہے جس میں سوائے ایک دوسرے کو دیکھنے اور بات کرنے کے اور کوئی مادی چاہ نہ ہو۔ پاک محبت بھی گناہ کے زمرے میں کیوں آتی ہے۔ صرف اس اندیشے کی بنیاد پر کہ آگے چل کر مواقع ملنے پر اور تنہائی میسر آنے پر یہ محبت بھی سفلی جذبات میں ڈھل جائے گی، اور اگر ایسا نہ ہو۔۔۔ اگر جسم کا حصول ہی اس محبت کی ترجیحات میں کبھی شامل بھی نہ رہا ہو تب کیا ایسی محبت مذہب کے لیے قابل قبول ہو جاتی ہوگی۔۔۔؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں۔۔۔؟

مذہب کو تو صرف محبت سے پیدا ہونے والے گناہ کے جذبے سے روکنا چاہیے۔ محبت سے نہیں۔ میں تو مذہب کے اس فلسفے کو سمجھنے سے ہی قاصر تھا۔ میں تو اسی محبت کے وسیلے سے مذہب کے قریب ہوا تھا۔ اور اب جب کہ یہی مذہب مجھے محبت کرنے سے روک رہا تھا تو میں خود بخود اس مذہب سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ بلکہ میں ایمان کی اس حالت کا ذمہ دار بھی براہِ راست اس مذہب کو ہی سمجھتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں مولوی علیم کے قدموں میں جا کر بیٹھ جاؤں۔ ان کے پاؤں پکڑ لوں کہ ہمارے درمیان یہ مذہب کی دیوار کھڑی نہ کریں۔

ہم دونوں کو مذہب کی ان زنجیروں سے نکال کر محبت کے حوالے کر دیں۔ ہمارا فیصلہ مذہب کو نہیں، بلکہ محبت کر کرنے دیں۔

لیکن میں کس قدر بے بس تھا، سوائے ان خیالات کی یلغار کے، میرے پاس لڑنے کے لیے اور کوئی دوسرا میدان بھی تو نہیں بچا تھا۔ دن تھے کہ بیتے جا رہے تھے، ایمان کی رخصتی سر پر آ چکی تھی۔ بس دو دن ہی تو رہ گئے تھے میری سانسوں کو میری روح سے جُدا ہونے میں۔ اگر ایمان مجھے مولوی صاحب کے سامنے گڑگڑانے کی اجازت دے جاتی تو میں اسی مسجد کے سامنے خود کو سولی پر لٹکانے کے لیے بھی تیار تھا۔ کیا تب بھی ان کا دل موم نہ ہوتا۔۔۔؟

لیکن وہ ستم گر تو مجھے مزید باندھ کر چلی گئی تھی۔ اُس نے اپنے اُجلے دامن کی حرمت اور اپنے سفید پوش باپ کی مجبوریوں کا ذکر کر کے میرے جنون کو جیسے زنجیروں میں ہی تو جکڑ دیا تھا۔ ورنہ شاید میں اس کی بیماری کا سن کر باقاعدہ کشکول لے کر مولوی صاحب کے دروازے پر ہی جا بیٹھتا۔ اور تب تک ان کی چوکھٹ پر سر پٹختا رہتا جب تک وہ خود آ کر میرے لہولہان سر کو تھام نہ لیتے۔۔۔ لیکن افسوس، میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔



وہ ایسی ہی اِک اُداس اکتوبر کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی۔ آسمان پر شفق کی سُرخی میرے ارمانوں کے خون کی طرح بکھری ہوئی تھی، ہوا سرد تھی، خزاں نے پلیٹ فارم پر بھی ڈیرہ جما لیا تھا۔ شہتوت کے پتے پہلے زرد اور پھر سُرخ ہو کر خشک ٹہنیوں سے کٹی پتنگوں کی طرح گر رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ پلیٹ فارم پر کسی نے زردی مائل سُرخ پتیوں کی کوئی چادر سی بچھا دی ہو۔ میں اسی چادر پر رکھے اپنے مخصوص بینچ پر لیمپ پوسٹ کے نیچے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کل ایمان کے ہاتھوں میں عبداللہ کے نام کی مہندی رچ جائے گی اور پرسوں اُسے گھر سے اس جاتی بہار کی طرح رخصت کر دیا جائے گا۔ نگہت نے مجھے بتایا تھا کہ شادی کے بعد مولوی صاحب نے انہیں مچھ اپنی بہن کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی سلسلے میں وہ عبداللہ کے لیے وہاں کسی چھوٹے موٹے کام کا بندوبست بھی کر آئے تھے۔ مچھ میں کوئلے کی بہت سی کانیں بھی تھیں۔ انہی کانوں کے آس پاس چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آباد

تھیں جن میں ان کوئلہ کانوں کے کان کن رہتے تھے۔ ایسی ہی کسی ایک بستی کی مسجد کی امامت کے لیے انہوں نے عبداللہ کا نام منظور کروالیا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہورہا تھا کہ مولوی علیم نے یہ قدم بھی صرف اور صرف میری وجہ سے ہی اُٹھایا تھا۔ ورنہ وہ ایمان کی جدائی کہاں برداشت کرسکتے تھے۔ نگہت نے تو یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ ایمان کی رخصتی کے بعد مولوی صاحب بھی زیادہ عرصہ کوئٹہ میں نہیں ٹکیں گے اور اندر ہی اندر انہوں نے خود بھی بیوی اور حیا سمیت یہاں سے کچھ منتقل ہونے کا پورا پروگرام بنا رکھا ہے۔ میرے ذہن میں پھر نفرت کے سانپ نے پھن پھیلائے۔ مذہب میری محبت کو قتل کرنے کے بعد اس کی میّت بھی یہاں دفن نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اُسے بھی مجھ سے دُور لے جانا چاہتا ہے۔

پھر مجھے عبداللہ کا خیال آیا۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ، اُسے ایمان ملنے والی تھی۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جنھیں ان کی محبت مل جاتی ہے۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ اس وقت ایسے لوگوں کی، ان کے دل کی، کیسی حالت ہوتی ہوگی جب وہ اپنی محبت کے اتنے قریب ہوتے ہوں گے۔ ان کے دل خوشی سے پھٹ کیوں نہیں جاتے اس لمحے۔۔۔؟۔ مَیں اگر عبداللہ کی جگہ ہوتا تو یقیناً میں اس وصلِ محبت سے پہلے ہی خوشی سے مرجاتا۔

میری عبداللہ کے بارے میں سوچیں اس قدر طاقت ور ہوگئی تھیں کہ مَیں نے اُسے اپنے سامنے ہی پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے، اپنی طرف دور سے بڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔ میں نے سر جھٹک کر اس خیالات کی رو سے نکلنے کی کوشش کی لیکن عبداللہ کا وہ ہیولا اب بھی میرے سامنے ہی بڑھا چلا آرہا تھا مَیں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ یہ تو درحقیقت عبداللہ ہی تھا جو ان زرد اور سُرخ خشک پتوں کی چادر کو روندتے ہوئے چہرے پر بے انتہا پریشانی لیے میری جانب ہی بڑھا چلا آرہا تھا۔ مجھ سے تو اتنا بھی نہیں ہوسکا کہ دو قدم چل کر مَیں خود اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا۔ بس ساکت کھڑا اُسے اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ عبداللہ میرے قریب آگیا، اُس نے اپنی بکھری سانسوں کو سمیٹنے کی کوشش کیے بنا ہی براہِ راست مجھے کہا۔

''آپ کو ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

مَیں نے بوکھلا کر اُس کی طرف دیکھا۔

''ساتھ چلنا ہوگا لیکن کہاں۔''

''ہمارے گھر، زیادہ سوال نہ کیجئے گا، بس چلنے کی کریں۔''

اس وقت عبداللہ کی حالت ایسی تھی کہ مَیں واقعی کوئی دوسرا سوال نہ کرسکا۔ عبداللہ پلٹا اور مَیں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کے تمام لیمپ پوسٹ اور گیس کے ہنڈولے جل چکے تھے۔ لیکن اکتوبر کے آخری دنوں کی شدید دُھند اور کہرے بادلوں نے سارے ماحول کو اس طرح سے لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ وہ سب روشنیاں صرف ٹمٹماتی بتیاں اور دھیمے چراغ دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے گہرے سفید بادلوں میں کسی نے بہت سے جگنو چھوڑ دیے ہوں۔

مَیں اور عبداللہ اسی کہرے اور دھند کے بادل میں جیسے رستہ بناتے ہوئے اسٹیشن کی مرکزی عمارت سے باہر نکلے، باہر سڑک بھی سنسان اور دُھند میں لپٹی پڑی تھی۔ جیسے کوئی سانولی بیوہ سفید ساڑھی لپٹے ابھی ابھی بَین کر کے لیٹی ہو، میں اور عبداللہ اس کہرے میں مایوس سے کھڑے آس پاس کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑاتے رہے۔ عبداللہ کی حالت بالکل ایسی تھی جیسی جل بن مچھلی کی ہوتی ہے۔ وہ بار بار بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا جیسے وقت اس کے ہاتھ سے پھسلا جارہا ہو۔ جانے اُسے کس بات کی اتنی جلدی تھی۔ اتنے میں خیرو کسی رحمت کے فرشتے کی طرح کسی سواری کو چھوڑ کر واپس آتا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے اُسے آواز دی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے ہم خیرو کے سبک تانگے میں پُرانے محلے کی طرف روانہ تھے۔ لیکن راستے کی شدید دھند اور کہرے کی وجہ سے خیرو کا گھوڑا بھی جیسے پھونک پھونک کر فضا میں قدم رکھ رہا تھا۔ خیرو نے احتیاطاً تانگے کے اگلے بانسوں کے ساتھ لگے گیس کے دونوں ہنڈولوں کو بھی جلا دیا تھا تاکہ راستہ کچھ تو واضح نظر آئے لیکن اس سے بھی کچھ خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے گھوڑے کے نتھنوں میں سے بار بار بھاپ کی شکل میں آتی جاتی سانس کا نشان مل رہا تھا۔ ہم اندھیری سڑکوں پر دُور دُور لگے لیمپ پوسٹوں کی کمزور پیلی روشنیوں کے دائرے سے ہوتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں اگر کوئی ہمیں دور سے لٹن روڈ کے دورویہ گھنے درختوں کی قطاروں سے اس بگھی نما تانگے میں اس دھند اور کہرے میں کہیں جاتے دیکھتا تو اُسے ضرور شرلاک ہومز کی فلموں کے ایسے بہت

بالآخر تانگہ پُرانے محلے کے گیٹ سے اندر داخل ہوا، محلّہ سنسان پڑا تھا، مَیں اور عبداللہ جلدی سے تانگے سے نیچے اُترے۔ عبداللہ تیزی سے گھر کی طرف بڑھا۔ مَیں دفعتاً ٹھٹک کر رک گیا، یہ مَیں کہاں آ گیا تھا، یہ گلی، یہ کوچہ، یہ گھر تو میرے لیے ممنوعہ تھا۔ میرے تو یہاں آنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ مَیں مولوی علیم کی تو کسی پابندی کا کبھی پابند نہیں رہا تھا، لیکن یہ پابندی تو میری زندگی، میری سانسوں کی اس مالک کی لگائی ہوئی تھی۔ جس کا اب میری ہر آتی جاتی سانس پر اختیار تھا۔

عبداللہ کو جب احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ قدم نہیں بڑھا رہا ہوں تو وہ فوراً پلٹا۔

''آپ رُک کیوں گئے، جلدی چلئے۔۔۔''

''میں۔۔۔ میں تمھارے اندر نہیں آ سکتا، مجھے ایمان نے منع کیا تھا۔''

مَیں نے نا سمجھی میں ایمان کا نام تو لے لیا لیکن پھر ایک دم مجھے احساس ہوا کہ مَیں جلد بازی میں ایمان کے ہونے والے شوہر کے سامنے ایمان کا راز افشاں کر بیٹھا ہوں۔ میں نے گھبرا کر بات پلٹنے کی کوشش کی۔''

''میرا مطلب ہے کہ مولوی صاحب۔۔۔ انہیں میرا یہاں آنا۔۔۔'' عبداللہ نے غور سے میری طرف دیکھا اُس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''انہیں شاید اب اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، آپ اندر آئیں، وقت زیادہ نہیں ہے۔''

مَیں پھر بھی اپنی جگہ جما رہا، مَیں ایمان سے کیا وعدہ نہیں توڑ سکتا تھا۔

''لیکن ایمان۔۔۔''

''میں ایمان ہی کے کہنے پر آپ کو اسٹیشن لینے کے لیے آیا تھا، آئیے۔۔۔ وہ آپ ہی کا انتظار کر رہی ہے۔''

عبداللہ مجھے گم صم اور سکتے میں چھوڑ کر دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ مجبوراً مجھے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھانا پڑے۔ صحن کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ محلے کی بجلی گئی ہوئی تھی، ایمان کا گھر بھی دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ صحن کا جھولا ہَوا کے زور سے یوں آہستہ آہستہ جھول رہا تھا جیسے ابھی ابھی ایمان یہاں سے اُٹھ کر گئی ہو۔ گھر پر ایک عجیب سا سکوت اور سناٹا طاری

تھا۔ اچانک آہٹ سُن کر اندر سے نگہت برآمد ہوئی۔ مَیں اس وقت نگہت کو یہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ برآمدے کے چھوٹے چھوٹے سے طاقوں میں رکھی شمعیں جھلملا رہی تھیں جن کی ہلکی روشنی میں نگہت کی آنکھوں میں چھپے آنسو صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دھند کو چیرتی ہوئی تیزی سے میری طرف دوڑتی ہوئی آئی اور میرے سینے سے لگ کر سسک سی پڑی۔ مَیں ابھی تک حیران و پریشان سا وہیں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرا ہاتھ تھاما اور برآمدے میں اس حصے کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں زنانہ تھا۔ یہ کیا، عبداللہ مجھے گھر کے زنانے حصے کی طرف کیوں لے کر جا رہا تھا۔ مولوی صاحب نے اگر مجھے اپنے گھر میں یوں آزادی سے چلتے پھرتے دیکھ لیا تو غضب ہی تو ہو جائے گا۔ لیکن عبداللہ مجھے بنا کچھ کہنے کا موقع دیئے زبردستی کھینچتا ہوا اُس کمرے میں لے گیا جو برآمدے کے سرے پر بنا ہوا تھا۔ نگہت بھی میری کہنی سے لپٹی میرے ساتھ ہی کمرے میں چلی آئی۔

کمرے کی ملگجی روشنی میں جس پہلے شخص کے چہرے پر میری نظر پڑی وہ خود مولوی علیم ہی تھے۔ مَیں ٹھٹک کر رک گیا، مولوی علیم کے چہرے پر اِک عجیب بے بسی تھی۔ ایسی بے بسی صرف اس شخص کے چہرے پر ہو سکتی ہے جو ایک لمبی جنگ کے بعد اس وقت ہار گیا ہو جب اسے اپنی جیت کا پورا یقین ہو چکا ہو۔ ان کے ساتھ ہی پیچھے حیا موجود تھی۔ اور ایک پُر نور چہرے والی عورت چادر لپیٹے کمرے کے وسط میں پڑے پلنگ کی پائنتی سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ سب خاموش سے کیوں تھے؟ پھر میری نظر کمرے کے ملگجے اندھیرے نما اُجالے سے جیسے ہی مانوس ہوئی تو مجھے لگا کہ پلنگ پر کوئی لیٹا ہوا ہے جس کے ماتھے پر شائد ٹھنڈی پٹیاں رکھنے کے لیے حیا اور اس کی اماں پلنگ کے دونوں اطراف کی پائنتی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی سلور کا بڑا سا تسلا پڑا تھا جس میں کچھ سفید پٹیاں تیر رہی تھیں۔ ایک دم سے میرے ذہن میں کوئی جھماکا سا ہوا۔ مَیں جیسے نیند کے عالم سے یک لخت جاگ گیا تھا۔ پلنگ پر کوئی اور نہیں ایمان ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے شدید نقاہت سی ٹپک رہی تھی لیکن چہرے کے گرد نور کا گلابی سا ہالہ اب بھی ویسے ہی قائم تھا۔ اس کی سانس رُک رُک کر چل رہی تھی اور وہ آنکھیں موندھے کسی سنو وہائٹ کی طرح کسی لمبی اور گہری نیند میں دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحے کے لیے مولوی علیم کی مجھ سے نظریں ملیں اور پھر انہوں نے نظریں جھکا لیں۔

عبداللہ مجھے یوں دروازے پر ہی سکتے کے عالم میں کھڑے دیکھ کر آہستہ سے کھنکارا اور اس نے نگہت کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا۔ نگہت میرا ہاتھ تھامے کمرے میں داخل ہو گئی اور مَیں کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ آیا۔ عبداللہ ایمان کے پیروں کی جانب بیٹھ گیا اور اُس نے آہستہ سے کہا۔

''ایمان۔۔۔۔آنکھیں کھولو۔۔۔۔دیکھو تم سے ملنے کون آیا ہے۔''

ایمان کی نیند یا بے ہوشی اب بھی نہیں ٹوٹی۔ حیا نے دھیرے سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں، اور جانے اس کے کان میں آہستہ سے کیا کہا۔۔۔۔ایمان کے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور اس نے رفتہ رفتہ اپنی آنکھیں کھولیں۔۔۔۔وہی جان لیوا دو بڑی بڑی کالی آنکھیں۔۔۔۔پھر اس کی نظریں مجھ سے ملیں۔۔۔۔وہی روح کھینچ لینے والی نظر، وہ چند لمحے پلکیں جھپکائے بنا مجھے دیکھتی رہی۔ جیسے میری شبیہہ کو اپنی آنکھوں کے پردے میں جذب کر لینا چاہتی ہو۔ نقاہت اور بیماری نے اُس کے حُسن پر ذرا سا بھی فرق نہیں ڈالا تھا۔ بلکہ آج مجھے وہ تھکا تھکا سا حسن پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی اکھڑی اکھڑی سانسیں بتا رہی تھیں کہ محبت کا قاتل زہر اس کی رگوں میں پوری طرح پھیل چکا ہے۔ اُس محبت نے ایک جیتی جاگتی، ہنستی کھلکھلاتی لڑکی کا کیا حال کر ڈالا تھا۔

یا خدا۔۔۔! یہ کیسا عجیب دن تھا، کیسی کیسی انہونیاں ہونے کو جا رہی تھیں۔ مولوی علیم کی موجودگی میں مَیں ان کی بیمار بیٹی کے کمرے میں موجود تھا۔ ان کا سارا گھرانہ بشمول ان کے ہونے والے داماد کے، سب ہی تو یہاں موجود تھے لیکن آج مولوی علیم کی زبان پر تالا پڑا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں اتنا ارتعاش تھا کہ وہ ٹھیک سے تسبیح بھی نہیں پھیر رہے تھے۔ محبت بھی کیسے کیسے معجزے دکھاتی ہے، اس کا احساس مجھے اس دن مولوی علیم کی خاموشی دیکھ کر ہوا تھا۔

ایمان کے لب ذرا سے ہلے، لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہ آیا۔ مولوی صاحب تڑپ کر آگے بڑھے اور ایمان کے ماتھے پر بوسہ دیا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ ان کی بیوی کی آنکھوں سے زار و قطار ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھڑی بہہ رہی تھی لیکن وہ اتنی خاموشی سے رو رہی تھیں کہ جب تک کوئی انہیں دیکھے نہ اسے پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میری نظریں بس ایمان پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ اور پھر ایک اور معجزہ ہوا، مولوی علیم آگے بڑھے اور میرا ہاتھ خود ہی تھام کر مجھے ایمان کے سرہانے تک لے آئے۔ حیا نے اُٹھ کر میرے کھڑے ہونے کی جگہ خالی کر دی۔ ایمان نے ایک لحظہ مجھے دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر وہی ہلکی سی کائنات کو زندگی بخش دینے والی جانفزا سی مسکراہٹ اُبھری جو اس کے گالوں میں ہلکے سے گڑھے ڈال دیتی تھی۔ اس کی نظر نے ایک لمحے میں ہی میری نظر سے مل کر ساری کائنات کو تسخیر کر لیا، کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ ''محبت فاتح عالم'' اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مَیں کچھ دیر تک اُسے ساکت دیکھتا رہا کہ کب وہ دوبارہ آنکھیں کھولے اور کہیں مجھ سے اس کی کوئی نظر چوک نہ جائے۔ لیکن اس نازنین کی نیند لمبی ہوتی گئی اور پھر مجھے کہیں دُور خلا میں سے مولوی علیم کی آواز آتی سنائی دی۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

کیا۔۔۔۔؟۔۔۔۔کیا آس پاس کسی کی موت ہو گئی ہے جو مولوی صاحب اس وقت بے موقع یہ آیت پڑھ رہے تھے۔ انہیں یوں سکون سے سوئی ہوئی اس شہزادی کے سرہانے ایسا کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ بدشگونی بھی تو ہو سکتی ہے نا۔ مَیں نے غصے اور ناگواری سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو حیا اور نگہت بھی ایک دوسرے سے لپٹی سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ اب انہیں کیا ہو گیا ہے، مَیں نے عبداللہ سے مدد لینے کے لیے اس کی طرف دیکھا کہ اس سے کہوں کہ ان دو بے وقوف لڑکیوں کو ایمان کے سرہانے سے دُور لے جائے۔ ابھی تو وہ نازنین تھک کر ذرا سوئی ہے۔ جانے کب کی جاگی ہوئی تھی۔ اب ان دونوں کا یہ بین ہی کہیں اس کو نہ جگا دے۔۔۔۔لیکن یہ کیا، عبداللہ تو خود گھٹنوں میں منہ چھپائے ہڑک ہڑک کر رو رہا تھا۔ یہی حال ایمان کی اماں کا بھی تھا۔ حیا اور نگہت بجائے اماں کو چپ کروانے کے خود بھی ان کے ساتھ مل کر رو رہی تھیں۔ اماں حیا اور نگہت بار بار بڑھ کر اس کی روشن جبیں کو چوم رہی تھیں۔ اس کی زلفیں سنوار رہی تھیں۔ جانے انہیں اتنا سا بھی احساس کیوں نہیں ہو رہا تھا کہ کسی کی نیند میں یوں خلل نہیں ڈالا کرتے۔ مولوی صاحب اب بھی زور زور سے کچھ آیتیں پڑھ رہے تھے، مَیں آخری اُمید کے طور پر ان کی جانب مڑا کہ شاید وہ ہی ان نادانوں کو کچھ سمجھا پائیں لیکن یہ کیا خود مولوی صاحب کا چہرہ اور داڑھی بہتے آنسوؤں سے تر تھی۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے آنسو چہرے سے صاف کیے اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو

چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ نگہت اور حیا کو گھورا اور ویسے ہی ہونٹوں پر انگلی رکھے انہیں بھی خاموش رہنے کا حکم دیا لیکن میرے اس حکم کا انہوں نے اُلٹا ہی مطلب لیا۔ حیا کی تو ہچکیاں ہی بندھ گئیں روتے روتے اور اس کی اماں کو اس کا وجود سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ نگہت تڑپ کر اٹھی اور میرے پاس آ کر اس نے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''بھیا۔۔۔۔ ایمان ہم سے روٹھ گئی ہے، وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔''

میرے دماغ پر جمی دھند اور برف جیسے پگھلنے سی لگی۔ یہ نگہت کیا کہنا چاہ رہی ہے! یہ سب لوگ کیوں رو رہے ہیں۔ دفعتاً میرے دماغ میں مولوی صاحب کی پڑھی ہوئی آیتوں کی گونج ن بازگشت کی طرح ٹکرائی۔ مَیں ایمان کے سرہانے کی پائنتی پر جھک کر بیٹھ گیا۔ وہ برف کی شہزادی۔ وہ باوقار حسن، وہ نور کا ہالہ اِک چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ آنکھیں موندھے اس کی سانس تھم چکی تھی۔ ہونٹوں پر اَب بھی اک ہلکی سی مسکراہٹ تھی جسے صرف مَیں ہی محسوس کر سکتا تھا کیونکہ اُس کی وہ آخری مسکراہٹ صرف میرے لیے ہی تو تھی۔

مَیں نے اُسے دھیرے سے آواز دی۔

''ایمان۔۔۔۔''

لیکن وہ ساکت ہی رہی، مَیں نے گھبرا کر پیچھے کھڑے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔ ''یہ بول کیوں نہیں رہی مولوی صاحب، اس سے کہیں کہ کوئی تو بات کرے۔ آپ کا کہا یہ کبھی نہیں ٹال سکتی۔ آپ کہیں گے تو ضرور جواب دے گی۔ بہت محبت کرتی ہے یہ آپ سے۔ بڑا احترام ہے آپ کے لیے اس کے دل میں۔''

مولوی صاحب مجھے جواب کیا دیتے البتہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے اور مجھے کھینچ کر انہوں نے اپنے گلے لگا لیا۔ ان کے گلے لگتے ہی جانے آنسوؤں کا وہ کون سا سیلاب تھا جو میری آنکھوں سے اُمڈ پڑا تھا۔ جتنا وہ مجھے تھپکتے جاتے اتنا ہی میری ہچکیاں بندھتی جاتیں۔ دھیرے دھیرے میرے سُن ذہن میں یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ ایمان کی سانس کیوں ساکت ہو گئی تھی، اور وہ ہم سب کی التجاؤں کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں اب بھی اس کی ابدی خاموشی کے لیے وہ لفظ نہیں آ رہے تھے جو کسی ایسے شخص کی کیفیت

کے لیے بولے جاتے ہیں۔ مجھے حیرت تھی کہ آسمان کیوں نہیں پھٹ پڑا، زمیں کی گردش ساکت کیوں نہیں ہو گئی۔ ہم سب جو اس مہ جبیں سے اس قدر محبت کے دعوے دار تھے۔ ہم سب کی سانسیں بھی اسی لمحہ کیوں نہ تھم گئیں جب اس اکھڑتی سانس کا زیر و بم تھما تھا۔ میری آنکھیں تو اس سے پہلی ملاقات کے بعد اُسی کی آنکھوں سے دیکھتی تھیں۔ پھر اب تک ان میں روشنی کیوں تھی؟ میرے لب تو اسی کے لفظ بولتے تھے، پھر اب تک میرے بولنے کی قوت کیوں نہیں چھین لی گئی تھی؟۔۔۔۔ میرے کانوں کو تو صرف اُسی کی آہٹوں اور شہد جیسی میٹھی بولی کا انتظار رہتا تھا۔ پھر میری سماعتیں اسی لمحہ ناکارہ کیوں نہیں ہو گئیں، میرا دل جو اس کے نازک دل کے ساتھ دھڑکنے کا دعوے دار تھا، وہ اس کے دل کی دھڑکن رُکنے کے ساتھ ہی پھٹ کیوں نہیں گیا۔ مَیں تو اس کے سائے کو بھی کسی کو دینے کا روادار نہ تھا، پھر کوئی میرے سامنے اس کے کومل وجود سے رُوح کیسے چھین لے گیا۔

یعنی میرے سارے دعوے ہی جھوٹے نکلے، میرے اندر سے چیخوں کا ایک طوفان اُبل اُبل کر باہر آنے کے لیے تیار تھا لیکن میری مجبوری تو دیکھئے کہ اس ماہ رخ کی حرمت کا خیال مجھے کھل کر ماتم کرنے سے بھی روک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے آنسو بھی خشک ہونے لگے اور اس دن مجھے بنا آنسوؤں کے رونے کا مطلب بھی سمجھ آ گیا۔ مولوی صاحب نے میری ہچکیوں کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے کچھ ہی دیر میں اپنے حواس کا دامن چھوڑنا ہی پڑا۔ بے سدھ ہونے سے پہلے مَیں نے آخری مرتبہ ایمان کی اماں کو اس کا ماتھا چومتے اور چہرے پر چادر ڈالتے دیکھا اور پھر مجھے آس پاس کا کچھ ہوش نہیں رہا۔ مَیں وہیں مولوی صاحب کے گلے لگے لگے ہی ان کی بانہوں میں جھول گیا۔

OO

اُس دن کے بعد شاید جب پہلی مرتبہ میں اپنے حواس میں واپس آیا تو پندرہ دن کا وقفہ بیت چکا تھا۔ مَیں صدیقی صاحب کے گھر میں ہی اُسی کمرے میں ڈرپس اور بازوؤں میں گھسے کینولاز اور سرنجوں سے لدا پھندا اسی بستر پر پڑا تھا۔ بعد میں صدیقی صاحب نے بتایا کہ ریلوے کے ہسپتال میں چھ دن رکھنے کے بعد انہوں نے مجھے اپنے گھر ہی منتقل کروا لیا تھا

کیونکہ ریلوے ہسپتال میں اتنی سہولیات بھی نہیں تھیں اور شہر کے جس پرائیویٹ ڈاکٹر کو انہوں نے میرے علاج کے لیے طلب کیا تھا اس کا اور اس کی پوری ٹیم کا ریلوے ہسپتال میں روز آنا جانا ممکن نہ تھا۔ پہلے چند دن تو میری یادداشت نے ہی میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں حیرت سے ان اجنبی چہروں اور لوگوں کو دیکھتا رہا جو میرے آس پاس آتے جاتے، ٹہلتے، مجھے انجیکشن وغیرہ لگاتے اور میرا بخار چیک کرتے رہتے۔

صدیقی صاحب بتا رہے تھے کہ پھر مجبوراً ڈاکٹرز نے فیصلہ کر ہی لیا کہ مجھے شہر کے بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا جائے کیونکہ بظاہر تو میری حالت ٹھیک ہو رہی تھی لیکن میرے ذہن کا اور میری یادداشت کا میرے جسم کا ساتھ نہ دینا انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ میں بڑے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ دن گزرتے گئے اب میری جسمانی حالت دھیرے دھیرے سدھرنے لگی تھی۔ بخار کا وقفہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نرس اگر دلیہ وغیرہ میرے حلق سے اُتارنے میں ناکام ہو بھی جاتی تو صدیقی صاحب آ کر ضد سے اور پیار سے مجھے کچھ مائع غذا کھلا جاتے۔ شاید اس دماغی بے ہوشی کے عالم میں بھی مَیں صدیقی صاحب کے احسانوں کی کیفیت تلے دبا ہوا تھا۔ اب دھیرے دھیرے مجھے ایک وہیل چیئر پر شام کے وقت ہسپتال کے بڑے سے دالان میں ایک طرف کو بنی چھوٹی سی جھیل تک یا گھاس کے میدان میں ٹہلانے کے لیے بھی لیجایا جانے لگا۔

لیکن میرے دماغ پر جمی دھند کسی طور پر کم نہیں ہو پا رہی تھی۔ شاید یہ میرے ہوش و حواس کی آخری رات کی وہ دھند تھی جو میرے ذہن سے لپٹ کر ہی رہ گئی تھی۔ مَیں چہروں کو دیکھتا اور انہیں پہچاننے کی کوشش بھی کرتا، لیکن سب ایک خواب کے عالم میں ہو رہا تھا۔ شاید ان دنوں میں مولوی علیم، عبداللہ، شاکر، خیرو، غفورا اور جانے کون کون مجھ سے ملنے اور مجھے وہاں دیکھنے آتا ہو گا لیکن میں اُن مانوس چہروں کو بھی اجنبیت سے دیکھتا رہا ہوں گا۔

ڈاکٹروں کی رائے میں میرا دماغ اُن کی دی ہوئی ادویات کی تعمیل نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ میرے جسم نے ان کے علاج کی ہر ممکن تعمیل کی تھی۔ اب ڈاکٹروں کے بقول مجھے مزید ہسپتال میں رہنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے صدیقی صاحب کی درخواست پر مجھے ان کے ساتھ واپس گھر جانے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن ساتھ ہی

ساتھ بے حد احتیاط کی تلقین بھی کی تھی۔

شاید وہ بڑے ہسپتال میں میری آخری شام تھی کیونکہ اگلے دن مجھے صدیقی صاحب واپس اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے والے تھے۔ کہ اچانک ہسپتال کی راہداریوں میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ مَیں اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس وہیل چیئر پر بیٹھا خالی نظروں سے باہر کا منظر تک رہا تھا۔ وہیں سے مَیں نے چند لمحے پہلے دو بڑی مرسڈیز گاڑیاں ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوتی بھی دیکھی تھیں۔ کچھ دیر میں ہی راہداری کا وہ سارا شور میرے دروازے کے قریب آ کر تھم گیا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سب سے پہلے ایک مانوس سی عورت کا چہرہ اندر آتے ہوئے نظر آیا۔ وہ عورت چند لمحے تو سکتے میں گنگ سی کھڑی مجھے دیکھتی رہی اور پھر پتہ نہیں اُسے کیا ہوا، وہ روتے ہوئے دوڑ کر آئی اور میرے گلے لگ گئی۔ اس عورت کے پیچھے ہی ایک پکی عمر کا باوقار سا مرد جس نے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا اور دو اور لڑکے بھی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے چھوٹا لڑکا جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال ہی کم ہو گا اس عورت کی طرح رونے لگا اور کبھی میرے چہرے اور کبھی میرے بالوں کو چھونے لگا۔ مجھے بڑی اُلجھن محسوس ہوئی۔ پھر نہ جانے ڈاکٹر نے اندر آ کر اس عورت سے کیا سرگوشی کی اور اس باوقار مرد سے کیا کہا کہ وہ ٹوٹے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا اور اس عورت کو پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اُسے چپ رہنے کو کہا۔ وہ سب لوگ رات دیر تک میرے ہی کمرے میں موجود رہے۔ پھر مجھے نیند آنے لگی تو نرس نے ہیلپر کی مدد سے مجھے بستر تک پہنچا دیا۔ سونے سے پہلے ایک عجیب سی بات ہوئی، اس باوقار مرد نے آگے بڑھ کر میرے گال پر زور سے تھپکی دی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے بہت پہلے بچپن میں بھی جب مَیں سونے لگتا تھا تو کوئی جاتے جاتے میرے گال کو اسی طرح تھپک کر جاتا تھا۔

اگلے دن سو کر اُٹھا تو میرے جانے کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ وہ سب لوگ جو کل میرے کمرے میں گھس آئے تھے وہ بھی وہیں موجود تھے لیکن وہ عورت اور وہ مرد ڈاکٹر سے نہ جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے۔ لیکن ڈاکٹر شاید انہیں کچھ اور سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر بضد تھے لیکن ڈاکٹر انہیں کہہ رہا تھا کہ بہتر ہے کہ مجھے مکمل ٹھیک ہونے تک صدیقی صاحب کے ساتھ ہی جانے دیا جائے۔ اور سچی بات تو یہی

ہے کہ مَیں ان لوگوں کے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جانے کیوں ان سب کو دیکھتے ہی دماغ پر اک عجیب سا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ پھر جیسے مرد اور عورت کو ڈاکٹر کی بات سمجھ میں آ گئی کیونکہ انہوں نے شاید میرے چہرے پر اپنے لیے ناگواری کی لہر دیکھ لی تھی۔ مَیں صدیقی صاحب کے ساتھ ان کے گھر آ گیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ سب لوگ اور گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ ہی وہاں تک آئیں۔ پھر تو یہ روز کا معمول ہی بن گیا۔ وہ سب لوگ روز ہی صدیقی صاحب کے گھر چلے آتے جہاں میں برآمدے یا صحن والے باغیچے میں وہیل چیئر پر بیٹھا کسی پھول کسی دیوار کو تک رہا ہوتا۔

پھر ایک دن ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک شخص جو ڈرائیور کی وردی میں ملبوس تھا ایک جوان لڑکی کے ساتھ صدیقی صاحب کے گھر آیا۔ دونوں ہی جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ لڑکی تو نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گئی۔ پھر اس وردی والے ڈرائیور اور صدیقی صاحب نے اُسے بمشکل چُپ کروایا۔ پھر اُس لڑکی نے صدیقی صاحب سے میرے کپڑوں اور دیگر چیزوں کے بارے میں پوچھا۔ صدیقی صاحب جانے کہاں سے ایک آدھ بش شرٹ اور قلیوں کی وردی اُٹھا لائے۔ وہ لڑکی تیزی سے اس شرٹ اور وردی کے جیب ٹٹولنے لگی۔ پھر جانے ان کپڑوں کی کس جیب سے دو موتی نکل کر برآمدے کے فرش پر گرے، تب مَیں اسی لڑکی کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ہی وہ دو موتی کپڑوں سے نکل کر فرش پر اُچھلے تھے۔ میرے ہاتھ بے اختیاری میں ان موتیوں کو سنبھالنے کے لیے اُٹھ گئے جیسے میری کوئی بہت ہی قیمتی اور انمول چیز زمین پر گرنے جا رہی ہو۔ پھر جانے کیا ہوا، ان موتیوں کے گرنے کی آواز کا ارتعاش جیسے ہی میرے کانوں سے ٹکرایا۔ میرے اندر نہ جانے کتنا کچھ جھنجھنا سا گیا۔ موتی گرنے کے بعد دوبارہ اُچھلے اور پھر زمین سے ٹکرائے میرے اندر پھر ایک جھنکار سی پیدا ہوئی۔ دُور بیٹھے مجھے یہ سب کچھ ایسے دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی فلم کو سلوموشن میں چلا دیا جائے۔ تیسری بار موتی زمین پر ٹکرانے سے پہلے ہی میرے ذہن میں ایک دم جھماکے سے ہونے لگے۔ میرے ذہن پر جمی برف پگھلنے سی لگی۔ یہ موتی تو مجھے ایمان نے دیے تھے۔ ہاں ہاں۔۔۔ یہ تو وہی دو موتی تھے، لیکن یہ یہاں۔۔۔ اور یہ لڑکی۔۔۔ یہ تو نگہت تھی جو وردی میں ملبوس شاکر کے ساتھ

وہاں آئی ہوئی تھی۔ اور یہ صدیقی صاحب۔۔۔ پھر اچانک مجھے اس کالی رات سے لے کر اب تک کا ہر واقعہ ہر چہرہ صاف نظر آتا گیا۔ ہسپتال میں کوئی اور نہیں بلکہ شاکر کے ساتھ کمشنر صاحب امی اور باقی گھر والے آئے تھے۔ ایمان چلی گئی تھی اور کتنے افسوس اور شرم کی بات تھی کہ مَیں اب تک زندہ تھا۔ میرے سر میں شدید درد سا اُٹھا۔ ڈاکٹرز نے بعد میں مجھے بتایا کہ مَیں شدید صدمے سے اسی رات عارضی طور پر اپنا دماغی کنٹرول کھو بیٹھا تھا۔ میڈیکل کی زبان میں اسے شاید ٹمپریری ایمنیز یا کہتے تھے۔ ایسے واقعات مَیں آج تک سینما کے پردے پر دیکھتا رہا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ خود میری زندگی بھی ایک ایسے دَور سے گزرنے والی تھی۔

آگے کی کہانی بہت مختصر تھی۔ کمشنر صاحب اور امی نے صدیقی صاحب کے گھر کے بہت چکر لگائے تا کہ مَیں ان کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ صدیقی صاحب بھی ان کے حامی تھے لیکن جس دن مَیں نے ان کو یہ کہہ دیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ مَیں یہاں سے بھی کہیں اور چلا جاؤں تو ٹھیک ہے۔ لیکن مَیں گھر واپس نہیں جانا چاہتا۔ اس دن کے بعد انہوں نے مجھ سے گھر جانے کا کبھی نہیں کہا۔ کمشنر صاحب اور امی، بھابھی، سجاد بھائی سب اپنے کیے پر بے حد شرمندہ تھے۔ لیکن اب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ جس کے لیے مَیں جی رہا تھا جب وہ ہی نہیں رہی تو آگے کی زندگی کے ماہ و سال کہاں اور کس حال میں گزرنے تھے۔ اس سے مجھے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ عباد البتہ روز شام کو مجھ سے اسٹیشن پر آ کر مل جاتا تھا۔ اب سب ہی یہ جان چکے تھے کہ مَیں ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا کا بیٹا اور ایک رئیس زادہ ہوں۔ لیکن میرے دوست اب بھی وہیں پُرانے لوگ تھے۔ خیرو اور غفور اب بھی میرا اُسی طرح خیال رکھتے تھے۔ لیکن ہوش و حواس واپس ملنے کے بعد بھی میرے لفظ مجھے واپس نہیں مل سکے۔ میرا بولنا چالنا بالکل ہی ختم ہو چکا تھا۔ مَیں گھنٹوں ایک ہی جگہ بنا کسی سے کوئی بات کیے چُپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی ہاتھ سے پکڑ کر کہیں زبردستی لے جاتا تو چل پڑتا ورنہ وہیں بیٹھا خلا میں تکتا رہتا۔ مَیں اب تک ذہنی طور پر اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر پایا تھا کہ ایمان اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مجھے اس ساری دنیا سے ہی بے زاری محسوس ہوتی تھی جس میں مَیں خواہ مخواہ ہی جیے جا رہا تھا۔ مجھے اس مذہب سے چڑ ہو گئی تھی جس نے مجھ سے میری ایمان کو چھین لیا تھا۔ وہ معصوم لڑکی مذہب اور محبت کے درمیان کی اس جنگ میں پس گئی تھی۔ اس کا نازک

دل اور سیدھا سادھا دماغ اس جنگ کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پایا اور اُس نے اپنی زندگی ہار دی۔ محبت، مذہب کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ محبت مذہب پر قربان ہو گئی تھی۔

درمیان میں ایک آدھ مرتبہ عبداللہ بھی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ بس ہم دونوں چُپ چاپ بیٹھے رہتے اور پھر وہ الوداع کہہ کر چل دیتا۔ اس کا غم، میرے دکھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ہم لفظوں کی بولی سے زیادہ آپس میں خاموشی کی زبان زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ کبھی کبھی یہ لفظ بھی احساسات اور جذبوں کو کس قدر بے توقیر کر دیتے ہیں۔ ان کی عزت اور وقار کم کر دیتے ہیں۔ ان کی شدت کو بیان نہیں کر پاتے۔ سچ مانیے تو لفظ کبھی کبھی ہمارے محسوسات اور جذبوں کو بے عزت کر دیتے ہیں شاید اسی لیے مَیں اور عبداللہ آپس میں کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ بس خاموش رہ کر ایک دوسرے کا کرب محسوس کرتے تھے۔

واپس ہوش میں آنے کے بعد جب پہلی مرتبہ نگہت سے ملاقات ہوئی تو اُس نے مولوی علیم کی اس کایا پلٹ کے بارے میں بتایا تب مجھے پتہ چلا کہ ایمان اس آخری رات سے دو راتیں پہلے ہی اس جان کنی کے عالم میں تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس کی روح نکلنے کے لیے بے چین ہے لیکن کسی کے انتظار میں نکل نہیں پاتی۔ ڈاکٹروں نے تو تین دن پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔ مولوی صاحب کو اپنی دُعاؤں پر دواؤں سے زیادہ بھروسہ تھا لیکن تیسرے دن وہ بھی ٹوٹ گئے۔ عبداللہ نے ان کے پیروں پر اپنا سر رکھ دیا کہ آخری بار وہ ان سب کی بات مان لیں۔ حیا جانتی تھی کہ ایمان کو کس کا انتظار ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایمان ساری عمر بھی چاہے ایسے ہی کیوں نہ تڑپتی رہے لیکن اس کے اندر کی ایمان اسے کبھی لب نہیں کھولنے دے گی۔ حیا نے بھی عبداللہ کو مجھے بلوانے کے لیے کہا تھا۔ عبداللہ نے حیا سے اس بارے میں دوسرا کوئی سوال ہی نہیں کیا اور براہِ راست مولوی صاحب کی عدالت میں عرضی لگا دی تھی۔ مولوی صاحب پہلی رات تو بہت جز بز ہوئے اور انہوں نے عبداللہ کو سخت سُست بھی سنا دی تھیں۔ لیکن پھر دوسری رات اور پھر آخری رات جیسے جیسے ایمان کی حالت بگڑتی گئی اُن کے اندر کا سخت گیر مذہبی باپ ٹوٹتا گیا، حتیٰ کہ تیسری شام جب عبداللہ ان کے سامنے رو

نہ صرف دہلیز بلکہ زنانے کی حد عبور کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ شاید وہ اسی لمحہ اندر سے ٹوٹ گئے تھے جب انہیں یہ احساس ہوا تھا کہ ایمان بھی میری محبت میں اُتنی ہی مبتلا تھی جتنا مَیں۔۔۔۔ شاید اُن کے لیے یہ تصور ہی محال تھا کہ ایمان صرف ان کی تابعداری میں اس رشتے کے لیے رضامند ہوئی ہے۔ وہ اپنے تصور کی آخری حد تک جا کر بھی یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی کے دل میں یوں چور دروازے سے کوئی اندر بھی داخل ہو سکتا ہے۔ ان کے اندر کے مذہبی انسان کے لیے یہ بہت بڑا تازیانہ تھا۔ دوسری طرف ان کے اندر بسے ایک پیار کرنے والے باپ کے لیے یہ بہت اذیت ناک تھا کہ ان کی جان سے پیاری بیٹی نے اپنی زندگی ان کی خوشی کے لیے قربان کر دی لیکن انہیں اپنے دل کی حالت کے بارے میں احساس تک نہیں ہونے دیا۔ شاید اس رات عبداللہ کو مجھے بلا لانے کی اجازت دینے والا شخص مولوی علیم الدین نہیں بلکہ صرف ایک باپ ہی تھا۔ لیکن اِس باپ نے بہت دیر کر دی تھی، جب تک اُسے ہوش آیا وہ اپنی بیٹی کھو چکا تھا۔

مجھے نگہت نے ایک بند لفافہ بھی دیا تھا جسے مَیں روزانہ کھولنے کی ہمت کرتا اور روز ہی ہار کر واپس سنبھال کر رکھ دیتا تھا۔ نگہت نے بتایا تھا کہ یہ لفافہ ایمان نے اُسے اپنی بیماری کے دوران دیا تھا کہ اُس کی شادی کے بعد نگہت وہ لفافہ مجھ تک پہنچا دے اس نازنین کو کیا خبر تھی کہ قدرت نے اس کی سانسیں ہی گن رکھی ہیں۔

پتہ نہیں میں ایمان کے اس آخری خط کو کھولنے سے اس قدر کیوں ہچکچاتا تھا۔ مَیں ایک مقدس تحریر کی طرح اس بند لفافے کو روزانہ اُٹھاتا، چومتا، آنکھوں اور ماتھے سے لگاتا اور پھر واپس اسی دراز میں رکھ دیتا جہاں سے مَیں نے اُسے اٹھایا تھا۔ شاید مَیں اپنے اندر اس احساس کو جاوداں رکھنا چاہتا تھا کہ ایمان اب بھی اپنی اُس ان پڑھی تحریر کی صورت میں میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اُس کی اَن کہی باتوں کو اپنے صبح و شام کے تحیرّ کی صورت میں زندگی گزارنے کا اِک بہانہ بنانا چاہتا تھا۔

لیکن پھر ایک دن مجھے اس عذاب سے بھی گزرنا پڑا۔ رحیم کو صدیقی صاحب نے جانے کون سا کاغذ لانے کے لیے دفتر سے دن کے وقت فون کیا۔ وہ گھر پر کھانا بنا رہا تھا۔ وہ

دیا۔ صدیقی صاحب بھی جانے کس دھن میں تھے کہ لفافہ کھول بیٹھے اور پھر کاغذ پر نظر پڑتے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ مَیں اس وقت پلیٹ فارم کے ایک سنسان گوشے میں بیٹھا دو مزدوروں کو مال گاڑی سے سامان اُتارتے دیکھ رہا تھا۔ نظر بھٹکی تو صدیقی صاحب کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ مَیں سٹ پٹا کر کھڑا ہوگیا۔

"معافی چاہتا ہوں میاں۔۔۔۔ رحیم کو کوئی کاغذ گھر سے لانے کے لیے کہا تھا۔ وہ جلدی میں تمھاری کوئی ذاتی تحریر اُٹھا لایا۔ اور مَیں بھی بے خیالی میں اُسے کھول بیٹھا، لیکن اطمینان رکھو، اس تحریر کے سارے لفظ ویسے ہی ان چھوئے ہیں جیسے بند لفافے میں تھے۔"

صدیقی صاحب ایمان کا خط کھلے لفافے کی صورت میں میرے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں تھما کر واپس چلے گئے۔ میری حالت ایک لمحے میں کسی برسوں کے بیمار جیسی ہوگئی تھی۔ ٹانگوں میں سے جیسے کسی نے ایک لخت ہی جان نکال دی ہو۔ گھبرا کر وہیں بینچ پر بیٹھ گیا۔ دل اتنی زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے میری نظروں کے سامنے ایمان کا خط نہیں بلکہ وہ خود موجود ہو۔ کتنے دن سے یہ خط میرے پاس بند پڑا ہوا تھا لیکن اُسے کھول کر پڑھنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی، اور آج جب صدیقی صاحب نے غلطی سے اُسے کھول لیا تھا تو میرا دل اُسے پڑھنے کے لیے بے تابی سے دھڑک رہا تھا، جیسے ایمان سے بات کرتے ہوئے اس دل میں اُتھل پتھل ہوتی تھی، بالکل وہی کیفیت تھی اس وقت میری۔ آخر کار مَیں نے کانپتی انگلیوں سے خط کی تہیں کھول ہی دیں۔ اس گل رُخ کی وہی دل میں سیدھی اُتر جانے والی تحریر میری نظروں کے سامنے تھی اور آنسو خود بخود میری آنکھوں سے رواں ہوگئے۔

"مَیں جانتی ہوں آپ ابھی تک گھر واپس نہیں گئے ہوں گے۔ مَیں نے آپ سے کہا تھا نا۔۔۔۔ محبت میں ضد نہیں ہوتی۔ محبت تو ہتھیار ڈال دینے کا نام ہے۔ جیت کر بھی ہتھیار ڈال دینا صرف محبت کرنے والوں کا ہی تو شیوہ ہے۔ آپ بھی جیت چکے ہیں حماد۔۔۔۔

بس اب میری خاطر ہتھیار ڈال دیں۔۔۔۔

اور پھر محبت صرف پا لینے کا ہی تو نام نہیں ہوتا۔ مَیں نے آپ سے کہا تھا نا کہ زندہ رہنے کے لیے کبھی کبھی بس ایک ملاقات ہی کافی ہوتی

ہے۔ زندگی اس کی یاد کے سہارے آرام سے کاٹی جا سکتی ہے۔ مَیں آپ سے یہاں نہیں مل پائی تو کیا ہوا۔۔۔۔ اس ابدی زندگی میں ساتھ رہنے کی دُعا تو سدا میرے ساتھ رہے گی نا۔۔۔۔" "مَیں جانتی ہوں آپ کو واپسی کے لیے بہت سے بھرم توڑنا پڑیں گے اپنے اندر کے آئینے سے لڑنا بھی پڑے گا۔ لیکن مَیں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

اپنا بہت خیال رکھیے گا اور ہمیشہ خوش رہیے گا۔"

OO

جانے مَیں نے اس عشوہ طراز کا یہ خط کتنی بار پڑھا اور جانے مَیں کتنی دیر سے ہچکیاں لے لے کر روتا رہا۔ پھر کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا، وہ عبداللہ تھا۔ پتہ نہیں کب سے وہ یہاں کھڑا تھا۔ عبداللہ نے میرے گالوں پر بہے آنسو پونچھ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

"کب تک آپ ہم سب کو رُلاتے رہیں گے۔ دیکھیں۔۔۔۔ آج آپ سے ملنے کون کون آیا ہے۔"

مَیں نے حیرت سے عبداللہ کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ لگتا تھا پلیٹ فارم میرے اور شاکر کے گھر والوں سے ہی بھرا ہوا تھا۔ امی، سجاد بھائی، عبرینہ، بھابھی، عباد، سنی، شاکر اور نگہت کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی کمشنر صاحب اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سب سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار آنے میں بہت وقت لگا۔ مولوی علیم الدین آنکھوں میں آنسو لیے، سب سے آگے کمشنر صاحب کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ شہر کا سب سے دبنگ ریٹائرڈ کمشنر ایک غریب مولوی کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی سدا کی مغرور آنکھوں میں نفرت کے بجائے شرمندگی تھی اور اس کی ہمیشہ سے اکڑی ہوئی کمر جھکی ہوئی تھی۔ وہ سب وہیں کھڑے رہے، بس مولوی صاحب میری طرف بڑھے میری

نظریں خود بخود جھک گئیں، وہ قریب آ گئے اور میرے شانوں پر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"تم جیت گئے ہو حماد میاں، تمھاری محبت جیت گئی ہے۔ تم نے ثابت کر دیا ہے کہ محبت سچی ہو تو وہ سارے زمانے کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے۔ ہم سب اندر سے ٹوٹ چکے ہیں۔ سب تم سے بے حد شرمندہ ہیں۔ کمشنر صاحب خود چل کر میرے گھر آئے تھے۔ انہوں نے اور بیگم صاحبہ نے اور سب نے اپنی غلطی کی تلافی کر دی ہے۔ معاف کر دینے میں ہی عظمت ہے۔ مَیں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ سب سے پہلے مجھے اور پھر اس کے بعد اپنے گھر والوں کو بھی معاف کر دو۔ ہم سب تمھاری محبت کی عظمت کے سامنے بہت چھوٹے ہیں۔ اور چھوٹوں کو سزا نہیں دی جاتی۔ درگزر کیا جاتا ہے، تم بھی درگزر کر دو۔۔۔۔ دیکھو میں تمھارے سامنے اپنے ہاتھ۔۔۔۔"

مولوی علیم نے ہاتھ جوڑنے کی کوشش کرنا چاہی لیکن مَیں نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور ہم دونوں کی آنکھوں میں چھپے سیلاب بہہ نکلے۔ وہ مجھے تھپکتے رہے لیکن خود کو بھی رونے سے نہ روک پائے۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے چند قدم دُور کھڑے کمشنر صاحب کے پاس لے آئے۔ مَیں سر جھکائے کھڑا رہا۔ انہوں نے بچپن کی طرح میرے گال کو زور سے سہلایا۔ اچانک میرے سامنے سے ریٹائرڈ کمشنر امجد رضا غائب ہو گئے اور میرے بچپن والے بابا آ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنی بانہیں پھیلائیں اور مَیں ان کے سینے میں منہ چھپا کر سسک پڑا، وہ بھی مجھے گلے لگائے روتے رہے۔ برسوں کے بعد ایک باپ نے ایک بیٹے کو گلے لگایا تھا۔ پھر تو کیا تھا، لگتا تھا کہ سارا اسٹیشن ہی وہاں اُمڈ آیا ہے۔ امی، عباد، سجاد، بھابھی، شاکر، نگہت سب ہی مجھے اپنے جمگھٹے میں لیے ہوئے چھو رہے تھے، پیار کر رہے تھے، رو رہے تھے، یہ آنسو بھی جذبوں کے اظہار کا کیسا عمدہ ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہ اُسی کے لیے آنکھوں سے ٹپکتے ہیں جو آپ کے اپنے ہوتے ہیں، آپ کو پیارے ہوتے ہیں۔ اور بابا کو تو میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ بھیگی آنکھوں کے

ساتھ دیکھا تھا۔ غفورا بھی دُور خیرو اور دیگر مزدوروں کے ساتھ کھڑا بار بار کاندھے پر پڑے رومال سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھ رہا تھا۔ آج ان سب کے چہروں پر بھی اک عجیب سی خوشی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اندر سے اُداس بھی تھے۔ شاید وہ جان چکے تھے کہ اب میرا ان سے رُخصت ہونے کا وقت قریب آ چکا ہے۔ لیکن میرا وجود چاہے ان سے دور جا رہا ہو۔ پر میری رُوح تو ہمیشہ انہی رشتوں کے درمیان موجود رہے گی۔ کچھ رشتے ہمیشہ قائم رہنے کے لیے بنتے ہیں۔ غفورا اور خیرو وغیرہ کمشنر صاحب کے رعب کی وجہ سے قریب نہیں آ پا رہے تھے۔ بابا نے انہیں دُور سے میری طرف ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر خود ان کی طرف چلے آئے۔ مَیں نے ان سب کا بابا سے اسی طرح تعارف کروایا جس طرح میں بچپن میں اپنے دوستوں سے ان کا تعارف کرواتا تھا۔ بابا بھی آج بالکل وہی بچپن والے بابا بن گئے تھے۔ سب سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا اور ان سب کا میرا اتنا خیال رکھنے پر سب کا شکریہ بھی ادا کیا۔ صدیقی صاحب بھی اتنی دیر میں وہاں آ چکے تھے۔ بابا نے بہت دیر تک انہیں گلے سے لگائے رکھا۔ شاید شاکر انہیں صدیقی صاحب اور ان سب کے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتا چکا تھا۔

مجھے ان سب نے اسٹیشن سے اس طرح رخصت کیا جیسے میری بارات وہاں سے نکل رہی ہو۔ ہاں۔۔۔۔ سچ ہی تو ہے، میرے ساتھ ایمان کی یادوں کی بارات ہی تو تھی۔ وہ مجھ سے جُدا کب تھی۔ ہر لمحہ میرے ساتھ ہی تو رہتی تھی۔ مجھ سے باتیں کرتی تھی۔ میرا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ تنہائی میں میرے آنسو پونچھتی تھی۔ میرے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگاتی تھی۔

گھر واپس آ کر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ پایا۔ مَیں نے خود بابا سے کہہ کر لندن میں یونیورسٹی میں داخلے کے فارم منگوا لیے۔ اگلے مہینے ہی یونیورسٹی سے بلاوا آ گیا اور مَیں نومبر کی ایک سرد شام ایمان کے شہر سے اس کی گلابی یادوں سمیت رخصت ہو گیا۔

"تمھیں جب کبھی ملیں فرصتیں
میرے دل سے یہ بوجھ اتار دو
میں بہت دنوں سے اُداس ہوں

مجھے کوئی شام اُدھار دو۔۔۔

کسی اور کو میرے حال سے

نہ غرض ہے نہ کوئی واسطہ

مَیں بکھر گیا ہوں

سمیٹ لو۔۔۔

مَیں بگڑ گیا ہوں،

سنوار دو۔۔۔"

OO

یادوں کی بارات

ایمان چلی گئی اور مَیں اُس کے جانے کے بعد لندن آ گیا۔ شاید مَیں بھی کہیں نہ کہیں اپنے ذہن میں اس نظریے کی غلط فہمی کا شکار تھا کہ شاید اس کا شہر چھوڑ دینے کے بعد میرے درد میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اُس کی یاد وہ خنجر تھا جو ہمیشہ میرے دل کے عین بیچ گڑا رہا۔ جب تک لوگ آس پاس ہوتے، ذہن کچھ بٹا رہتا، لیکن تنہائی ملتے ہی مجھے اس کی وہ دو بڑی بڑی آنکھیں گھیر لیتیں۔۔۔۔ اس کے دیے ہوئے وہ دونوں موتی اور اس کا آخری خط میرے ساتھی بن جاتے اور گھنٹوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کی یاد کے آنے سے میری تنہائی ہی میری سب سے بڑی محفل بن جاتی اور لوگوں کے بیچ میں اکثر تنہا رہتا۔ جیسے ہی لوگ میرے پاس آتے مَیں تنہا ہو جاتا تھا۔ پھر گھنٹوں بیٹھا بھیڑ چھٹنے کا انتظار کرتا تاکہ لوگ جائیں، مجھے تنہائی ملے اور پھر سے اپنی محفل جما سکوں۔ صرف ایک کامران میرے دوستوں میں سے ایسا تھا جسے میرے دل کی حالت کا علم تھا۔ جب گذشتہ دنوں مَیں نے اُسے ایمان کے چلے جانے کے بارے میں پہلی مرتبہ کھل کر بتایا تو بہت دیر تک تو وہ سکتے کی کیفیت سے ہی نہیں نکل پایا۔ آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ آج تک وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ایمان کی شادی کہیں اور ہو گئی ہو گی، کیونکہ پچھلے دو سال سے نہ وہ پاکستان آیا تھا اور نہ ہی مَیں نے اسٹیشن پر ملازمت کے بعد اور لندن آنے سے پہلے تک اس سے کوئی رابطہ رکھا تھا۔ کامران اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ مجبوراً مجھے اُسے خواب آور دوا دے کر اس رات سلانا پڑا تھا۔ بہت دنوں تک وہ مجھ سے بھی روٹھا روٹھا سا رہا کہ مَیں نے اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اُسے خبر کیوں نہ کی۔ اسے میرے آہنی اعصاب پر بھی حیرت تھی کہ میں اب تک چل پھر کیسے رہا تھا۔۔۔۔ اب مَیں اُسے کیا بتاتا کہ یہی تو اصل شرمندگی کی بات تھی۔ کاش میرے حواس بھی ایمان کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے

چلے جاتے۔ لیکن مجھے تو وہ جاتے جاتے جینے کی سزا سنا گئی تھی۔ اور مَیں تھا کہ سزا کے طور پر جیے جا رہا تھا۔۔۔۔

ربیکا بھی مجھ سے ہمیشہ یہی گلا کرتی تھی کہ مَیں سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی سب کے بیچ نہیں ہوتا۔ جانے کہاں بھٹکتا رہتا ہوں۔ البتہ آج اس کی ناراضگی کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ دراصل اُسے میں نے صبح ہی بتایا تھا کہ میں سارہ کے گھر رات کھانے پر مدعو تھا۔ ربیکا رات بھر کی برف باری کے بعد نہر کے ساتھ جمی برف سے اسنو مین بنانے کی کوششوں میں مصروف تھی اور اس کوشش میں اس کے سفید ہاتھ پہلے سُرخ اور اب سردی سے نیلے پڑتے جا رہے تھے۔ یہ بات سنتے ہی وہ برف کا ڈھیر چھوڑ چھاڑ کر تیزی سے میری جانب لپکی۔

''کیا کیا۔۔۔۔ سارہ کے گھر کھانے پر گئے تھے۔ رات کو۔۔۔۔ اور مجھے ابھی بتا رہے ہو، یہ بھلا کیا بات ہوئی۔؟''

''اس نے دوپہر ساڑھے تین بجے مجھے یہ آفر کی تھی تب تک تم جا چکی تھیں۔ شام کو مَیں لائبریری کھنگالتا رہا اور اب جب تم ملی ہو تو بتا رہا ہوں۔''

ربیکا جانے کیوں روہانسی سی ہو گئی۔ پھر خود ہی کہنے لگی۔

''جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے تمھیں سارہ کے ساتھ دیکھ کر۔ غلطی میری ہی ہے، ایک ہی شخص ہر کسی کے لیے ایک سا ساون نہیں بن سکتا۔ اس کے وجود کی ٹھنڈی بوندیں سبھی پر یکساں نہیں برس سکتیں۔ لیکن مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرے لیے تمھارے وجود کا صحرا ہی غنیمت ہے۔ مَیں اپنے اس مقدر پر بھی بہت خوش ہوں۔۔۔۔''

ابھی ربیکا کی بات مکمل بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے سارہ آتی دکھائی دی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے گہرے سُرخ کی بند گلے کی سوئیٹر اور کالی جینز پہن رکھی تھی۔ برف سے بچاؤ کے لیے بند جوتے پہنے وہ ہماری طرف بڑھی چلی آئی۔ اس کے کاندھوں پر وہی جیکٹ تھی جو رات سردی سے بچاؤ کے لیے مَیں اس کے کاندھوں پر ڈال آیا تھا۔ ربیکا میری جیکٹ کو بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اُس نے غور سے آتی سارہ کو دیکھا اور پھر سے اپنے برف کے ادھ بنے پتلے کی طرف بڑھ گئی۔ سارہ نے قریب آ کر جیکٹ میرے حوالے کی۔

''یہ رہی تمھاری امانت۔۔۔۔ رات کو میرا دھیان بٹانے کے لیے بہت بہت شکریہ۔''

''مسٹر آئزک نے کہیں بعد میں میری جیبوں کی تلاشی تو نہیں لی اکیلے میں۔'' سارہ زور سے ہنس پڑی۔

''اب ایسے بھی نہیں ہیں میرے پاپا۔۔۔۔ رات کو بھی انہوں نے تمھارے جانے کے بعد خود مجھ سے سوری کہا تھا۔''

''اوہ۔۔۔۔ بہت خوب۔۔۔۔ واقعی یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔''

ربیکا نے برف سے گیلے اپنے ہاتھ جھاڑے اور پلٹ کر بولی۔

''بھئی میں تو اندر کیمپس میں جا رہی ہوں۔ ورنہ میرے ہاتھ یہیں کٹ کر گر جائیں گے۔''

سارہ اُسے روکتی ہی رہ گئی لیکن ربیکا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے اگر وہ مڑ کر دیکھتی تو اس کی بھیگی آنکھیں بھی سارہ کو نظر آ جاتیں۔ سارہ نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''اسے کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔ ہے مسٹر حماد۔۔۔ تم نے میری سب سے پیاری سہیلی کو اتنا اُداس کیوں کر دیا ہے۔ یہ ایسی تو کبھی بھی نہ تھی؟''

''شاید اُداسی میرے آس پاس بکھری رہتی ہے، جو بھی میرے ساتھ رہتا ہے وہ اس اُداسی کے گہرے میں ڈوب جاتا ہے۔''

سارہ نے غور سے میری جانب دیکھا۔

''تم باتیں بہت خوبصورت کرتے ہو۔ ربیکا بھی تمھاری انہی باتوں سے گھائل ہوتی نظر آ رہی ہے۔ کچھ بات تو ہے تم میں؟''

مجھے اس کے سوالیہ انداز پر ہنسی آ گئی۔

''یہ سوال ہے یا کوئی فیصلہ۔۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔۔ مَیں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مَیں نے اپنے پاپا کو کل رات سے زیادہ پریشان اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ مَیں جانتی ہوں کہ وہ بہت مضبوط انسان ہیں۔ زندگی کی ہر بڑی سختی کو انہوں نے مسکراتے ہوئے جھیلا ہے، اسی لیے وہ ہمیشہ سے

میرے آئیڈیل بھی رہے ہیں۔ لیکن جانے کیوں۔۔۔ جب سے تم اس یونیورسٹی میں آئے
ہو، میں نے انہیں تمھاری جانب سے کسی نہ کسی اُلجھن میں ہی مبتلا پایا ہے۔ کل رات بھی
میری پاپا سے اسی بات پر بحث ہو رہی تھی کہ کیا وہ مجھے یا میرے عقیدے کو اتنا کمزور سمجھتے ہیں
کہ میں اس سے پلٹ جاؤں گی۔ ہمیں بچپن سے یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہم عظیم ہیں اور
عظیم رہیں گے۔۔۔ تو کیا ہماری عظمت کسی ایک لڑکے کے انکار کرنے سے کیا کم ہو جائے
گی۔ کیا ہمارا عقیدہ اتنا کمزور ہے کہ کسی اور کا ایمان اس میں دراڑیں ڈال دے گا۔۔۔؟''

میں چُپ کر کے اس پُر اعتماد لڑکی کی بات سنتا رہا۔

''پھر تمھارے پاپا نے تمھیں کیا جواب دیا۔''

''مجھے حیرت اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پہلی مرتبہ انہوں نے روایتی باپ کے
رویے سے کام لیا۔ جو دلیل اور لاجک کی بجائے اپنا تجربہ اور خدشات اپنے بچے کے ذہن
میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے اندر کے خوف سے اُسے ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم
نے اس دن کہا تھا کہ اندھیرا ہمیشہ روشنی سے ڈرتا ہے۔ اگر یہ اندھیرا ہے تو میں خود بھی اس
اندھیرے کا ایک حصہ ہوں۔۔۔ پھر مجھے تم سے تمھارے عقیدے سے خوف محسوس کیوں
نہیں ہوتا؟''

سارہ کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ سر آئزک کے رویے نے اُسے اُلجھن میں ڈال دیا
ہے۔ میں اس کی باتیں سن کر یہ سوچتا رہا کہ مغرب اور مشرق کے رویوں میں کس قدر فرق
ہے۔ یہاں مغرب میں ایک بیٹی باپ سے اپنے غلط یا صحیح ہونے پر باقاعدہ کسی ملزم کی طرح
جرح کر سکتی تھی۔ اس سے لڑ سکتی تھی، روٹھ کر ناراض ہو سکتی تھی جب کہ مشرق میں کسی جوان
لڑکی کا باپ کے سامنے یوں کھڑا ہونا بھی محال تھا۔ چہ جائیکہ وہ اپنے باپ سے کوئی سوال کر
سکے۔۔۔ جانے کیوں مجھے اس لمحے ایمان بہت شدت سے یاد آئی۔ سارہ اپنی رو میں نہ
جانے کیا کچھ بولتی رہی۔ پھر اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''کہاں کھو جاتے ہو یوں پل بھر میں۔''

آج اس نے بھی اچانک وہی سوال پوچھ لیا تھا جو ربیکا اس سے پہلے کئی مرتبہ پوچھ چکی
تھی۔

''کہیں نہیں۔۔۔ بس تمھاری بات سن رہا تھا۔''

''نہیں۔۔۔ تم میری بات سنتے ہوئے بھی یہاں نہیں تھے، تم کبھی بھی ہم لوگوں کے
ساتھ نہیں ہوتے۔ میں نے آج تک کسی کی آنکھوں میں اُداسی کے اتنے بھنور ایک جگہ اکٹھے
نہیں دیکھے۔ اگر کوئی بہت ذاتی بات نہ ہو تو تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔''

اب میں اس معصوم لڑکی کو کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کتنے غم میرے ابدی ساتھی ہیں۔
میں اُسے یہ سب بتا کر افسردہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''داستان اتنی لمبی ہے کہ تم سُن سُن کر اُکتا جاؤ گی۔ ہاں البتہ یہ یقین رکھو کہ اس میں
کچھ ایسا ذاتی نہیں ہے جسے تم سے چھپایا جائے۔ جب کبھی ہمیں فرصت ہوئی اور ہم دونوں
ساتھ ہوئے تو تمھیں ضرور بتاؤں گا۔''

وہ خوش ہو گئی اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔

''وعدہ۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''پکا وعدہ۔''

پھر وہی دو ہلکے سے گڑھے اس کے چہرے کا نور بڑھا گئے۔ کلاس کی گھنٹی تیسری بار بج
چکی تھی۔ ہم دونوں ہی وہاں سے چل دیے۔۔۔

OO

خوف

پھر ایک عجیب بات ہوئی، یونیورسٹی انتظامیہ نے اچانک اعلان کر دیا کہ اس سال پہلے کی طرح طالب علم اپنا پرچہ اور تحقیق ہمیشہ کی طرح کھلے ہال میں تمام یونیورسٹی کے سامنے نہیں پڑھیں گے۔ بلکہ تمام اسٹوڈنٹس پہلے اپنا ٹرم پیپر لائبریری میں جمع کروائیں گے اور انتظامیہ اس کی جانچ اور تحقیق کے بعد چند منتخب شدہ پرچوں کو عام طلبا کے سامنے تقریب میں پڑھنے کی اجازت دے گی۔

سارہ اس بات سے بھی شدید جھلائی ہوئی تھی لیکن مَیں جانتا تھا کہ اصل میں معاملہ کیا تھا۔ سر آئزک نہیں چاہتے تھے کہ مَیں اپنی تحقیق کسی بھی صورت میں دوسروں تک پہنچاؤں۔ وہ اس نئی نسل کو ''ہالوکاسٹ'' کا وہی رُخ دکھانا چاہتے تھے اور اسی یقین میں زندہ رکھنا چاہتے تھے جو برسوں سے اس نسل تک پہنچایا جاتا رہا تھا۔ مجھے پہلی بار ایک عجیب سا طمانیت بھرا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ خود کو عظیم کہنے والے اصل میں مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ میرے عقیدے سے خوف زدہ ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ خود کو عظیم کہلوانے کا حق اگر کسی کو ہے تو اصل میں وہ ہم ہیں۔ لیکن ہماری عظمت ہم خود اپنے ہاتھوں سے گنوا چکے ہیں۔ اور ان یہودیوں کو یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم پھر سے اپنی اس عظمت گم گشتہ کو پا نہ لیں۔

بہت دنوں کے بعد سر آئزک آج کلاس میں پُرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ان کے سر سے بہت بڑا بوجھ ٹل گیا تھا۔ ربیکا پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے چھوٹتے ہی سر آئزک سے پوچھ لیا کہ اس مرتبہ اتنے سالوں بعد یونیورسٹی نے ٹرم پیپر سے متعلق اپنا اُصول کیوں بدل لیا ہے۔ سر آئزک نے بڑی خوبصورتی سے اُسے انتظامیہ کا اندرونی معاملہ کہہ کر ٹال دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ہر سال کچھ معیاری پرچوں کے ساتھ ساتھ بہت سے غیر معیاری پرچے بھی آجاتے تھے۔ اس لیے اس مرتبہ منتخب شدہ پرچوں کو ہی منظر عام پر لایا

جائے گا۔ ربیکا نے کاغذ کی چٹ پر لکھ کر چٹ میری طرف کھسکائی، اُس نے چٹ پر لکھا تھا کہ کیا وہ سر آئزک سے براہِ راست پوچھ لے کہ کہیں یہ پابندی میرے ٹرم پیپر کے موضوع کی وجہ سے تو نہیں لگائی گئی۔۔۔۔؟ مَیں نے آنکھیں نکال کر اُسے گھورا تب کہیں جا کر وہ باز آئی ورنہ اس سے کوئی بعید بھی نہ تھی کہ وہ یہ سوال بھی سر آئزک سے کر ہی بیٹھتی۔

اتفاق سے سارہ کے ٹرم پیپر کا تعلق بھی ''ہالوکاسٹ'' سے ہی تھا۔ وہ دراصل فریڈیچ کیلز، نامی ایک یہودی مصنف کی تحقیق پر مبنی تھا مقالہ لکھ رہی تھی جس نے ''ہالوکاسٹ'' کے حق میں اپنی تصنیف (روزنامچوں) میں مختلف دلائل دیے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت سی کتابوں انٹرویوز اور مختلف حوالوں سے اس مفروضے کو حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

سارہ نے مجھ سے کبھی اپنی تحقیق چھپائی نہیں تھی بلکہ وہ مسکرا مسکرا کر مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں اپنی روزانہ کی پیش رفت کے بارے میں بتاتی رہتی تھی۔ ربیکا پر وہ لمحے بہت گراں گزرتے تھے جب سارہ میرے ساتھ کسی بحث میں مصروف ہوتی۔

پھر ایک ایسے ہی اُجلے دن جب پوری یونیورسٹی دھوپ سینکنے کے چکر میں چھٹی منانے کے موڈ میں تھی۔ مَیں نے ربیکا کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ نہر کنارے اپنی مخصوص بینچ پر بٹھا لیا۔ آج مَیں نے اس سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔ وہ آج میرے اس انداز پر خاصی حیران بھی تھی۔

''بیٹھو یہاں۔۔۔۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اس نے حیرت سے اپنے ہاتھ میں پھنسے میرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر ہنس دی۔

''ہے میڈی۔۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔۔ آج کہیں مجھے پرپوز کرنے کا ارادہ تو نہیں ہے۔'' ''کاش میں اتنا خوش نصیب ہوتا۔ تمھارا ساتھ پانے والا دونوں جہاں پا لے گا۔''

ربیکا کی آنکھوں میں بیک وقت بہت سے شرارے لپکے۔

''واقعی ۔۔۔ کیا تم ایسا سمجھتے ہو۔۔۔۔ مجھ میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''تمھارے وجود میں اور تمھاری اس خوبصورت روح میں وہ سب کچھ موجود ہے جو دنیا کے کسی بھی نوجوان کے خوابوں کی تمنا ہو سکتی ہے۔ تم جس راستے سے گزر جاتی ہو، لوگ گھنٹوں

وہاں مسحور بیٹھے رہتے ہیں۔ تمھاری ایک جھلک پانے کے لیے، تم سے دو گھڑی بات کرنے کے لیے مَیں نے یہیں اسی یونیورسٹی میں جانے کتنوں کو دن رات پریشان دیکھا ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تُم میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

مَیں نے اس بے باک مغربی حُسن کے چہرے پر پہلی مرتبہ شرم کی سُرخی دیکھی۔ عورت دنیا کے کسی خطے کی بھی ہو۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں یہ وصف ضرور موجود ہوتا ہے۔ وہ ہنس کر بولی ''ہاں۔۔۔ کچھ نہ کچھ خاص بات تو ضرور ہوگی تبھی یہ سب آہیں بھرتے ہیں۔۔۔ لیکن وہ خاص بات نہیں جو اس کے پتھر دل کو موم کر دے۔ جس کو مَیں پگھلانا چاہتی ہوں۔ پھر یہ سب کچھ میرے کس کام کا۔''

تو آج ربیکا نے بھی دل کی بات کھل کر کہنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا۔

ہمارے سامنے ٹیمز سے نکلی اس نہر کا برف جیسا پانی نہایت خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ پانی میں جمی برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی تیرتے ہوئے سامنے سے گزر جاتے تھے۔ ایک ایسے ہی برف کے چھوٹے سے سفید سنگِ مرمر کی سِل نما ٹوٹے پر پرندوں کا ایک جوڑا بیٹھا ہمارے سامنے سے گزرا جو برف میں پھنسی گھاس کے ٹکڑے نکالنے میں مشغول تھا۔ دھوپ سیدھی ربیکا کے سنہری رنگ پر پڑ رہی تھی اور اُس کا چہرہ مزید کندن ہو گیا تھا۔ بلیک سکرٹ اور بلیک ٹاپ میں وہ اس وقت بالکل کالے مخمل میں لپٹی سونے کی ایک گڑیا لگ رہی تھی۔

ربیکا اپنی بات کہہ کر چُپ چاپ بیٹھ کر نہر میں چھوٹے چھوٹے کنکر پھینکنے لگی۔ اُس نے کنکر پھینکنے کے لیے ہاتھ ہوا میں اُٹھایا تو مَیں نے وہیں اس کی کلائی تھام لی۔

''کیا ضروری ہے کہ سب جذبے، ساری خوشیاں، ہر خواہش کسی ایک شخص سے ہی متصل کر دی جائے؟ ہو سکتا ہے وہ بدنصیب اس انعام کا حق دار ہی نہ ہو؟۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصے کے سارے رنگ، ساری قوسِ قزح پہلے ہی کہیں نتھار چکا ہو؟''

ربیکا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ ''اگر وہ اپنے حصے کی قوسِ قزح پہلے ہی کسی اور کی آنکھوں میں ڈھونڈ چکا ہے تو پھر یوں سمجھو کہ میری زندگی میں بھی ہر رنگ سے میرا حق، رنگنے بنا ہی چھن چکا ہے۔ میری محبت

بھی ہمیشہ بے نور ہی رہے گی۔''

یا خدا۔۔۔ اس لڑکی کو اتنی مشکل باتیں بھی آتی ہوں گی۔۔۔ مَیں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ شاید یہ محبت ہی ہوتی ہے جو ہمیں ایسی کٹھن بولیاں سکھا جاتی ہے۔ ربیکا کا دل بھی ضد پر اڑ گیا تھا۔ محبت پھر سے اپنا صدیوں پُرانا کھیل کھیل رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عاشق اور محبوب کی جگہ اور نام بدل گئے تھے۔ باقی ساری ساری چبھن، ساری کاٹ، سارے گھاؤ وہی تھے۔ کاش ہم انسانوں کو اتنا تو اختیار دیا ہوتا خدا نے کہ اگر ہم خود کو نہیں، تو کم از کم دوسروں کو تو اس آگ سے بھرے گڑھے میں گرنے سے روک سکتے۔ لیکن قدرت کو تو خود یہ تماشا دیکھنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ دو انسانوں میں سے کسی ایک کے دل میں دوسرے کے لیے یہ آگ بھڑکا کر اُسے عمر بھر کے لیے سسکتا اور تڑپتا ہوا دیکھنا پسند کرتی ہے۔ قدرت تو اس کھیل کی ازل سے سب سے بڑی کھلاڑی ہے۔ وہ ابد تک ہم انسانوں کو یونہی تڑپاتی سسکاتی رہے گی۔ جیسے وہ اس وقت ربیکا کو تڑپا رہی تھی میرے لیے۔ وہ ربیکا جسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ میری رُوح تو جانے کب کی ایمان کے ساتھ ہی پرواز کر چکی تھی۔ یہ سانس لیتا جسم تو خود اک چلتی پھرتی لاش تھا۔ محبت کا وہ زہر جو آج اس کی رگوں میں دھیرے دھیرے اُتر رہا تھا۔ بہت پہلے میری جان لے چکا تھا۔

ربیکا سر جھکائے بیٹھی اپنے آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ مَیں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی بلند کی۔ اس کی جھیل جیسی نیلی آنکھوں میں جانے کتنے بھنور مچلنے کو تیار تھے۔

''نہیں۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ بہت رُلا لیا اس محبت نے ہم جیسے بے بس انسانوں کو۔ بہت کھیل لیا ہے اس نے ہمارے جذبات کے ساتھ۔ بہت گھاؤ لگا چکی یہ محبت بہت چرکے سہہ لیے ہم نے اس کے چلائے ہوئے اندھے تیروں کے۔۔۔ نہیں ربیکا۔۔۔ تم نہیں روؤ گی۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب اور نہیں۔''

مَیں اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتا جا رہا تھا اور اُسے رونے سے منع کرتا جا رہا تھا لیکن جس رفتار سے مَیں اس کے آنسو پونچھ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ تیزی سے مزید آنسو اُمڈتے آ رہے تھے۔ ربیکا بار بار مجھ سے معذرت کرتی اور نہ رونے کا وعدہ کر رہی تھی لیکن اس

کے اندر کا سیلاب آج پوری طرح بہہ جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ پھر وہ وہاں سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے دُور چلی گئی۔ مَیں اُسے دُور جاتے دیکھتا رہا۔ نہر پر راج ہنسوں کے ایک جوڑے نے پانی کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور تیزی سے پَر پھڑ پھڑا کر پانی کے اُوپر آ کر بیٹھ گیا۔ ہنسنی نے ہنس سے پوچھا۔ ''وہ راج ہنسنی رو کیوں رہی تھی۔ اس کا ہنس کہاں ہے؟ ہنس نے ایک لمبی اُڑان بھری اور پھر سے ہنسنی کے سَر پر منڈلا کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''یہ انسانوں کی دُنیا بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اس ہنسنی کا ہنس تو کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آیا۔ اِک ہنس وہاں نہر کنارے بیٹھا تو ہے لیکن اس کی تو اپنی ہنسنی کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہ کیسے بے جوڑ سے جوڑے بنا رکھے ہیں تقدیر نے ان انسانوں کے زمین پر۔ ان سے تو ہم ہَوا کے دوش پر تیرتے راج ہنس ہی بھلے۔ ہم میں سے ہر اِک کا اپنا جوڑا تو ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ بھی ہے۔ ہنسنی نے اِک دکھ بھری نظر دُور بھاگتی ربیکا پر اور پھر مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے ہنس کے ساتھ ایک لمبی اُڑان بھر گئی۔ مَیں وہیں اکیلا، تنہا بیٹھا رہ گیا۔۔۔۔

OO

گریز محبت

اُس دن کے بعد ربیکا بہت دن تک میرے سامنے آنے سے گریزاں رہی۔ شروع کے دو تین دن تو وہ یونیورسٹی ہی نہیں آئی۔ مَیں نے اُس کے فون پر اور گھر پر رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سب نمبر بند ملتے تھے۔ پھر جب وہ یونیورسٹی آئی بھی تو بہت بکھری بکھری سی تھی، اور مجھ سے نظریں چراتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن مجھے ہیومینٹرنگ کی کلاس میں ایک موقع مل ہی گیا۔ اس دن کا موضوع تھا ''پا لینے اور کھو دینے کا احساس''

مجھ سے جب سر آئزک نے اس موضوع پر بات کرنے کے لیے کہا تو مَیں نے اِک اچٹتی سی نگاہ ربیکا پر ڈالی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ مَیں نے اصل میں اسی کو مخاطب کیا۔

''احساس اگر محبت کا ہو تو انسان اس میں کبھی کچھ کھوتا نہیں ہے۔ صرف پاتا ہی ہے۔ محبت چاہے یک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ آپ کو اِک خوبصورت احساس دے کر ہی جاتی ہے۔ چاہے دوسری طرف کا جذبہ اس کے ہم پلہ نہ ہو تب بھی۔۔۔۔ محبت کسی سوداگر کا سودا تو نہیں کہ دونوں جانب کے پلڑے ہمیشہ برابر ہی ہوں، دوسرے کا وزن کم ہونے سے ہمارا وزن تو بڑھتا ہی ہے نا۔ اُس کے محبت نہ کرنے سے ہماری محبت پر کیا فرق پڑتا ہے؟ محبت کسی صلے کی توقع میں نہیں کی جاتی۔ ہاں اگر دوسری طرف سے بھی وہی شدت موجود ہو تو سمجھیں کہ انعام دوگنا ہو گیا ہے۔ لیکن اگر دوسرے کی کم نصیبی سے وہ اس جذبے سے محروم ہے تو پھر بھی اس بات سے اپنے حصے کا انعام نہیں گنوایا جا سکتا۔ زندگی بتانے کے لیے اک اپنے حصے کا یہ احساس یہ انعام ہی کافی ہے۔ لیکن یاد رہے، محبت کا یہ سفر ننگے پاؤں ایک جلتے اور تپتے صحرا میں سدا کے لیے نکلے ہوئے سورج تلے چلنے کا سفر ہے۔ پاؤں کے چھالے گننے کے لیے بیٹھ جانے والے اپنی منزل کا نشان کھو دیتے ہیں۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔''

مَیں اپنی بات ختم کر کے بیٹھ گیا۔ چند منٹ تک تب بھی کلاس میں گہرا سکوت سا چھایا رہا۔ ربیکا کی آنکھیں چھلکنے کو تیار تھیں۔ وہ تو بھلا ہو اُس گھنٹی کا جو کلاس ختم ہونے کی نشانی کے طور پر بج گئی ورنہ آج ساری کلاس ہی ربیکا کے راز سے واقف ہو جاتی۔ ہم سب کلاس سے رفتہ رفتہ نکل گئے۔ مَیں اپنے خیالوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے پکارتی جوزف کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ تیسری بار اس نے پکارا تو میں چونکا۔ وہ میرے پیچھے ہی تیزی سے چلا آ رہا تھا۔

''ہے مسٹر حماد۔۔۔۔ کن خیالوں میں کھوئے ہوئے ہو۔۔۔۔؟''

جوزف نے میرا ہاتھ تھاما اور جلدی سے مجھے لے کر یونیورسٹی کی مرکزی عمارت سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے کوئی اہم بات بتانا چاہتا ہے جس کے لیے اُسے تنہائی کی ضرورت ہے۔ باہر کھلی فضائیں میں پہنچتے ہی اُس نے براہِ راست مجھ سے پوچھا۔

''اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ تم ''ہالوکاسٹ'' پر اپنے ٹرم پیپر یا اس یونیورسٹی میں اپنے داخلے کے خاتمے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرلو، تو تمھارا جواب کیا ہوگا؟

''آپ میرا جواب اچھی طرح جانتے ہیں۔ مَیں قدم رکھ کر پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

''مَیں جانتا تھا تو پھر ذہنی طور پر تیار رہو۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے تم سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ شاید وہ مجھے بھی اس اجلاس میں نہ بلاتے جو گورننگ باڈی نے کل طلب کیا تھا، لیکن ان کی نظر میں میری وفاداریاں ابھی تک غیر مشکوک ہیں۔ اور پھر شاید اس لیے بھی کہ انہیں آخر میں کہیں نہ کہیں اس فیصلے پر تمام ٹیچرز کے ساتھ میرے دستخط بھی چاہیے ہوں گے۔''

''لیکن اب مجھ پر کیا الزام ہے؟ ٹرم پیپر کو طلباء تک نہ پہنچنے دینے کا تو انہوں نے پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا ہے۔۔۔۔ پھر کیا وجہ ہوئی اس اجلاس بلانے کی۔؟''

''تم دو تین دن پہلے پارک اسکوائر ایونیو کی لائبریری میں گئے تھے؟''

''ہاں گیا تھا۔''

مجھے یاد تھا، یہ اُسی دن کی بات ہے جس رات میں سارہ کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔

''وہاں تمھاری لائبریرین پیٹر تھامس کے کچھ بحث بھی ہوئی تھی۔''

''اُسے بحث تو نہیں کہا جا سکتا۔ بس وہ مجھے چند کتابیں دینے میں پس و پیش کر رہا تھا جو کہ لائبریری کی فہرست (کیٹلاگ Catlog) کے حساب سے لائبریری میں ہی موجود ہونی چاہئیں تھیں۔ لیکن یہ واقعہ تو یونیورسٹی سے باہر کا ہے۔ اس سے انتظامیہ کا کیا تعلق۔''

''شاید تم نہیں جانتے۔ پیٹر خود بھی روسی نژاد یہودی ہے۔ اُس نے یونیورسٹی انتظامیہ کو اس دن کے حوالے سے، جب تم لائبریری گئے تھے۔ ایک درخواست دی ہے کہ تم نے اُسے کتابیں نہ دینے پر دھمکیاں دی ہیں اور مذہبی طور پر ہراساں بھی کیا ہے۔ اس لیے تمھارے خلاف کارروائی کرنے کی درخواست کی ہے۔''

مجھے شدید غصہ آ گیا۔

''یہ سب فضول بکواس ہے۔ نہ تو مَیں نے اُسے کوئی دھمکی دی تھی اور نہ ہی کسی بھی طور پر ہراساں کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔''

''مَیں جانتا ہوں کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن تم جانتے ہو کہ انتظامیہ کسی بہانے کی تلاش میں تھی۔۔۔۔ اور وہ بہانہ تم نے انہیں فراہم کر دیا ہے۔''

جوزف کے چہرے پر بھی پریشانی کی لکیریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو میں اس لائبریری میں گیا تھا۔ مجھے فرانسیسی مصنف رابرٹ فوری سن کے دو طویل مقالے چاہیے تھے۔ جو انہوں نے جنوری 1979 اور دسمبر 1978ء میں لکھے تھے۔ جس میں انہوں نے واضح ثبوت دے کر ثابت کیا تھا کہ یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ہلاک کرنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن لائبریرین پیٹر نے پہلے تو ان مقالوں کی موجودگی سے ہی انکار کر دیا۔ پھر مَیں نے اُسے لائبریری کی فہرست دکھائی جس میں باقاعدہ ان دو مقالوں کا اندراج تھا اور فہرست اور رجسٹر یہ بھی ظاہر کر رہے تھے کہ پچھلے کئی سالوں سے ان مقالوں کو کسی قاری کو اشو بھی نہیں کیا گیا تھا تو اس کا موڈ آف ہو گیا اور اُس نے مجھ سے کہا کہ مَیں کل یا پرسوں چکر لگالوں کیونکہ آج وہ کچھ مصروف ہے۔ اب جب کہ جوزف نے مجھے لائبریرین پیٹر کی قومیت کے بارے میں بتایا تو مجھے اس کے

روپے کی سمجھ آ رہی تھی۔ اُس کے انکار کے بعد میں نے ذرا سختی سے اس سے کہا تھا کہ وہ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں لائبریری کی اعلیٰ انتظامیہ یا لندن میٹرآفس میں لائبریری شعبے میں اس کے سُست رویے کی شکایت کر دوں، اس پر اُس نے منہ بناتے ہوئے ان دو میں سے ایک مقالہ مجھے کہیں اندر سے نکال کر دے دیا۔ دوسرے کے بارے میں اُس نے عذر پیش کیا کہ وہ ایک وقت میں دونوں مجھے جاری نہیں کر سکتا لہٰذا پہلا پڑھنے کے بعد وہ واپسی پر مجھے دوسرا دے گا۔ اور میں چُپ چاپ ایک ہی مقالہ لے کر واپس چلا آیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی، نہ تو میں نے اُس لائبریرین کو کوئی دھمکی دی تھی، نہ ہی اس سے اُونچی آواز میں بات ہی کی تھی۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اُسے میری یونیورسٹی کا پتہ کیسے چلا اور وہ یہاں تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ تبھی میرے ذہن میں ڈی کارڈ کا خاکہ سا اُبھرا۔ اوہ۔۔۔۔ تو اس نے کتاب جاری کرتے وقت میری یونیورسٹی سے جاری شدہ میرا آئی۔ڈی (شناختی نمبر) نوٹ کر لیا تھا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میرے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

جوزف کے بتانے کے بعد میں شام تک بیٹھا اپنے ٹرم پیپر کو حتمی شکل دیتا رہا۔ اب میں جلد از جلد اُسے ختم کر کے پیش کر دینا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب چھ بجے شام یونیورسٹی کے لائبریرین نے بتایا کہ لائبریری بند کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا، باہر واقعی اندھیرا چھا چکا تھا۔ باہر نکلا تو سرد ہوا کے پہلے تھپیڑے نے میرا بھرپور استعمال کیا۔ آسمان سرخ انگارہ ہو رہا تھا، برف باری کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ گیٹ سے باہر نکلا تو دور دور تک کسی سواری کا نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے اگلے بلاک تک میٹرو کی تلاش میں پیدل چلنے کا ہی فیصلہ کر لیا، دُور لندن شہر کی روشنیاں اب پوری طرح جگمگانے لگی تھیں۔ اونچے اونچے نیون سائن زمین پر اُترے ستاروں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ اچانک میرے اوورکوٹ کی جیب میں رکھا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف سارہ تھی۔ اُس کی ملائم آواز فون پر اُبھری۔

''ہے مسٹر حماد۔۔۔۔ کبھی ہم یہودیوں کے خلاف مواد اکٹھا کرنے سے باز بھی آ جایا کرو۔ کیا کر رہے ہو؟''

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پیدل چلنے کی پریکٹس کر رہا ہوں، موسم قاتلانہ ہے، دل جوان ہے اور رستہ طویل ہے۔ سو چلا جا رہا ہوں اپنی دھن میں مگن۔''

سارہ بھی میری بات سن کر ہنس دی۔

''میرے پاس البرٹ ہال میں ہونے والے اسٹیج تھیٹر کے دو ٹکٹ ہیں۔ مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پاپا کو تم نے ہزار غموں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ چلو گے میرے ساتھ تھیٹر دیکھنے کے لیے؟''

''ایک خوبصورت لڑکی جب کسی نوجوان کو اپنے ساتھ کہیں باہر لے جانا چاہتی ہو تو اس کے عقل مند ماں باپ کو اسی طرح کے بہانے کر لینے چاہئیں۔''

سارہ کی ہنسی فون پر اُبھری۔

''کہاں ہو اس وقت۔؟''

میں نے اُسے اس سڑک کا پتہ بتایا جس پر میں اس وقت مٹرگشت کر رہا تھا۔ چند ہی منٹوں میں سارہ کی سفید بیٹل کار نمودار ہو گئی۔ اس نے میرون کلر کی اونچے گلے والی سویٹر، بلیک اسکرٹ کے ساتھ پہنی ہوئی تھی اور بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ آج میں نے پہلی مرتبہ اُسے پوری طرح سجے سنورے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ عام طور پر وہ میک اپ وغیرہ سے بے نیاز سادہ سی رہتی تھی۔ اُس نے گاڑی میرے قریب لا کر روکی۔

''یوں سرد شاموں میں ایک جوان پردیسی لڑکے کا لندن کی سڑکوں پر تنہا گھومنا کچھ ٹھیک نہیں۔ جلدی سے میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ، میں تمھیں تمھاری منزل پر پہنچا دوں گی۔''

میں مسکراتا ہوا اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں ہم مضافات سے گزرتے ہوئے جاگتے ہوئے جگمگاتے لندن پہنچ گئے۔ چمکتی ہوئی شیشے جیسی دکانیں دونوں اطراف کھلی ہر گزرتے راہی کی توجہ کھینچ رہی تھیں۔ سنٹرل لندن کے بڑے بڑے کسینو (جوئے خانے) شام ہوتے ہی کھل گئے تھے اور باہر کھڑی نیم عریاں لڑکیاں لوگوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ یہ سب کئی کئی منزلہ کسینو تھے۔ جن کے اندر جانے کے لیے بڑے بڑے ڈرائیو وے بنے ہوئے تھے۔ آپ اپنی گاڑی سمیت

اندرونی عمارت جاسکتے تھے، نئی لگنے والی فلموں کے بڑے بڑے بورڈ جل بجھ رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا بورڈ نئی فلم کنگ کانگ کا تھا۔ اصل میں بورڈ کیا تھا، کئی منزلہ بہت بڑا کنگ کانگ ہی تھا جو بجلی کی روشنیوں سے بن رہا تھا، بجھ رہا تھا۔ مجھے کنگ کانگ کا بورڈ دیکھ کر تنی یاد آ گیا۔ اُسے یہ فلم بے حد پسند تھی۔ لیکن وہاں کے سینماؤں میں ابھی کنگ کانگ نہیں لگی تھی۔ اب ہم بڑے پل کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ پل کے گرد بڑی بڑی جہازی سائز کی پیلی روشنیوں نے دن کا سا سماں باندھ رکھا تھا۔ سگنل بند تھا، شاید کوئی اسٹیمر نیچے سے گزر رہا تھا، خود کار پل درمیان میں سے علیحدہ ہو کر اوپر اُٹھ چکا تھا۔ بحری جہاز بھونپو بجاتا ہُوا پل کے درمیان سے گزر گیا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے لوگوں نے اپنے شہر کے باسیوں کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگائے۔ ہاتھ ہلا کر وعدہ کیا کہ الوداع اے شہروں کے شہر لندن۔ ہم چند دن کے لیے تم سے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وعدہ رہا کہ ہم پھر ملیں گے، اور بہت جلد ملیں گے۔ تب تک اپنی اس رنگینی اور جگمگاہٹوں میں کمی نہ آنے دینا۔ سچ ہے، دنیا کے ہر خطے کے باسیوں کو اپنا شہر ہی دنیا کا سب سے خوبصورت شہر لگتا ہے۔ مجھے اپنا کوئٹہ بھی اسی طرح اور اتنا ہی پیارا تھا۔ اس شہر کی فضا میں میری ایمان کی مہک بسی ہوئی تھی۔ اس کی دسمبر کی شاموں میں بھی ابھی تک کچے کوئلے کے جلنے کی میری پسندیدہ خوشبو موجود تھی، جو بچپن سے ہی میری روح کو کھینچ لیتی ہے۔ یہ شہر بھی ہمیں کس طرح خود سے باندھ لیتے ہیں۔ جیسے کوئی خون کا رشتہ ہو ان سے۔

سارہ گاڑی بے حد تیز چلا رہی تھی۔ پل جڑتے ہی تھوڑی دیر میں ہم البرٹ ہال کی پارکنگ میں موجود تھے۔ ہال میں بہت بھیڑ تھی۔ ضرور کوئی خاص تھیٹر تھا۔ ہماری نشستیں دوسری رو میں ہی تھیں۔ ہمارے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی ہال کی روشنیاں بجھا دی گئیں۔ سامنے اسٹیج کا پردہ اٹھا دیا گیا۔ محبت کی کوئی کہانی تھی۔ کہانی محبت کی ہی ہوسکتی ہے۔ محبت ہی تو ایسی لاکھوں کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ اسٹیج پر ہیرو، ہیروئن سے وداع لے کر رخصت ہو رہا تھا کیونکہ اسے اپنے قصبے سے کہیں دور ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن ہیرو نہیں جانتا کہ راستے میں جو گھنا جنگل پڑتا ہے وہاں چھپے لٹیرے اس کی زندگی کی تاک میں ہیں۔ وہاں ہیروئن کی سوتیلی ماں اسے بحری جہاز کے ذریعے مزدوری کے لیے دور دراز کے شہر لندن بھیج رہی ہے۔

ہیروئن اس بات سے بے خبر ہے کہ اصل میں اس کی لالچی سوتیلی ماں نے بحری قزاقوں کے ہاتھ اس کا سودا کر دیا ہے۔ جو اسی بحری جہاز پر موجود ہیں جس میں اُسے سمندر پار جانا ہے۔ اسٹیج کا منظر لڑکے اور لڑکی کی آخری ملاقات کا منظر تھا۔ جس میں دونوں ہی اس بات سے بے خبر ہیں کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ایک سال کے بعد کی ملاقات کے وعدے کر رہے ہیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو جھوٹے دلاسے دے رہے ہیں۔ منظر میں جان بھرنے کے لیے دونوں اداکار جم کر اداکاری کر رہے تھے۔ ہدایت کاری اور مکالمے بھی زبردست تھے۔ پورے ہال پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ہیرو جنگل سے گزر رہا ہے۔ پس منظر میں ولیم ورڈز ورتھ کی مشہور نظم ''ایک برفیلی شام میں جنگل میں رکنا'' کے مکالمے گونج رہے ہیں۔

''یہ گھنا جنگل
یہ برفیلی شام
سب کس قدر دلفریب ہیں
لیکن مجھے تو اپنے وعدوں کا بھرم رکھنا ہے
اور سونے سے پہلے
میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔۔۔۔
اور سونے سے پہلے۔۔۔۔ میلوں کا سفر طے کرنا ہے۔''

میں نے شاید ساتویں جماعت میں ولیم ورڈز ورتھ کی "Stoping by woods in a snowy evening" پڑھی تھی۔ آج اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے اُس منظر کو حقیقت بنتے دیکھ رہا تھا۔ یہاں لٹیرے ہیرو پر حملہ آور ہوتے ہیں۔۔۔۔ وہاں بحری قزاق لڑکی پر بحری سفر کے دوران جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں ہیرو کے سینے میں خنجر گھونپ دیا جاتا ہے وہاں لڑکی قزاقوں سے بچنے کے لیے سمندر میں کود جاتی ہے۔ یہاں ہیرو مرتے مرتے لٹیروں سے التجا کرتا ہے کہ اس کی موت کے بارے میں لڑکی کو نہ بتایا جائے ورنہ وہ بھی مر جائے گی۔ وہاں لڑکی سمندر میں ڈوبنے سے پہلے قزاقوں سے چلا کر زاری کرتی ہے کہ لڑکے کو اس کی موت کی اطلاع نہ دی جائے ورنہ وہ بھی خودکشی کر لے گا۔ دو

محبت کرنے والے ایک بار پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ ہال میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ عورتوں کی تو باقاعدہ سسکیاں سناٹے میں سنائی دے رہی تھیں۔ پردہ گرنے کے بعد بھی بہت دیر تک سب لوگ مبہوت سے بیٹھے رہے۔ اور پھر اچانک ہی ہال تالیوں کی بے پناہ گونج سے دہل سا جاتا ہے۔ میں نے سارہ کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھوں کے گوشے بھی بھیگے ہوئے تھے۔

میں اور سارہ جب ہال سے باہر نکلے تو لندن برف کی سفید مخملی چادر سے ڈھک چکا تھا۔ پارکنگ میں کھڑی سارہ کی سفید فوکسی (بیٹل) زمین پر پڑی برف کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ جیسے شریر بچوں نے سنومین کی جگہ برف کی گاڑی بنا ڈالی ہو۔ جب تک ہم البرٹ ہال کی قریبی گلیوں سے نکل کر بڑی شاہراہ پر آئے تب تک لندن کی رات سو چکی تھی۔ سارے شہر پر جیسے کسی نے سفید بُرادہ چھڑک کر اس پر جادو کر ڈالا ہو۔ دُور کہیں ٹریفالگر اسکوائر کے گھنٹہ گھر نے رات کے بارہ بجنے کی نوید سنائی۔

ہماری گاڑی برف سے بھری سڑکوں پر پھسلتی جا رہی تھی۔ سارہ ابھی تک تھیٹر کے اثر میں تھی اور چُپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وِنڈ سکرین سے باہر دیکھ رہی تھی، میں خود بھی کھویا کھویا سا تھا، پھر سارہ نے ہلکے سے کہا۔

''مجھے ایسی محبتوں کا انجام ہمیشہ سے بہت اُداس کر دیتا ہے۔ پھر میں گھنٹوں یونہی گم صم سی رہتی ہوں۔''

''محبتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میرا جواب سُن کر اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''تم محبتوں کے بارے میں اتنی گہرائی سے کیسے جانتے ہو۔ اس دن تم نے محبت کے پہروں کو جب بیان کیا تھا تو میں بہت دن تک مما سے تمھارے محبت کے بارے میں خیالات پر بات کرتی رہی۔ پھر اس دن تم نے یک طرفہ محبت کی بات بھی کی اور اُسی کو محبت کی شام بنا لینے کا مشورہ بھی دیا۔ کوئی محبت کے بارے میں اتنی تفصیل سے کیسے جان سکتا ہے ۔۔۔ اس کے لیے تو اُسے ہزار محبتوں کے عذاب جھیلنا بھی کم پڑے ہوں گے۔''

''کبھی کبھی ایک محبت ہی ہزار محبتوں پر بھاری ہوتی ہے۔۔۔ ہزار محبتوں جیسا درد،

ہزار محبتوں جیسی خوشی اور تجربہ دے جاتی ہے۔''

سارہ نے غور سے میری طرف دیکھا۔

''گویا تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟''

''جانے کیوں کبھی کبھی یہ لفظ محبت مجھے بہت ناکافی معلوم ہوتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی تمھیں ایسا نہیں لگتا کہ ہمارے لفظوں کی وسعت اور ویکیبلری بہت محدود ہے۔ ہماری زبان، ہمارے لفظ اور ہماری لغت صرف ظاہری اور اوپری احساسات کو ہی بیان کر سکتے ہیں۔۔۔ بات صرف محبت، عشق اور جنون پر ہی آ کر کیوں ختم ہو جاتی ہے؟ جو جذبہ جنون اور دیوانگی سے بھی بڑھ جائے۔ اُس کے لیے کوئی دوسرا نام کیوں نہیں ہوتا ہمارے پاس؟

سارہ غور سے میری بات سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر عقیدت سی تھی۔ کچھ ضبط جیسے اندر ہی اندر کچھ مارنے کی کچھ دبانے کی کوشش کر رہی ہو۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ خوش نصیب جس کے لیے تمھارے جذبات، تمھارے لفظ کم پڑ جاتے ہیں، اس وقت کہاں ہے۔؟''

''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔۔۔۔''

سارہ کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ چھوٹتے چھوٹتے بچا، گاڑی برفیلی سڑک پر زور سے لہرائی سارہ مزید بوکھلا گئی۔ میں نے سیٹ کے ساتھ لگی ہینڈ بریک کھینچ دی۔ گاڑی اپنے ہی زور پر گھومی اور کچھ دیر گھسٹتی ہوئی دُور فٹ پاتھ کے ساتھ لگ کر رک گئی۔ سارہ نے اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ میں نے جلدی سے اُسے ہلایا۔

''تم ٹھیک ہو۔۔۔ معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔ مجھے تمھیں اس طرح سے نہیں بتانا چاہیے تھا یہ سب کچھ۔۔۔ غلطی میری ہی ہے۔''

سارہ نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''نہیں۔۔۔ تمھاری کوئی غلطی نہیں ہے۔۔۔۔ میں ہی تمھاری باتوں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اپنا اختیار کھو بیٹھی۔''

''تم کہو تو باقی راستہ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔''

سارہ نے کچھ نہیں کہا اور چُپ چاپ اسٹیئرنگ سائڈ سے اُتر کر میری طرف آ گئی۔

مَیں بھی دروازہ کھول کر اُس کی سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

مَیں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سارہ ابھی تک گم صم سی بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر وہ سامنے ونڈ سکرین میں سے باہر دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

''اتنا بڑا درد دل میں رکھ کر تم کیسے مسکرا لیتے ہو۔۔۔۔ کبھی کسی کو اپنے اندر کے زخم جھانک کر دیکھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔ تم سب سے الگ ہو۔۔۔۔ سب سے جُدا ہو۔۔۔۔ اس دُنیا کے نہیں ہو۔۔۔۔''

مَیں چُپ چاپ گاڑی چلاتا رہا۔ ویسٹ منسٹر برج سے کچھ پہلے پکاڈلی سے تیسری سڑک کے قریب سارہ نے مجھے گاڑی ایک بہت ہی کشادہ لیکن انجانی سی سڑک پر موڑنے کا کہا۔ مَیں نے بناء کچھ پوچھے گاڑی اس لمبی چوڑی سنسان سی سڑک پر موڑ دی۔ کچھ دُور چل کر سڑک کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا سا چوراہا تھا، اتنا بڑا کہ اس کے گرد گھومنے کے لیے گاڑی کا پورا اسٹیئرنگ گھمانا پڑتا تھا، یہیں سے سڑک چار حصوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ چوراہے کے اندر ایک بہت بڑا فوارہ لگا ہوا تھا جس میں سے پانی کی دھاریں سردی کی وجہ سے نکلتے نکلتے جم گئیں تھیں۔ چوراہے سے مُڑتے ہی سڑک کے آخر میں بنا یہودیوں کا ایک بہت ہی قدیم، سفید پتھر سے بنا ایک عظیم الشان چرچ سامنے آ گیا۔ چرچ کی سفید عمارت اس وقت برف سے اٹی ہوئی کسی پری کا محل لگ رہی تھی۔

مَیں نے گاڑی چرچ کے سامنے لے جا کر روک دی۔ چرچ کے دیو ہیکل چوبی دروازے پر حضرت موسیٰ کی ایک شبیہہ بنی ہوئی تھی اور دروازے کے دونوں اطراف بڑی بڑی سے مشعلیں جل رہی تھیں۔ سارہ گاڑی سے اُتر گئی۔۔۔۔ مَیں بھی نیچے اُتر آیا۔ سارہ نے میری جانب دیکھا۔

''یہ میری پسندیدہ عبادت گاہ ہے۔۔۔۔ مَیں صرف خاص موقعوں پر یہاں آتی ہوں۔ آج یوں آدھی رات کو یہاں آنے کا مقصد بھی بہت خاص ہے۔۔۔۔ مَیں تمھاری محبت کے لیے دُعا کرنے آئی ہوں، وہ ہستی جو آج تمھارے لفظوں میں تمھاری یادوں میں اور تمھارے احساس میں زندہ ہے مَیں اس کے لیے یہاں دُعا کرنے آئی ہوں۔''

مَیں گنگ سا وہیں کھڑا رہ گیا۔ سارہ نے قدم بڑھائے، پھر وہ پلٹ کر بولی۔

''تم اگر چاہو تو یہیں کچھ دیر میرا انتظار کر سکتے ہو، مَیں جلد ہی آ جاؤں گی۔''

سارہ میرے رُکے قدم دیکھ کر یہ سمجھی تھی کہ شاید مَیں یہودیوں کے چرچ کے اندر آنے سے ہچکچا رہا ہوں۔ سارہ آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے برف پر بنے اس کے قدموں کے نشانات پر چلتا ہوا اس چرچ کے اندر داخل ہو گیا۔ چرچ کے اندر اونچی اونچی دیواروں کے اندر بنے ہوئے طاقوں میں ہلکی ہلکی سی روشنیاں جل رہی تھیں۔ چرچ میں مدھم سی ایک خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ڈائس پر جہاں پادری کھڑا ہوتا ہے، وہاں لکڑی کے چوبارے پر بہت سی موم بتیاں رکھی جل رہی تھیں۔ سارہ لکڑی کے چوبی فرش پر چلتی ہوئی ایک خاص جگہ پر آ کر رک گئی۔ اور زیرِ لب توریت کی کچھ آیتیں پڑھنے لگی۔ مَیں چُپ چاپ دونوں اطراف پر لگی ہوئی لمبی لمبی بینچوں میں سے ایک پر کونے میں بیٹھ گیا۔ چرچ میں عجیب سا سکوت طاری تھا، اتنی خاموشی تھی کہ موم بتیوں کے جلنے سے پیدا ہونے والی آواز کی سرسراہٹ بھی گونج رہی تھی۔ سارہ ایک جذبے کے عالم میں کھڑی اپنے دُعائیہ کلمات پڑھ رہی تھی۔ ایک انجانی لڑکی ایمان کے لیے ہزاروں میل دُور اس تہوارات میں بھیگی پلکیں لیے دُعا کر رہی تھی۔

مَیں کچھ دیر یونہی سارہ کو سینے پر ہاتھ رکھے دُعا کرتا دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک جانے کیوں مجھے ایمان کی بے حد کمی محسوس ہوئی۔ اس احساس نے میرے دل کو جیسے ایک خنجر سے چیرنا شروع کر دیا کہ اب مَیں اس زندگی میں کبھی اس سے نہیں مل پاؤں گا۔ اور جانے کس وقت میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنا شروع ہو گئے اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا، سارہ دُعا ختم کر کے میری طرف پلٹی اور اس کی نظر میری برستی آنکھوں پر پڑ گئی۔

''ہے حماد۔۔۔۔ یہ کیا۔۔۔۔؟''

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی میری طرف بڑھی اور میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر اس نے اپنی نازک انگلیوں سے میرے آنسو پونچھ دیے۔ اور شاید یہی لمحہ ان آنسوؤں کے سیلاب کے بند کو توڑنے کا آخری بہانہ بن گیا۔ پھر میرا خود پر اختیار ہی نہیں رہا اور جانے کتنی دیر تک یہ نمکیں پانی اس کی نازک ہتھیلیوں کو بھگوتا رہا۔ مجھے تسلیاں دیتے دیتے وہ خود بھی نڈھال سی ہو گئی۔ پھر جیسے اُس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ ان تمام آنسوؤں کو بہہ جانے دے گی۔ اس نے میرا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور میری پلکوں سے گرتی شبنم اپنی آنکھوں میں

سموتی رہی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو اپنے دل کا غبار اس کے سامنے بیان کر دوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ میرے درد کو اپنا ہی درد سمجھتی ہے اور درد کا درماں بننا چاہتی ہے۔ میں نے شروع سے لے کر آخر تک تمام فسانہ سارہ کو سنا دیا۔ وہ چپ کر کے خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ مجھے تھپکتی رہی۔ کئی مقام پر مجھے ایسا لگا کہ وہ خود پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی لیکن اس بہادر لڑکی نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ شاید اُسے اس بات کا پوری طرح احساس تھا کہ اگر اس مرحلے پر اُس نے ذرا سی بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو پھر مجھے ٹوٹنے سے بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ میری بات ختم ہونے کے بعد وہ بہت دیر تک خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ اس کومل اور پھول کی پنکھڑی سی نازک لڑکی کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ لیکن اُس نے مجھ پر اپنے اندر کے طوفان ظاہر نہیں ہونے دیے۔ کبھی کبھی لفظوں سے زیادہ دو انسانوں کے بیچ کی خاموشی، مضبوط اور زود اثر مرہم ثابت ہوتی ہے۔ اُس وقت وہی خاموشی ہم دونوں کے درمیان، باتوں کا کام دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ میرا ہاتھ تھامے بیٹھی رہی اور اپنے لفظ اپنا مرہم، اپنے نرم لمس کے ذریعے میرے ہاتھوں میں اور میری روح میں منتقل کرتی رہی۔ چرچ کے بڑے بڑے روشن دانوں اور کھڑکیوں سے صبح کی سفیدی جھلکنے لگی تھی اور جب ہم چرچ سے باہر نکلے، سحر کے سپیدے اور برف کی چادر کی سفیدی نے ہماری آنکھیں چندھیا سی دیں۔ برف پر ابھی تک میرے اور سارہ کے اندر جاتے قدموں کے نشان واضح تھے۔ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیسا جادو ہوتا ہے۔ شاید اسی سحر کے زور میں، میں نے رات کو سارہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اب صبح ہوتے ہی میں اپنی رات کی حالت پر اس کے سامنے شرمندہ سا تھا۔ کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن سارہ نے جیسے اس دن میرا بھرم قائم رکھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس نے میری طرف دانستہ دیکھنے سے گریز کیا۔ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کرتی رہی۔ پہلے اُس نے مجھے میرے اپارٹمنٹ پر ڈراپ کیا۔ لندن ابھی تک بے خبر سو رہا تھا، میں گاڑی سے اُترا تو میرے قریب سے گزرتے دودھ کی بوتلیں پہنچانے والے کی سائیکل گھنٹی بجاتی گزری۔ اُس نے اپنی پی کیپ اٹھا کر چلتے چلتے مجھے انگریزی سلام کیا۔ اور مسکرا کر سارہ کی طرف دیکھا۔ سارہ اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر

جھینپ سی گئی۔

میں نے سارہ کی طرف دیکھا وہ ابھی تک اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ میں نے سائڈ والی کھڑکی میں جھک کر اُسے کہا۔

''میں شکریہ جیسے چھوٹے لفظ ادا کر کے تمھارے انمول احساسات کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ میں اس رات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

سارہ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''شکریہ ادا کرنے کی کوئی بات ہے بھی نہیں۔۔۔۔ یقین جانو۔۔۔۔ میں نے ہمیشہ ہی تمھیں دوسروں سے بہت مختلف سمجھا ہے۔۔۔۔ اور گزری ہوئی رات کے بعد تمھاری عزت میرے دل میں اپنی آخری حد تک بڑھ گئی ہے۔۔۔۔ یاد رکھو۔۔۔۔ جب بھی تمھیں میری ضرورت ہوگی۔۔۔۔ تم ہمیشہ آواز دینے سے پہلے مجھے اپنے سامنے پاؤ گے۔''

''میں جانتا ہوں ایسا ہی ہوگا۔ اور یہ احساس میرے لیے ہمیشہ بہت قیمتی رہے گا۔''

مجھے سارہ نے شام کو لائبریری سے واپسی پر آتے ہوئے تھیٹر کے لیے لیا تھا۔ میرا بیگ جس میں میرے نوٹس تھے اَب بھی اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے کل شام ہی اپنا ٹرم پیپر مکمل کر لیا تھا۔ میں نے بیگ سے اپنے ٹرم پیپر کے تمام نوٹس نکالے جس پر میری دو مہینے کی محنت میری تحقیق لفظوں کی صورت میں بکھری ہوئی تھی۔ میں نے ٹرم پیپر کی پوری فائل سارہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا ٹرم پیپر ہے۔ اس میں میری تمام تحقیق موجود ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنے پاس رکھو۔ اور اگر کسی بھی وجہ سے میں اسے یونیورسٹی میں جمع نہ کروا سکوں تو میری جگہ تم اسے لائبریری ریکارڈ کا حصہ بنوانے کے لیے جمع کروا دینا۔''

سارہ نے حیرت سے فائل کے صفحے پلٹے۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔ مجھے اسے اپنے پاس رکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں اسے خود چل کر جمع کروائیں گے۔ بلکہ میں پاپا کو اس بات کے لیے بھی مجبور کروں گی کہ وہ تمھیں تمھارا ٹرم پیپر پوری یونیورسٹی کے سامنے فائنل تقریب میں خود پڑھنے دیں۔ تمھیں اپنا نظریہ سب کے سامنے پیش کرنے کا پورا حق ہے۔''

مَیں نے اس موقعے پر اُسے پیٹر والی بات بتا کر پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ہلکے سے اس کے ریشمی بال بکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔ مَیں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مَیں اپنی سُنسان گلی کے آخری کونے تک اس کی گاڑی کو مڑتے ہوئے دیکھنے کے لیے کھڑا رہا۔ اوپر آیا تو کامران جاگ چکا تھا اور اپنے کاروبار پر جانے کی تیاری میں تھا۔ اُس نے کافی کا مگ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''آ گیا میرا شہزادہ ساری رات آوارہ گردی کرنے کے بعد۔ مَیں نے تمھیں منع بھی کیا تھا نا کہ اس یہودی حسینہ سے دُور ہی رہنا۔ لیکن لگتا ہے میرے مشورے کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ پہلے تو صرف دن ہی اس کی زلفوں تلے بسر ہوتا تھا۔ اب راتیں بھی انھی کے ساتھ مٹرگشت کرتے ہوئے گزرتی ہیں۔ یار میڈی۔۔۔۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ اس کا باپ بڑا کائیاں آدمی ہے۔ جانے اب تک تمھیں یونیورسٹی میں کس دل سے برداشت کر رہا ہے؟''

شاید کامران نے کھڑکی سے مجھے سارہ کی کار سے اُترتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے اُسے کل یونیورسٹی میں جوزف کی طرف سے دی ہوئی پیٹر والی شکایت کی خبر سنائی۔ کامران نے زیرِ لب ان یہودیوں کی شان میں کچھ کہا اور پھر مجھ پر بھی بگڑتے ہوئے کہنے لگا۔

''اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان لوگوں سے پنگا نہ لینا۔ تم یہاں کے قانون سے خود اچھی طرح واقف ہو۔ اس لائبریرین پیٹر کی شکایت پر تمھیں انگلینڈ سے ڈی۔ پورٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کی ہر بڑی انڈسٹری میں انھی یہودیوں کا پیسہ لگا ہوا ہے۔ قانون بھی انھی کا ساتھ دے گا۔ اور پھر 9/11 نائن الیون کے بعد تو ہر مسلمان پہلے ہی ان کی نظر میں ایک دہشت گرد ہے۔ صرف کسی شکایت کی ضرورت ہے۔ انھیں لیبل چسپاں کرنے میں ذرا دیر نہیں لگتی۔ جانے کتنے لوگوں کو تو یہ صرف شبہے میں ہی ملک بدر کر چکے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا اس ٹرم پیپر کی آخر ایسی کیا اہمیت ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ ''ہالوکاسٹ'' کا واقعہ ہوا تھا تو کہنے دو۔ ہماری بلا سے تمھیں کون سے میڈل مل جائیں گے اس حقیقت سے انکار کرنے پر۔ اور پھر سننے والے تو خود وہ ہیں جنھوں نے یہ مفروضہ گھڑا ہوا ہے۔ کون تمھارے ٹرم پیپر پر اور تمھاری تحقیق پر یقین کرے گا؟''

مَیں نے کامران کی طرف دیکھا۔

''کوئی اور یقین کرے نہ کرے۔۔۔۔ مجھے خود تو یقین ہے اپنی بات پر، اپنے سچ پر، اور پھر وہ سب بھی جانتے ہیں کہ سچ کیا ہے۔ بس کسی نے ہمت نہیں کی آج تک ان کے سامنے سچ بولنے کی، لیکن مَیں یہ سچ ان کے سامنے لا کر رہوں گا پوری یونیورسٹی میں اگر ایک بھی طالب علم نے میری بات کا یقین کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اور میری محنت رنگ لے آئی۔ چاہے اس کے بعد وہ لوگ میرا ٹرم پیپر جلا دیں اور مجھے اس ملک سے ہمیشہ کے لیے ملک بدر کر دیں۔''

کامران جھنجلا سا گیا۔

''لیکن اس جدوجہد کا فائدہ۔۔۔۔ یہ سب تم کس کے لیے کر رہے ہو۔ اس تحقیق کا اور تمھارے اس سچ کا کوئی مقصد بھی تو ہونا چاہیے۔''

مجھے کامران کی بات پر غصہ آ گیا۔

''تو کیا جو کچھ مَیں نے ابھی تمھیں بتایا، تمھیں اس میں کوئی مقصدیت نظر نہیں آتی؟ اور اگر اس سچ کا تمھیں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا کہ یہ نئی نسل ان یہودیوں کے اس جھوٹ کو جان لے تو پھر میرا ایک اور مقصد بھی سن لو۔ جو اس مقصد سے کہیں بڑا ہے۔ ''ہالوکاسٹ'' کا یہ تمام پروپیگنڈا یہودیوں نے صرف اور صرف فلسطین کی سرزمین پر اپنی ایک آزاد ریاست بنانے کا خواب پورا کرنے کے لیے کیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی اس ڈرامے کو اسٹیج کرنے کی پوری تیاری کر لی گئی تھی۔ اس وقت چندہ جمع کرنے کی عظیم الشان مہم شروع کر دی گئی تھی۔ امریکہ، برطانیہ اور روس نے جرمن قوم کو برباد کرنے کے لیے یہودیوں کو غداری پر آمادہ کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زخم خوردہ جرمن قوم پلٹ کر ان پر وار ضرور کرے گی۔ وہ جرمنوں کو ہٹلر کی قیادت میں یکجا ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اور ہٹلر کے عزائم بھی اس کی جنگی تیاریوں سے بالکل واضح تھے۔ اسی لیے انھوں نے یہودیوں کو قبلہ اوّل پر قبضے کا خواب دکھایا اور اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ان کی پوری مدد کرنے کا یقین بھی دلایا۔ ''ہالوکاسٹ'' کا الزام تو ہٹلر اور جرمنوں پر دوسری جنگ عظیم کے بعد لگایا گیا تھا۔ لیکن اس کی قیمت فلسطین کے مسلمانوں نے یہودی بستیوں اور پھر اسرائیل کی صورت میں چکائی۔ اگر ہٹلر ''ہالوکاسٹ'' کا ذمے دار تھا بھی تو یہودی اس بہانے فلسطین کے مسلمانوں پر کیوں ٹوٹ پڑے۔۔۔۔؟ اور

سچ یہی ہے کہ ''ہالوکاسٹ'' میں پچاس لاکھ سے ساٹھ لاکھ تک یہودیوں کے مارے جانے کی کہانی صرف اور صرف مفروضہ ہی ہے۔ اتنے بڑے اور اتنے وسیع پیمانے پر گیس چیمبرز کا بنایا جانا ہی ممکن نہیں تھا۔ جن گیس چیمبرز پر یہودی ''یہودی قاتل گیس چیمبرز'' ہونے کا الزام لگاتے ہیں وہ صرف جرمن فوجیوں کی لاشوں کو جنگ کے دوران ٹھکانے لگانے کے لیے بنائے گئے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ان چیمبرز کو بھی ٹھیک طرح سے چلانے کے لیے جرمنوں کے پاس پورا ایندھن موجود نہیں ہوتا تھا۔ جرمن پہلے ہی اپنا سب کچھ جنگ میں جھونک چکے تھے۔ ان گیس چیمبروں میں جھونکنے کے لیے ان کے پاس کوئلہ تک کافی مقدار میں نہیں بچا تھا۔ یہ صرف اور صرف ایک صیہونی تحریک ہے جس کا مقصد اپنے مفاد کے لیے ہلاکتوں کی تعداد میں زبردست مبالغہ چاہتی ہے۔ تاکہ خود کو مظلوم ثابت کرنے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جا سکیں۔ یاد رکھو، جس قدر یہ لوگ اس مبالغہ آرائی میں کامیاب ہوں گے، فلسطین کے مسلمان اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت چکائیں گے۔ یہ تحریک صرف معاشی فائدہ اور مسلمانوں کی زمین حاصل کرنے کے لیے چلائی گئی تھی اور یہودی اس تحریک میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ لوگ ان کے جھوٹ کو سچ سمجھتے ہیں اور ہمارا سچ بھی انہیں جھوٹ لگتا ہے۔ آخر کسی کو تو پہل کرنی ہی تھی۔ یاد رکھو، ہمارا زوال اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن ہم نے خود کو صرف مسلمان سمجھنے کے بجائے فلسطینی، مصری عرب اور پاکستانی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر اُس دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والا یہودی کا فائدہ، دُنیا کے دوسرے کونے میں بیٹھے کسی بھی یہودی کا فائدہ ہو سکتا ہے تو پھر دنیا کے کسی بھی مسلمان کا نقصان میرا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ تمہارا نقصان کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔؟''

کامران چُپ چاپ ایک ہی جگہ کھڑا میری ساری تقریر سنتا رہا۔۔۔۔ میں بھی تھک کر وہیں صوفے پر ڈھے سا گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اپنے کاندھے پر کامران کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، میں نے نظر اٹھا کر اُسے دیکھا، اس نے میرا بازو کھینچ کر مجھے کھڑا کر دیا اور گلے سے لگا لیا۔

''ہر دفعہ، ہر بازی تم اکیلے ہی کیوں مار جاتے ہو۔۔۔۔ بچپن سے ہر مرتبہ تم سے ہارتا آیا ہوں۔ لیکن جتنا مزہ آج اس ہار میں آیا ہے۔ پہلے کبھی نہیں آیا، اگر مقصد اتنا بڑا ہے اور

کوشش ہر مسلمان کے دل میں اس نقصان کے احساس کو جگانا ہے تو پھر اس کے لیے کوئی بھی قربانی بہت ہی چھوٹی ہو گی۔ میری ناسمجھ سوچ اتنی آگے کہاں سوچ سکتی تھی۔''

''میں کبھی بھی اپنے ایمان کی کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکا۔ نہ ہی کبھی میں نے کامل مومن ہونے کا کبھی سپنا ہی دیکھا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں، ان یہودیوں کے بیچ رہ کر مجھے احساس ہوا کہ ضرور ہم میں کوئی خاص بات ہے۔ یہ آخر ہم سے اس قدر خوف زدہ، اس قدر ناراض کیوں رہتے ہیں۔ اسی اپنی خاص بات کی کھوج نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ دُعا کرنا کہ میرے قدم آگے کہیں لڑکھڑا نہ جائیں۔ میں بارش کا پہلا قطرہ ہی سہی۔۔۔۔ لیکن برسوں گا ضرور۔۔۔۔ شاید میرے بعد ہی سہی۔۔۔۔ کچھ قطرے اور برس جائیں۔۔۔۔ شاید چند بوندیں ہی سہی۔۔۔۔ پر ہمارے دلوں پر صدیوں کا لگا زنگ کچھ حد تک ہی دھل جائے۔''

کامران نے مجھے تھپکتے ہوئے کہا اور اس کی آواز رندھ سی گئی تھی۔

''ضرور دُھلے گا یہ زنگ۔ کیسے نہیں دُھلے گا ہمارے دلوں پر لگا یہ زنگ۔۔۔۔''

جب برسنے والی بوندیں ایسے آبِ زم زم کی ہوں گی۔ کون سا زنگ ہے جو اس آبِ حیات کے آگے ٹھہر سکے۔''

کامران مجھے تھپکتا رہا۔۔۔۔ ہم دونوں نے ہمیشہ زندگی بہت لاأبالی انداز میں گزاری تھی۔ لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ کہیں نہ کہیں آج کوئی بات ہم دونوں ہی کے دلوں کو چُھو گئی ہے۔ شاید زندگی ایسے ہی موڑ بدلتی ہے۔ شاید دلوں کے انقلاب اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔ شاید ہم سبھی کے دلوں پر لگا یہ زنگ کسی آبِ زم زم کی تلاش میں جما رہتا ہے۔ شاید ہم سب کے دل ہی بہت زمانے سے قلعی چاہتے ہیں۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ کبھی کبھی نیند بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ دل کے ہر زنگ پر وقتی طور کے لیے پردہ ڈال دیتی ہے۔ انسان کو خود سے بھی نظر چُرانے کا ایک موقع فراہم کر دیتی ہے۔

OO

پہلی بازی

دوسرے دن صبح جب مَیں یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہوا تبھی مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ آج فضا کچھ بدلی بدلی سی ہے۔ سب سے پہلے مجھے جم (Jim) نظر آیا، مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر بولا۔

''ہے میڈی۔۔۔۔تم فکر مت کرنا مین Man۔۔۔۔ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔ پوری یونیورسٹی کو ہلا کر رکھ دیں گے۔''

کچھ دیر میں ہی کلاس کے باقی طلبا بھی میرے گرد بھیڑ کی صورت میں جمع ہو گئے، سب ہی اپنی اپنی بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ سبھی میرے ساتھ ہونے کا اور ساتھ دینے کا وعدہ کر رہے تھے۔ مَیں کچھ سمجھا اور کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اتنی دیر میں میرا نام اسپیکر پر پکارا جانے لگا۔ ڈین آئزک کے کمرے میں میری طلبی کی جارہی تھی۔ مَیں آئزک کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر کمرے میں گھستے ہی سب سے پہلے میری نظر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری کے انچارج پیٹر پر پڑی۔ جس کے ہونٹوں پر مجھے دیکھتے ہی ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اس وقت صرف سر آئزک ہی موجود تھے۔

''آؤ حماد۔۔۔۔ مجھے اُمید ہے تم نے آج یونیورسٹی آنے کے بعد نوٹس بورڈ پر لگا اپنے خلاف نوٹس سب سے پہلے پڑھا ہوگا۔''

اوہ۔۔تو یہ بھیڑ جو باہر میرے گرد جمع تھی وہ اس نوٹس کی وجہ سے تھی۔

''نہیں سر۔۔۔۔مَیں ابھی پہنچا ہی ہوں۔۔۔۔آپ ہی مجھے کچھ بتایئے اس نوٹس کے بارے میں۔''

''اس سے پہلے مَیں تم سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہوں گا۔ اگر تم کسی تعلیمی ادارے کے انتظامی سربراہ ہوتے اور تمھارے علم میں یہ بات آتی کہ تمھارے زیرِ انتظام تعلیمی

ادارے میں کچھ طالب علم مذہبی سیاست کو ہوا دینے کا باعث بن رہے ہیں، جس کی وجہ سے شہر میں بھی بے چینی پھیل رہی ہے۔ تو تم ایسی صورت میں کیا کرتے۔''

''مَیں پوری چھان بین کرتا اور میرٹ اور حق پر فیصلہ کرتا۔ آپ سے بھی مجھے انصاف ہی کی توقع ہے کیونکہ آپ کو بحیثیتِ سربراہ پوری تحقیق کا فرض بھی سونپا گیا ہے اور مَیں جانتا ہوں کہ آپ ایک فرض شناس استاد بھی ہیں۔ آپ کا فرض انصاف ہے۔'' سر آئزک نے غور سے میری طرف دیکھا جیسے میرے چہرے پر طنز یا تلخی کی کوئی جھلک ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر سر جھٹک کر بولا۔

''کیا تم مسٹر پیٹر سے پہلے بھی مل چکے ہو۔''

''جی ہاں۔۔۔۔ اکثر سنٹرل اسکوائر کی لائبریری جاتا ہوں۔ وہاں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔''

''کیا تم 13 جنوری کی شام بھی سنٹرل اسکوائر لائبریری گئے تھے؟''

''جی ہاں۔۔۔ مجھے دو مقالے چاہیے تھے جن سے میرے ٹرم پیپر کی تکمیل میں مجھے کافی مدد مل سکتی تھی مَیں وہی لینے گیا تھا۔''

''مسٹر پیٹر نے تمھارے خلاف تحریری شکایت جمع کروائی ہے کہ 13 جنوری کی شام تم نے انہیں کچھ خاص کتابیں جاری نہ کرنے پر مذہبی طور پر ہراساں کیا تھا اور انہیں نتائج بھگتنے دھمکیاں بھی دیں جس کی وجہ سے یہ اپنی زندگی خطرے میں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے ازراہِ کرم ابھی تک لندن پولیس اور انتظامیہ کو اس واقعے سے آگاہ نہیں کیا کیونکہ یہ یونیورسٹی کی بدنامی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے یہ پہلے میرے پاس آئے ہیں تاکہ انہیں انصاف فراہم کیا جائے۔ تمھارا اس بارے میں کیا کہنا ہے۔''

''یہ سب جھوٹ ہے۔ میں نے انہیں کبھی ہراساں نہیں کیا نہ ہی کبھی دھمکانے کی کوشش کی ہے۔''

''تمھارے پاس اپنی بے گناہی کا کوئی ثبوت ہے۔''

''بے گناہی کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ثبوت الزام لگانے والے کو دینا پڑتے ہیں سر۔۔۔۔''

سر آئزک نے میری بات سُن کر اپنی عینک کے باریک شیشوں کے پیچھے سے مجھے غور سے جھانکا۔ جیسے وہ میرے اعتماد کا جائزہ لینا چاہتے ہوں۔

''ٹھیک ہے، تمھاری بات میں وزن ہے۔ لیکن آخر مسٹر پیٹر کی تم سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ آخر وہ بلاوجہ ایسا الزام کیوں لگائیں گے تم پر۔۔۔۔۔؟''

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت بھی پیش کریں۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔۔تم اپنا تحریری جواب بھی جمع کروادو۔۔۔۔اور یاد رکھو کہ یہ معاملہ پولیس تک جانا نہیں چاہیے۔ یونیورسٹی انتظامیہ اس سے پہلے ہی معاملہ صاف کرنا چاہتی ہے۔ یونیورسٹی کے قانون کے مطابق کسی بھی طالب علم کے کسی پولیس کیس میں ملوث ہونے کی صورت میں اُسے ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔''

''جی۔۔۔۔مَیں جانتا ہوں۔۔۔۔لیکن اُسی قانون کی ایک شق یہ بھی ہے کہ پہلے طالب علم پر کیس ثابت ہونا بھی ضروری ہے۔ مَیں اپنا جواب جمع کروادوں گا۔ شکریہ۔''

مَیں کمرے سے باہر نکل آیا اور سب سے پہلی نظر میری سارہ پر ہی پڑی۔ وہ تیزی سے ڈین کی کمرے کی طرف ہی آرہی تھی۔ شاید وہ ابھی یونیورسٹی آئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔

''حماد۔۔۔۔یہ سب مَیں کیا سن رہی ہوں۔۔۔۔یہ کون سا نیا ڈرامہ رچایا ہے یونیورسٹی والوں نے۔''

''میں نے اُسے مختصراً پیٹر کی شکایت اور لائبریری کے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔۔۔۔وہ حیرت سے میری ساری بات سنتی رہی۔ پھر چونک کر اُس نے مجھ سے جلدی سے پوچھا۔''تم نے لائبریرین کا کیا نام بتایا۔''

''پیٹر۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔پیٹر۔۔۔۔پیٹر گورین تھامس یہ تو پاپا کا بہت پرانا واقف ہے۔۔۔۔کئی سالوں سے تہواروں پر اس کا ہمارے گھر آنا جانا ہے۔''

میرے ذہن میں ایک ساتھ ہی کئی جھماکے ہوئے۔ اس کا مطلب ہے کہ سر آئزک

ابھی تک جم والے معاملے میں میرے ہاتھوں ہونے والی ہزیمت کو بھولے نہیں تھے۔ یہ سارا منصوبہ انہی کا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ میری شخصیت کو بھی انتظامیہ کے لیے متنازعہ بنا دیا تھا اور میرے یونیورسٹی سے نکالے جانے کی صورت میں میرا ٹرم پیپر جو پہلے دن سے ان کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ اس سے بھی ان کی جان ہمیشہ کے لیے چھوٹ جاتی، سارہ بھی ساری صورت حال سمجھ چکی تھی۔ وہ دانت پیستی ہوئی سر آئزک کے کمرے کی طرف بڑھی، لیکن مَیں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں۔۔۔۔میں نہیں چاہتا کہ ایک بار پھر میری وجہ سے ایک بیٹی، ایک باپ کے سامنے کھڑی ہو جائے۔ اس سے ان کی انا کو مزید چوٹ لگے گی۔''

سارہ نے حیرت اور غصے سے میری طرف دیکھا۔

''تم اب بھی انہی کی انا اور انہی کے رشتوں کے بارے میں سوچ رہے ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمھیں اس یونیورسٹی سے اور شاید اس شہر سے بھی بدر کرنے کی تاک میں ہیں۔''

''مَیں جانتا ہوں۔۔۔۔اس بار ان کا وار۔۔۔۔بڑا گھائل کر دینے والا ہے۔ لیکن میں شدید زخمی ہو کر بھی دشمن پر غلط وار کرنا پسند نہیں کرتا۔ وہ عقل اور تدبیر کی جنگ قانونی طریقے سے لڑ رہے ہیں۔ مَیں بھی ان سے ان کے ہی انداز میں لڑوں گا۔''

سارہ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

''صرف تم نہیں۔۔۔۔ہم۔۔۔۔ہم دونوں مل کر یہ جنگ لڑیں گے۔''مَیں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''راستہ بہت طویل، کٹھن اور کانٹوں بھرا ہے۔''

''میں پاؤں کے چھالے گننے سے نہیں ڈرتی، ویسے بھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ گنتی پر نظر رکھنے والے سوداگر ہوتے ہیں اور مَیں نے سودا کرنا نہیں سیکھا۔''

اس وقت اس کے لہجے میں اور آنکھوں میں ایک ایسا عزم تھا کہ جس کے آگے پہاڑ بھی بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سلیقے سے سنورے بال بکھیر دیے۔ وہ مسکرا دی۔ اسی لمحے سر آئزک پیٹر کو الوداع کہنے کے لیے دروازے میں آئے اور

انہوں نے سارہ کے بکھرے بال اور اس کا میری طرف دیکھ کر مسکرانا دیکھا۔ اک لمحے کو ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا لیکن انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانا خوب سیکھ رکھا تھا۔ انہوں نے پیٹر کو الوداع کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ پیٹر سارہ سے نظر چُراتا ہُوا دوسری جانب سے نکل گیا۔

اگر بابا کو پتہ چلتا کہ میرے ٹرم پیپر نے پورے لندن کے یہودیوں کو کس مشکل میں ڈال دیا ہے تو جانے وہ کیا سوچتے۔ ہمارے گھر میں مذہب کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ ہمارے گھر میں پانچ وقت کی نماز تو دور کی بات ہے جمعہ اور عید پر بھی برائے نام اور دکھاوے کے لیے عید گاہ جانے کا رواج تھا۔ قرآن کو ہمارے ہاں صرف اُونچے طاق پر سجا کر رکھنے کی ایک کتاب سمجھا جاتا تھا۔ آخری مرتبہ شاید اُسے میری بڑی بہن کی رخصتی کے وقت اس کے سر پر رکھنے کے لیے اس طاق سے اُتارا گیا تھا۔

مجھے اپنے لڑکپن کی ایک بات ہمیشہ یاد رہے گی۔ جب میں پندرہ سولہ سال کا تھا، ٹھیک آج سے قریباً دس سال پہلے، تب میری کلاس کی ایک ہندو لڑکی کامنی پر میرا دل آ گیا تھا۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آ گئی تھی، شاید میری سالگرہ کا دن تھا۔ اس وقت ہمارے گھر روز پڑھانے کے لیے آنے والے مولانا صاحب آئے ہوئے تھے جنھوں نے عصر کے وقت ہمیں زبردستی وضو کروا کر اپنے ساتھ نماز کے لیے کھڑا کر رکھا تھا۔ جیسے ہی میری نظر کامنی پر پڑی، میں نے جلدی سے نماز توڑ دی تھی تاکہ کامنی کو یہ نہ پتہ چلے کہ مَیں نماز بھی پڑھتا ہوں۔ صرف کامنی پر ہی کیا منحصر تھا میں اب تک بھی اپنی کسی لڑکی دوست کے سامنے نماز پڑھنے سے کتراتا تھا۔ پتہ نہیں میرے دل میں ایک عجیب سی جھجک تھی کہ مجھے اپنی گرل فرینڈز کے سامنے نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس سے میرا تاثر ان کی نظر میں خراب ہو جائے گا۔

اس دن جب مَیں نے بابا کو کامنی کے آنے اور میرا اپنی نماز توڑ کر بھاگ کر بڑے کمرے میں چُھپ جانے کا واقعہ سنایا تو وہ بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔

اس دن جب پیٹر یونیورسٹی آیا تھا، مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ طلبا کی بہت بڑی تعداد اب خود میرا ٹرم پیپر سننا چاہتی تھی، پڑھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ انتظامیہ کے پے در پے اقدامات

نے جو وہ میرے خلاف کر رہی تھی۔ ان سب میں تجسس کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ وہ بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ آخر ایک معمولی اور عام طور پر یونیورسٹی کی لائبریری کے طاقوں میں مٹی اور گرد کے نظر ہو جانے والے اس ٹرم پیپر میں، مَیں آخر کیا بات لکھنا اور کہنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے آئے دن مجھے گھیرنے کے لیے نت نئے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ اور یہی سر آئزک کی بنیادی غلطی تھی۔ انہوں نے طلباء کے اس تجسس کو ہَوا دے دی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ اگر مجھے روزمرہ کے معمول کی طرح خود اپنا ٹرم پیپر پڑھنے اور پیش کرنے کی اجازت دی جاتی تو شاید وہ متنازعہ تو ضرور ثابت ہوتا لیکن اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو اب بن پڑھے اور پیش کیے ہی دھیرے دھیرے طلبا کے ذہن پر ہو رہا تھا۔

اسی شام جب مَیں نہر کے کنارے اپنے پسندیدہ بینچ پر بیٹھا سامنے نہر میں تیرتے پرندوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ربیکا شاید مجھے ڈھونڈتے ہوئے ہی وہاں آ نکلی، دُور سے اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ میری طرف چلی آئی۔ کالے اسکرٹ پر اس نے سفید پھولوں والی بہت خوبصورت سی قمیض پہن رکھی تھی اور اس لباس میں وہ خود بھی کوئی پھول ہی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجھی سوجھی سی تھیں۔ جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے، پھر وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا میں تم سے معافی مانگنے کا حق اب بھی رکھتی ہوں؟“

مَیں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

”دوست ہر حق رکھتے ہیں، سوائے معافی مانگنے کے حق کے، یہ حق انہیں کبھی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دوستی میں اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ دوست کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا تو پھر معافی کیسی؟“

”نہیں ۔۔۔ غلطی تو میری بہت بڑی تھی ۔۔۔ لیکن میں جانتی تھی کہ میڈی کا ظرف کتنا بڑا ہے اور وہ آگے سے مجھے میری معذرت کا کیا جواب دے گا۔“

”جانے دو ان باتوں کو ۔۔۔ اتنے دنوں کے بعد بات کی ہے تو کچھ اور کہو۔“

”نہیں ۔۔۔ مجھے کہہ لینے دو ۔۔۔ ورنہ یہ کانٹا میری روح میں ہمیشہ چُبھا ہی رہے گا۔ اس دن جب تم نے مجھے یہ کہا تھا کہ کوئی پہلے سے تمہارے دل و جان پر قابض ہے تو مجھے

شدید دکھ، شدید جلن کا احساس ہوا تھا۔ مَیں یہ سمجھتی تھی کہ تمھارے جذبات سارہ کے لیے ہیں۔ اورمَیں سارہ سے بھی شدید ناراض ہوگئی تھی۔ لیکن کل سارہ نے جب زبردستی یہیں اسی نہر کے کنارے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب بٹھالیا اور اُس نے مجھے ایمان کے بارے میں بتایا تو یقین کرو مَیں شرم اور ندامت سے خود سے بھی نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ میری محبت تو بہت سطحی نکلی میڈی۔۔۔ اصل میں تو محبت تم نے کی ہے۔۔۔ ہم سب کو ایسی محبت کے پہلے پہر کے بھی حق دار نہیں ہو سکتے۔ مجھ جیسے کم حوصلہ اور کم ظرف محبت کی شام تک بھلا کیسے پہنچ پائیں گے۔''

وہ سر جھکا کر بیٹھی دھیرے دھیرے بولتی رہی۔ دل کا غبار اپنے آنسوؤں سے دھوتی رہی۔ مَیں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا۔

''ایسا نہیں ہے ربی۔ تم تو ایک لمحے میں ہی محبت کے تینوں پہر پھلانگ کر محبت کی شام میں پہنچ گئی ہو۔ ورنہ آج اس وقت یوں اس طرح میرے پاس بیٹھ کر یہ سارے اعتراف نہیں کر رہی ہوتیں۔ اصل میں تو تم ہی محبت کی اس شام کی حق دار ہو۔ ٹھنڈی اور میٹھی محبت کی شام۔۔۔ جو اس وقت تمھارے آس پاس ہی کہیں منڈلا رہی ہے۔''

ربیکا رو پڑی۔

''نہیں حماد۔۔۔ ایسا نہیں ہے۔۔۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا دل درد سے یوں کٹ نہ رہا ہوتا، مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ دل اب بھی یوں نہ تڑپ رہا ہوتا۔ مَیں تمھارے سامنے بیٹھی یوں کم ظرفوں کی طرح آنسو نہ بہا رہی ہوتی۔ میں تو اتنی ناشکری ہوں کہ مَیں تمھاری انمول دوستی کی قدر بھی نہیں کی۔ تمھاری محبت پانے کی خواہش میں اس دوستی کو بھی رد کرتی رہی تم مجھے اس بات کے لیے کبھی معاف مت کرنا۔۔۔ کبھی مجھ پر رحم نہ کھانا۔''

وہ بولتے بولتے بلک پڑی۔ مَیں نے اس کا سر اپنے شانے سے لگالیا۔ اور اسے کھل کر رونے دیا۔ محبت کا کانٹا جب جسم میں چبھ جائے تو اس کا زہر بدن سے صرف اور صرف آنسوؤں کی صورت میں ہی نکالا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ اس زہریلی محبت کا ذائقہ بھی نمکین ہی ہوتا ہوگا۔

دوسرے دن مجھے پتہ چلا کہ پیٹر نے اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر لائبریری ہی

کے دو ماتحتوں کو بیان دینے کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ وہ دونوں بھی یہودی ہی تھے۔ یونیورسٹی نے عارضی طور پر مجھے کلاسیں لینے سے منع کر دیا تھا کیونکہ وہ انکوائری مکمل ہونے تک مزید کسی بڑے ''ہنگامے'' سے بچنا چاہتے تھے۔

یونیورسٹی میں جب یہ خبر پھیلی تو میری ساری کلاس باہر نکل آئی۔ طلبا نے میرے حق میں نعرے بازی شروع کر دی، انہوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے کارڈ اور بینر اُٹھا لیے جن پر ''انصاف۔۔۔ انصاف۔۔۔ انصاف'' لکھا ہوا تھا۔ طلباء کی قیادت ربیکا اور جم کر رہے تھے۔ جم خاصا مشتعل تھا اور اس نے انتظامیہ کو دھمکی دے دی تھی کہ اگر مجھے کلاس لینے کی فوری اجازت نہ دی گئی تو وہ تمام طلبا کو لے کر باہر سڑک پر نکل جائے گا اور یہ ہڑتال پورے شہر کی تعلیمی درس گاہوں تک پھیلا دی جائے گی۔ یونیورسٹی کا میدان، نہر کنارے، راہداریوں اور چھتوں پر ہر جانب اسٹوڈنٹس ہی دکھائی دے رہے تھے۔ مَیں جب کلاس سے نکل کر باہر آیا تو ان سب کے نعروں میں شدت آ گئی۔ ان سب کو ایک اجنبی لڑکے کے لیے اس طرح لڑتے دیکھ کر میری آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگ گئے۔ مجھے لگا ایمان کسی ستون کی اُوٹ سے مسکرا کر جھانک رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ''مَیں نے کہا تھا نا۔۔۔ تم کبھی اکیلے نہیں ہوگے۔۔۔ مَیں ہر لحہ محبت کی صورت میں۔ دوستی کی صورت میں تم پر برستی رہوں گی۔ میری محبت روپ بدل بدل کر تمھارے اردگرد منڈلاتی رہے گی۔ مَیں تمھیں اتنا معتبر کردوں گی کہ لوگ تم پہ مرمٹنے کے لیے ہر دم تیار رہیں گے۔ میری محبت ہر لحہ تمھارے گرد عظمت اور حفاظت کا حصار بنائے رکھے گی۔''

جم نے مجھے یوں گم صم بھیگی آنکھوں کے ساتھ کھڑے دیکھا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے سے لگالیا۔ ساری یونیورسٹی نعروں سے گونج اٹھی۔ مَیں رو پڑا، آنسو خود بخود میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جم نے میرے وجود کو اور مضبوطی سے گلے لگالیا۔ ربیکا نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو صاف کر دیے اور دھیرے سے میرے کان میں بولی۔

''فکر مت کرو باغی لڑکے۔۔۔ ہم سب تمھارے ساتھ ہیں۔''

مَیں نے سارہ کی تلاش میں ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

اتنے میں ڈین آئزک کے کمرے سے اعلان ہونے لگا کہ میں جہاں کہاں بھی ہوں۔ فوراً ان کے کمرے میں پہنچوں۔ ایک بار پھر شور مچ گیا۔ سب میرے ساتھ ہی ڈین کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میرا ایک ہاتھ جم نے اور دوسرا ربیکا نے تھام رکھا تھا۔ ان سب کو کمرے کے باہر چھوڑ کر میں اندر داخل ہوا تو میری نظر سارہ پر پڑی جو غصے میں سُرخ چہرہ لیے ڈین کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ دروازے میں ہی اس کا میرے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے چند لمحے میری جانب دیکھا۔ پھر نکلتے نکلتے اس نے میرا ہاتھ اِک گھڑی کے لیے تھاما اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

''فکر مت کرنا۔۔۔ یہ لوگ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔۔۔۔ میں نے تمام اسٹوڈنٹس کی طرف سے ہڑتال کی کال جمع کروا دی ہے۔ ہم بھی دیکھتے ہیں کہ یہ تمھیں کیسے یہاں سے باہر کرتے ہیں۔''

سارہ میرا ہاتھ چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ اندر کمرے میں سر آئزک انتہائی غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ سارہ کو مجھ سے بات کرتے دیکھ کر تو ان کا چہرہ بالکل ہی بگڑ گیا تھا۔ سامنے میز پر پرلی جانب جیوری کے دو اور ارکان بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ سر آئزک میری طرف پلٹے اور غصے میں غرائے۔

''دیکھ رہے ہو مسٹر حماد امجد رضا۔۔۔۔ تمھاری وجہ سے آج اس یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ڈسپلن کی کیسی دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔ یونیورسٹی کے نام پر دھبہ لگ گیا ہے۔ پہلی مرتبہ اس یونیورسٹی میں طلبا نے میرے حکم کے خلاف جانے کی جرأت کی ہے۔ بغاوت کی ہے۔۔۔ اور اس سب کے ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو۔

میں نے سکون سے ان کی بات سنی۔

''آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ مجھے تو یونیورسٹی آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔ آپ گیٹ کا رجسٹر دیکھ سکتے ہیں۔ جب کہ یہ تمام اسٹوڈنٹس تو صبح 9 بجے سے آپ کے دفتر کے باہر بلکہ پوری یونیورسٹی میں جمع ہو چکے تھے۔''

''تم اس قدر خطرناک ہو کہ تمھاری موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم

یہ صلاحیت رکھتے ہو کہ اپنی غیر موجودگی میں بھی ان سب کو گمراہ کر سکو، بھڑکا سکو، تمھاری موجودگی اس یونیورسٹی کی سلامتی کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔''

سر آئزک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس وقت مجھے اور اس خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتے۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

''آپ یک طرفہ فیصلے کرنے کے عادی لگتے ہیں سر۔ آپ نے یک طرفہ طور پر فیصلہ کر کے مجھے کلاسز لینے سے منع کر دیا لیکن میں نے اس پر بھی کوئی احتجاج نہیں کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ انکوائری میں کوئی خلل پڑے۔ اس وقت بھی جیوری جو فیصلہ کرے گی۔ مجھے قبول ہوگا۔''

میرا جواب سُن کر سر آئزک دانت کچکچا کر ہی تو رہ گئے۔ وہ مجھے جیوری کے سامنے اشتعال دلوا کر کچھ مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن اَب میں بھی اس کھیل کو پوری طرح سمجھنے لگا تھا۔

جیوری نے مجھے مطلع کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر مجھے کلاس لینے کی اجازت تو دے رہی ہے لیکن دو دن بعد ہونے والی بڑی تقریب میں میں اپنا ٹرم پیپر یونیورسٹی کی لائبریری یا ریکارڈ میں جمع نہیں کروا پاؤں گا تاوقتیکہ میرے خلاف انکوائری میرے حق میں ختم نہیں ہو جاتی۔ فیصلہ سنا کر جیوری کے ممبروں نے اٹھتے اٹھتے مجھ سے یہ درخواست بھی کی کہ میں اپنے طور پر لڑکوں کو باہر جا کر کنٹرول کروں اور تمام اسٹوڈنٹس کو کلاس میں جانے پر مجبور کروں کیونکہ ان کے اس برتاؤ سے بات اب یونیورسٹی کی دیواروں سے باہر جانے لگی تھی جس سے یونیورسٹی کی بدنامی کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے جیوری سے وعدہ کیا کہ میں اسٹوڈنٹس سے ہڑتال ختم کرنے کی اپیل ضرور کروں گا۔ جیوری ارکان باہر نکل گئے۔ میں بھی واپس جانے کے لیے پلٹا۔ سر آئزک جو اَب بھی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے رک گئے اور مجھے پیچھے سے آواز دی۔

''مسٹر حماد۔۔۔۔ سارہ میری اکلوتی اور بے حد لاڈلی بیٹی ہے، لیکن ابھی بہت نادان ہے۔ اگلے سال میں نے اور اس کی ماں نے اس کی شادی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ لڑکا ہمارے خاندان کا ہے اور ہماری اُمیدوں کا چراغ ہے۔ اُمید ہے تب تک تم اس یونیورسٹی میں رہو

گے تاکہ سارہ کی شادی میں شریک ہو سکو۔ ظاہر ہے بطور اس کے بہترین دوست یہ تمھارا حق بھی ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں سر۔۔۔۔ سارہ واقعی میری بہترین دوست ہے اور اگر اس کی شادی میں شریک ہونے کے لیے مجھے اپنے ملک سے بھی دوبارہ یہاں واپس آنا پڑا تو میں اس کی شادی میں شرکت کے لیے ضرور آؤں گا۔ مجھے بس آپ کے دعوت نامے کا انتظار رہے گا۔"

میں سر آئزک کو خود کو گھورتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ تو گویا یہاں بھی مذہب کے ساتھ ساتھ ایک محبت کرنے والا باپ بھی میرے خلاف برسرِ پیکار تھا۔ جو یہ سمجھتا تھا کہ مَیں اُس کی لاڈلی بیٹی کو اس سے چھین کر لے جانے آیا ہوں۔ کیا ساری دنیا کی بیٹیوں کے باپ ایک سا ہی سوچتے ہیں۔۔۔۔ وہاں مولوی علیم الدین اور یہاں سر آئزک۔

میں نے بڑی مشکل باہر جمع لڑکے اور لڑکیوں کو دوبارہ کلاس میں جانے پر آمادہ کیا۔ جم کے تو باقاعدہ ہاتھ پیر جوڑنے پڑے تب جا کر وہ کہیں ٹلا۔ ربیکا اس بات پر بھی بے حد خفا تھی کہ مَیں نے اندر ٹرم پیپر پیش نہ کرنے کی شرط پر حامی کیوں بھری۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل میں یہ سارا کھیل ہی مجھے اس پیپر کو پیش نہ کرنے کی خاطر کھیلا گیا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے دوسرے کسی طالب علم یا جم وغیرہ کو بھی عتاب کا نشانہ بنایا جائے۔ مجھے انکوائری کے خاتمے تک انتظار کرنا ہی تھا۔ سارہ بھی وہیں کھڑی چپ چاپ ہماری بحث سنتی رہی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ جیسے اس کے اندر بہت سے سوال مچل رہے ہوں لیکن وہ انہیں پوچھ نہیں سکتی ہو۔ جیسے اس کے اندر ایک جنگ سی جاری ہو۔ مَیں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے آگے چٹکی بجائی۔ وہ چونک سی گئی۔ مَیں نے اُسے چھیڑا۔

"ہے مس آئزک۔۔۔۔ دیکھا لوگ ہم سے کس قدر خوف زدہ ہیں۔ مسلمان نام اتنا خوف ناک تو نہیں تھا کبھی۔۔۔۔ تمھارے پاپا نے تو ابھی سے مجھے تمھاری مستقبل کی شادی میں باراتی کی حیثیت سے دعوت نامہ بھی دے ڈالا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں مَیں تمھیں بھگا کر نہ لے جاؤں۔"

سارہ اور ربیکا دونوں ہی ہنس پڑے۔ ربیکا نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"اب سر آئزک کو کون سمجھائے کہ تم کسی لڑکی کو نہیں۔۔۔۔ بلکہ مجھ جیسی کئی لڑکیاں تمھیں اپنے ساتھ بھگا لے جانے کی تاک میں ہیں۔"

ربیکا یونہی سب کے لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرتی رہی لیکن مَیں نے نوٹ کیا کہ سارہ اس وقت ہمارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہ تھی۔ جانے اس کے دھاگے کہاں اُلجھے ہوئے تھے۔

OO

یونیورسٹی کا بڑا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آج سب طالب علم اپنا اپنا ٹرم پیپر جمع کروانے کے بعد ہال میں جمع ہوئے تھے۔ یہاں پر آج چند بہترین طالب علموں کو اپنا پرچہ اور اپنی تحقیق باقی طالب علموں کے سامنے پڑھ کر سنانے کا موقع دیا گیا تھا۔ انتظامیہ نے فیصلہ کیا تھا کہ آج صرف تین اسٹوڈنٹ جنھوں نے پچھلے سمسٹر میں یونیورسٹی بھر میں پہلی تین پوزیشنز حاصل کی تھیں۔ وہی اپنا منتخب ٹرم پیپر حاضرین کے سامنے پیش کریں گے۔ خاصی بڑی تقریب تھی۔ لندن کے میئر صاحب حسبِ معمول مہمانِ خصوصی تھے۔ لوگوں کی تعداد پچھلے چند ہفتوں سے جاری انتظامیہ اور میرے درمیان چپقلش کی وجہ سے بھی بہت زیادہ تھی۔ جانے یہ خبر کہاں کہاں گردش کرتی رہی تھی۔ سائنس کے اس دور میں لوگوں کو لاعلم رکھنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ انہی میں اخباری رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کی بڑی تعداد بھی شامل تھی جو ہر سال کی طرح اس سال بھی یونیورسٹی کی اس خاص تقریب کی ترویج کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت کم ہی ایسے ہوں گے جو میرے چہرے سے واقف ہوں گے لیکن بقول جوزف ان میں سے ہر ایک کم از کم میرے نام سے ضرور واقف تھا۔

کچھ ہی دیر میں سر آئزک نے اسٹیج پر آ کر مہمانِ خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ ان چند بڑے ناموں کا اعلان کیا جو یونیورسٹی کو لاکھوں پاؤنڈ سالانہ چندہ دیتے تھے اور جن میں سے اکثر اس وقت اس تقریب میں ہال کی پہلی رَو میں موجود بھی تھے۔ یہ سب کے سب نام یہودیوں کے ہی تھے۔ ان میں سے اکثر کی اپنی اولادیں بھی اسی یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھیں تقریب کا

باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ پہلے چند طلبا و طالبات کو ان کی غیر معمولی قابلیت پر سند اور میڈل وغیرہ دیے گئے۔ اس کے بعد ان اسٹوڈنٹس کو اپنا پرچہ پڑھنے کی دعوت دی گئی جن کے نام آج کی فہرست میں شامل تھے۔ ان ناموں میں سارہ کا نام بھی شامل تھا کیونکہ پچھلے سمسٹر میں بھی ہمیشہ کی طرح اس نے ہی پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

سب سے پہلے جیمی فوکس نامی لڑکی نے معاشیات پر اپنا پرچہ پڑھا اور ہال سے خوب داد وصول کی۔ اس کے بعد مارٹن نامی سالِ اوّل کے طالب علم نے لندن کی پُرانی عمارتوں کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی۔ اس کا پرچہ بھی واقعی لاجواب تھا۔ ہال نے اسے بھی جی بھر کے ستائش کا انعام دیا۔ اس کے بعد سارہ کا نام پکارا گیا۔ بلیک کوٹ اور بلیک ٹراؤزر میں ملبوس سارہ نے سفید قمیض کے ساتھ اپنا پسندیدہ اسکارف بھی گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اس نے مجھے ایک دن بتایا تھا کہ سُرخ رنگ کا یہ اسکارف وہ صرف خاص موقعوں پر ہی پہنتی تھی۔ آج بھی اُس نے اپنے لمبے بال پیچھے کس کر باندھے ہوئے تھے اور دُور سے بالکل کسی کانونٹ اسکول کی طالبہ ہی تو لگ رہی تھی۔ سارہ کا نام پکارے جانے پر ہماری ساری کلاس نے خوب شور مچایا جن میں جم اور ربیکا سرِفہرست تھے۔ سارہ مسکراتی ہوئی اسٹیج پر چڑھ گئی۔ اس نے ہال کے تمام حاضرین کا اور صدرِ تقریب کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر اُس نے اپنے سامنے اسٹیج پر بنے چھوٹے سے شیشے کے روسٹرم (ڈائس) پر رکھے اپنے پرچے کا پہلا صفحہ پلٹا۔

''جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ میرے پرچے کا عنوان ہے ''ہالوکاسٹ۔۔۔ ایک نظریہ یا ایک حقیقت۔؟۔۔۔ آج سے تین ماہ پہلے بھی مَیں نے اسی موضوع پر پہلے حصے کی حیثیت انعام بھی حاصل کیا تھا۔ آج میں اُسی پہلے حصے کا دوسرا حصہ آپ سب کے سامنے پیش کرنا چاہوں گی۔ اُمید ہے آپ سب کی توجہ مجھے حاصل رہے گی۔''

پہلی قطار میں بیٹھے سر آئزک فخر اور مسرّت سے اپنی بیٹی کا بااعتماد انداز دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ساتھ بیٹھے میئر اور چند دیگر خصوصی مہمانوں کو بھی دھیرے سے بتایا کہ سارہ ان کی بیٹی ہے۔ سب نے ستائش انداز میں سر ہلائے۔ سارہ کی بات جاری تھی۔

''یہاں مَیں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی کہ پہلے حصے کو تحریر کرتے وقت مَیں نے تحقیق کی بجائے زیادہ تر مواد اکٹھا کرنے پر اپنی توجہ قائم رکھی تھی۔

شاید اس وقت تک مجھے تحقیق کرنے کی اتنی عادت نہیں تھی یا صرف تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتے رہنے کی وجہ سے مَیں نے دوسرے رُخ کو پلٹنے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج میرا ٹرم پیپر پوری تحقیق اور دلائل کے بعد مرتب ہوا ہے۔ میرے پاپا۔۔۔ سر آئزک نے مجھے ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ پر سچ بولنے اور سچ سننے کی تربیت دی ہے اور سچ یہ ہے کہ آج اگر مَیں آپ سب کے سامنے اس اسٹیج پر فخر سے کھڑی ہوں تو یہ فخر دینے والے اصل میں میرے پاپا، میرے سب سے بڑے استاد خود ہیں۔''

سارے ہال نے سارہ کی اس بات پر تالیاں بجائیں۔ سر آئزک کا سر فخر سے مزید تن گیا، سارہ نے پہلا صفحہ ختم کر کے دوسرا صفحہ پلٹا۔

''ہالوکاسٹ، پر تحقیق کے دوران مَیں نے سچ اور مفروضے کی ایک عجیب سی جنگ دیکھی۔ یہ جنگ باہر بھی ہو رہی تھی اور خود میرے اندر بھی، میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ لوگوں کو سچ کہنے اور سچ سننے سے اس قدر گریزاں دیکھا۔ ایک عجیب انسان ہماری زندگیوں میں آیا اور اس نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ مَیں نے اپنے پاپا کے بعد سچ کا دوسرا سبق اُسی انسان سے سیکھا۔ مَیں نے یہ بھی سیکھا کہ کوئی کس طرف سچ پر قدم جما کر کھڑا ہو سکتا ہے اور ساری کائنات سے ٹکر لینے کی ہمت کر سکتا ہے۔ میرا آج کا ٹرم پیپر، یہ تحقیق اور یہ تجربہ دراصل میری نہیں ہے، بلکہ اُسی سچے انسان کی تحقیق ہے جس کا نام حماد رضا ہے۔''

ہال میں جیسے کسی نے بم کا دھماکا کر دیا ہو، اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سر آئزک غصے میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کسی سے چلا کر مائیک بند کر دینے کا کہا لیکن تب تک جم اور ڈیوڈ وغیرہ نے ہال کے آڈیو سسٹم پر قبضہ کر لیا تھا۔ اونگھتے ہوئے رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کے جسم میں جیسے کسی نے بجلی سی بھر دی تھی۔ وہ دھڑا دھڑ سارہ اور دیگر لوگوں کی سر آئزک سمیت تصاویر بنانے لگے۔ میئر نے آہستہ سے سر آئزک کے کان میں کچھ کہا شاید ان کی توجہ اخباری رپوٹرز کی طرف متوجہ کروائی۔ سر آئزک بے بسی کے عالم میں خون کے گھونٹ پیتے ہوئے اور بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئے۔

خود میرے لیے بھی یہ کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سارہ اپنے پرچے کی جگہ میرا پرچہ پڑھنے کے لیے لے آئے گی۔ اس نازک سی لڑکی کی

جرائتوں کی حد جانے کہاں جا کر ختم ہوتی تھی ۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا ۔ بہت مشکل ۔۔۔۔ سارہ کی تقریر جاری تھی ۔

''نظریہ ہالوکاسٹ کی ابتدا صیہونی ورلڈ آرڈر کے اسرائیلی لیڈر اور وزیر اعظم ڈیوڈ بن گورین کی تحریک سے شروع ہوتی ہے اور اس کے لیے جرمنی کے لیڈر اور دوسری جنگ عظیم کے ایک مشہور کردار ہٹلر کو ہدف بنایا گیا ۔ وجہ برطانیہ اور امریکہ کی یہودی رہنماؤں کو یہ یقین دہانی تھی کہ جنگ کے خاتمے کے بعد ایک آزاد سلطنت یہودیوں کے نام ہوگی ۔۔۔۔

سارہ میرا پیپر پڑھتی جا رہی تھی اور ہال پر اک سناٹا سا چھایا ہوا تھا ۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جرمن اور ہٹلر ہی ہدف کیوں بنے ۔۔۔؟ جواب ہٹلر کی یہودی دشمنی سے ظاہر ہے ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہودیوں کو جرمنی بدر کر دیا گیا ۔ اسلحے اور دیگر جنگی ساز و سامان کی فیکٹریاں یہودیوں سے چھین لی گئیں ۔ کلیدی اسامیوں اور عہدوں سے یہودیوں کو ہٹا کر جرمن باشندوں کو تعینات کر دیا گیا تھا اور یوں یہودی جرمنی کے خلاف ہو گئے ۔ یہ سلوک نہ صرف جرمنوں نے بلکہ رومانیہ اور دیگر کئی ملکوں نے بھی یہودیوں کے ساتھ روا رکھا ۔ اور یہیں سے ہالوکاسٹ کے نظریے کی ابتدا ہوئی ۔ شروع میں مَیں نے بھی بغیر تحقیق کے اس حق میں چھپنے والی بہت سی کتابوں سے حوالے لے کر اسے سچ مانا لیکن آج حماد رضا اس کے پرچے اور اس کی تحقیق کے نتیجے میں مَیں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہودی مصنفین اور محقق آج تک اتنی بڑی ہلاکتوں کے بارے میں ایک بھی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے ۔ جرمنوں کے ہاتھوں یہودیوں کی ہلاکتیں تو ضرور ہوئی تھیں لیکن اصل تحقیق اور تمام تر شواہد اور ثبوت چند ہزار ہلاکتوں سے زیادہ کی تصدیق نہیں کر پائے ۔''

سر آئزک نے غصے میں اُٹھ کر دوبارہ ہال سے باہر جانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک ہال سے باہر موجود لوگ بھی اندر گھس آئے تھے اور دروازوں کے قریب اور ہال کے اندر نشستوں کے درمیان بنے راستوں میں اس قدر ہجوم تھا کہ وہ تلملا کر وہیں کہیں بھٹکتے رہ گئے ۔ سارہ بولتی رہی ۔

''دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اتنے بڑے پیمانے پر جرمن فوج نے یہودی قتلِ عام کیا بھی تھا تو اس وقت کے اخبارات ، جرائد اور رسائل اس بارے میں اس قدر خاموش

کیوں ہیں ۔ پچھلے کئی دنوں میں مَیں نے دوسری جنگ عظیم سے لے کر ہالوکاسٹ کا نظریہ سامنے آنے تک کے دَور کے ہر اخبار ، ہر رسالے ہر خبر کو چھان مارا ہے لیکن مجھے اتنی بڑی ہلاکتوں کی خبر جرمن دشمن اخبارات اور رسائل میں بھی نہیں ملی ۔ آخر کیوں ؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ ''ہالوکاسٹ'' کا الزام تو جرمنوں پر لگایا جاتا رہا ہے لیکن اس وقت کی یہودی قوم کی طرف سے دباؤ ہمیشہ فلسطین اور قبلہ اوّل اور گولان کی پہاڑیوں کی طرف نقل مکانی کی صورت میں ہی کیوں نکالا گیا ۔ میں جانتی ہوں کہ قبلہ اوّل ہر یہودی کے لیے اپنی زندگی سے زیادہ مقدس ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ اس نقل مکانی کے لیے ہالوکاسٹ کے نظریے کا ہی سہارا لیا جاتا ۔۔۔ کیا کوئی مجھے جرمنوں کے خلاف اُٹھائے جانے والے کسی اقدام کے بارے میں بتائے گا ۔۔۔؟ اصل مجرم تو یہودیوں کے نزدیک جرمن تھے ۔۔۔ لیکن ان کے خلاف ایسا کچھ نہیں کیا گیا جس کا کوئی قابل ذکر کہیں بھی سنائی دیا ہو ۔۔۔؟ آخر کیوں ۔۔۔؟

پھر سارہ نے ان تمام تصنیفات کے نام پڑھے جن سے مَیں نے ہالوکاسٹ کے نظریے کے خلاف شواہد اکٹھے کیے تھے اور تمام اسٹوڈنٹس کو ان تصانیف کو ایک بار پڑھنے کا مشورہ بھی دیا ۔ مجھے یقین ہے اتنے دنوں میں سارہ نے خود بھی ایسی ہر ایک تصنیف کو چھان مارا ہوگا جس کا حوالہ مَیں نے اپنے پرچے میں دے رکھا تھا ۔ آخر میں سارہ بولی ۔

''بحث یہ نہیں ہے کہ ''ہالوکاسٹ'' مفروضہ ہے یا حقیقت ۔ بحث تو اب یہ ہے کہ سچ کو زمانے کے سامنے پیش کرنے سے اور سچ بولنے سے اس قدر خوف کیوں ۔۔۔؟ مَیں اپنی نئی نسل کو اس بات کی دعوت دیتی ہوں کہ ہمیں خود آگے بڑھ کر سچ کے نقاب کو اُلٹ دینا چاہیے ۔ اگر ہمارے بزرگوں نے اس وقت کچھ مقاصد حاصل کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا تھا تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی انہی کے نقش قدم پر چلیں ۔ کیوں نا ہم خود چل کر سچ کو تلاش کریں حماد امجد رضا کا یہ ٹرم پیپر تو صرف ایک ابتدا ہے ۔ ہماری نئی نسل کو سچ کی طرف بلانے کی ابتدا ۔ حماد نے اس پرچے میں کہیں بھی نہیں لکھا کہ ''ہالوکاسٹ'' سراسر جھوٹ ہے ۔ لیکن اس نے اس کے مفروضے کے سچے ہونے پر انگلی اٹھائی ہے ۔ اس نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ ایک قوم کے مظالم اگر ثابت ہو بھی جائیں تب بھی اس کا بدلہ کسی سازش

کے ذریعے دوسری قوم سے لینا ناانصافی ہے۔حماد کا یہ ٹرم پیپر اسرائیل کی حدوں میں تو کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا کیونکہ جو ہو چکا اُسے بدلنا اب کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔لیکن ہم یہ تو تسلیم کر سکتے ہیں کہ کس نے کہاں پر اور کتنی غلط بیانی سے کام لیا تھا۔مَیں پھر کہوں گی یہ ہم سے تین نسلیں پہلے کیے گئے لوگوں کے اچھے یا بُرے اعمال ہیں۔تو پھر ہم آج کی نسل اس کی جواب دہی کیوں کرتے پھریں۔یاد رکھیے۔۔۔۔اس دنیا میں امن قائم کرنا ہے تو ہماری اس نسل کو ہی آگے آنا ہوگا۔پھر چاہے وہ نسل یہودی ہو یا مسلمان، یورپین ہو یا امریکن یا افریقین۔۔۔۔ہمیں اپنا امن کا نظریہ خود پیش کرنا ہوگا۔جو ہو چکا سو ہو چکا۔۔۔۔جس نسل جس قوم کے بھی بزرگوں نے جو کچھ بھی کیا چاہے اپنی دانست میں درست ہی کیوں نہ کیا ہو اور وقت نے اُسے غلط ثابت کر دیا ہو، چاہے کچھ بھی ہو۔وہ سب اب ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ہمیں حال میں جینا ہے۔ماضی کا حصہ بن کر اپنے بزرگوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالنا، ان کے جرم سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہوگا۔کیونکہ شاید انہوں نے وہ کام غلطی یا جرم سمجھ کر نہ کیے ہوں۔۔۔۔۔

میں اپنی اور ہر قوم کی نئی نسل کو دعوت دیتی ہوں کہ وہ ''ہالوکاسٹ'' اور اس جیسے کسی بھی مفروضے کی حقیقت کو جاننے کے لیے خود تحقیق کریں۔خود قدم آگے بڑھائیں۔چاہے وہ مفروضہ کسی بھی قوم یا نسل سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔اپنی دوستی اور دشمنی کی بنیاد اس نئی نسل کو خود رکھنی ہوگی۔ہم سے پہلے گزرے ہوئے ہمارے بڑوں کی دشمنیاں ہمیں ان کے ساتھ ہی دفنانا ہوں گی۔''

سارہ نے میرے ٹرم پیپر کا آخری صفحہ بھی ختم کر دیا۔اور اسٹیج سے اُترنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ہال پر بہت دیر تک ایک موت کا سا سکوت طاری رہا۔اور پھر سب سے پہلے لندن کے میئر اور مہمان خصوصی نے اُٹھ کر سارہ کے لیے تالی بجائی۔پھر اس کے بعد، دو، دو کے بعد چار اور چند لمحوں میں ہی ہال تالیوں، نعروں اور تعریفی کلمات کے شور سے جیسے پھٹنے لگا۔سارہ کے پیچھے اخباری فوٹوگرافرز کی فلش مشین کی روشنی جھماکے کر رہی تھی۔وہ اسٹیج سے اُتر کر سیدھی میرے پاس آئی اور ٹرم پیپر میری طرف بڑھا کر مسکرائی۔

''یہ لو اپنی امانت۔۔۔۔مَیں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔اس یونیورسٹی کے ہر طالب علم

کے پاس آج شام تک اس ٹرم پیپر کی ایک ایک نقل پہنچ جائے گی۔تم نے سچ کے جس سفر کی دعوت دی ہے۔وہ آج اسی یونیورسٹی کے اسٹیج سے مَیں نے شروع کر دیا ہے۔اور تم دیکھنا کہ بہت جلد تمھارے قافلے میں لاکھوں نوجوان شامل ہوں گے۔'' ہمارے اردگرد اسٹوڈنٹس، اخباری نمائندوں اور ہمارے ذاتی دوستوں کا ایک ہجوم تھا۔اخبار والے دھڑا دھڑ میری اور سارہ کی تصاویر بنا رہے تھے۔رپورٹرز اپنے مائیک آگے کیے جانے اور کیا کیا سوال کر رہے تھے۔مجھے ان سب باتوں کا ہوش ہی کہاں تھا۔۔۔۔دفعتاً میرے سامنے کھڑی سارہ کی جگہ ایمان نے لے لی۔مَیں نے چونک کر ایمان کو دیکھا، آس پاس ہال کا شور ساکت ہو گیا، لوگ ساکت ہو گئے۔ایمان دھیرے سے مسکائی۔''میں نے کہا تھا نا۔۔۔۔محبت فاتح عالم۔۔۔۔''

دفعتاً ایمان کی جگہ پھر سارہ نے لے لی، ہم دونوں کے گرد ربیکا، جم ڈیوڈ اور ٹینا نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گھیرا سا ڈالا ہوا تھا تاکہ ہم ہجوم کے دھکوں سے بچ سکیں۔مَیں نے سامنے کھڑی سارہ کے بال ہاتھ بڑھا کر بکھیر دیے، سارہ مسکرادی، سارا ہال مسکرادیا۔ساری دُنیا مسکرادی۔ساری کائنات مسکرادی۔

OO

نوجوان انقلاب

رات یونیورسٹی کی تقریب سے مَیں بہت دیر بعد فارغ ہو کر گھر پہنچا۔ ربیکا نے تقریب کے بعد اپنے خاص دوستوں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ وہاں سے آتے آتے آدھی رات ہی ہوگئی تھی۔ میں آتے ہی بستر پر پڑ کے سوگیا تھا۔ پھر نہ جانے کس وقت مجھے کامران کے شور نے جگا دیا۔ وہ میرے ہی کمرے میں چلاتا ہوا داخل ہو رہا تھا۔

"اوہ تو میرا شہزادہ پورے شہر میں آگ لگانے کے بعد یہاں پڑا سو رہا ہے۔" میں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

"تم آج ریسٹورنٹ نہیں گئے اپنے۔"

"وہیں سے آ رہا ہوں۔ وہاں بھی تمہارے ہی فدائین کا ہجوم جمع ہے۔ جو تمہارے دیدار کے لیے ترس رہے ہیں۔ سارے شہر کے اخبارات میں کل یونیورسٹی ہال میں کی گئی اس یہودی حسینہ کی تقریر کے چرچے ہیں۔ تم دونوں کی تصویروں کی دھوم ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ آج اگر تم یہاں سے الیکشن لڑنے کا اعلان کر دو تو بلا مقابلہ میئر کا انتخاب جیت جاؤ گے۔ یہ گوری نئی نسل جب کسی کو سَر پر بٹھاتی ہے تو پھر اُترنے نہیں دیتی۔"

کامران نے آج کے اخبارات کا موٹا سا پلندا میری طرف پھینکا۔ ہر اخبار کے پہلے صفحے پر سارہ کی تقریر کے دوران اور پھر میرے ساتھ کھڑے مجھے ٹرم پیپر واپس کرتے ہوئے کی تصویر اور ایسی کئی دیگر تصاویر چھپی ہوئی تھی۔ تقریباً ہر اخبار نے اس واقعے کو اور سارہ کی تقریر کو "نوجوان انقلاب" سے تشبیہہ دی تھی۔ چند ایسے اخبارات نے جن کے مالکان یہودی تھے یا پھر یہودیوں کے زیر اثر تھے اور انہی کے چندے سے چلتے تھے، سارہ کی تقریر اور ہالوکاسٹ پر میرے پرچے پر زبردست تنقید بھی کی تھی۔ اسے ایک جذباتی باتوں کا پلندا قرار دیا تھا لیکن اس وقت ان کی تنقید بھی ہماری شہرت کو بڑھانے کی ایک وجہ بن گئی تھی۔ اس

نازک لڑکی کی جرأت نے میری بات شہر کے ہر گلی کوچے میں پہنچا دی تھی اور کل تک انہی اخبارات کے ذریعے پورے یورپ میں اور پھر انٹرنیٹ کے ذریعے ساری دنیا میں پہنچنے والی تھی۔ لوگوں میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا تھا۔ نوجوان نسل نے سچ کی تلاش کے عنوان سے اپنے بڑے بزرگوں کو انہی اخبارات میں دعوت دی تھی کہ وہ ان کی مدد کریں، سچ جاننے میں اور سچ کو پھیلانے میں۔ سارہ نے سچ ہی کہا تھا۔ یہ قافلہ اَب چل پڑا تھا۔ اس قافلے کی سربراہی خود سارہ ہی تو تھی۔

چند اخبارات نے جو یہودی اثر میں تھے۔ پیٹر کے ساتھ میرے فرضی جھگڑے کو بنیاد بنا کر اور اُسے بڑھا چڑھا کر بیان کر کے میری کردار کشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ سارہ اور میرے تعلق پر بھی انگلیاں اٹھائی گئی تھیں۔ ان اخبارات نے خاص طور پر سارہ کے بال بکھراتے میرے بڑھے ہاتھوں والی تصویر کو شائع کیا تھا۔ گویا جنگ چھڑ چکی تھی۔ کچھ اخبارات نے مجھے خاص قوم کا ایک خطرناک ایجنٹ بھی قرار دیا تھا۔ جو ایک خاص ایجنڈہ لے کر یونیورسٹی آیا۔ لیکن زیادہ تر اخبارات نے کیچڑ اُچھالنے کی بجائے میرے پیغام کو آگے بڑھایا تھا۔ سوچنے کے پیغام کو، تحقیق کر کے سچ کے جاننے کے پیغام کو، سارہ کی تو ہر اخبار نے زبردست تعریف کی تھی۔ اسے روایتوں سے ہٹ کر دُنیا کے سامنے کھڑی ہونے والی لڑکی قرار دیا تھا۔ اُسے نئی نسل کی آواز کہا تھا، میرا مقصد پورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بحث شروع ہو چکی تھی اور مَیں جانتا تھا یہ بحث آگے چل کر نئی نسل کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے والی تھی۔

لیکن اخبارات میں اکا دکا چند ایسے واقعات کی بھی نشان دہی کی گئی تھی جو میرے لیے کافی تشویش کا باعث تھے۔ لندن کے مضافات میں اور چند یہودی آبادیوں کے اردگرد تشدد کے اکا دکا واقعات کا بھی ذکر تھا جو سارہ کی اس تقریر کے نتیجے میں پیش آئے تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شدت پسندی اور انتہا پسندی کا الزام تو ہم پر لگایا جاتا رہا ہے ہمیشہ اور ایک تسلسل کے ساتھ، لیکن ان تنگ نظر یہودیوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا تھا جنھوں نے اپنی ہی نسل کی ایک معصوم سی لڑکی کی ایک سچی پکار کو نسلی تعصب کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے دو بجے آج یونیورسٹی جانا تھا لیکن کامران نے مجھے اکیلے جانے نہیں دیا۔ اُسے ان

اکا دکا واقعات کی وجہ سے کافی تشویش تھی جو لندن کی یہودی بستیوں کے مضافات میں ہوئے تھے۔ وہ مجھے خود یونیورسٹی کے گیٹ پر اپنی گاڑی سے اُتار کر ہی واپس ریسٹورنٹ گیا اور مجھے تاکید کر گیا کہ مَیں واپسی پر نکلنے سے پہلے بھی اُسے فون کر کے بلوا لوں اور پیدل، تنہا یونیورسٹی سے نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا، اسکول اور کالج میں جب کبھی میرا کسی سے جھگڑا ہو جاتا تھا تو وہ یونہی میرے سائے کی طرح میرے ساتھ چپکا رہتا تھا اور جب تک وہ خطرہ ٹل نہیں جاتا تھا مجھے کہیں اکیلے نہیں جانے دیتا تھا۔ یوں کئی مرتبہ ہم دونوں نے اکٹھے اور بہت مرتبہ اُس نے میری جگہ اکیلے اپنے جسم پر بہت سے زخم کھائے تھے۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسے دوستوں کو ماں باپ کے ساتھ کا درجہ کیوں نہیں دیا جاتا؟

یونیورسٹی کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے ہیلو، ہائے، اور مبارک باد کی آوازوں نے میرا استقبال کیا۔ حالانکہ آج یونیورسٹی میں کل کی تقریب کی وجہ سے عام تعطیل کا اعلان کیا گیا تھا اس لیے یونیورسٹی تقریباً خالی ہی تھی۔ صرف ہوسٹل میں رہنے والے چند اسٹوڈنٹس موجود تھے لیکن مجھے اپنے خلاف ہونے والی انکوائری کے سلسلے میں آج بلایا گیا تھا۔ ڈین آئزک کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے کاندھے تھپک کر، ہاتھ ملا کر اور گلے لگا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

ڈین آئزک کے کمرے میں تو پوری عدالت ہی لگی ہوئی تھی۔ جیوری کے ممبر، پیٹر اور اس کے دونوں گواہ موجود تھے۔ ایک دو نئے چہرے بھی موجود تھے جنھیں مَیں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سر آئزک کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں اور چہرہ اُترا ہوا تھا۔ یقیناً رات کو دو بجے جب سارہ کو ریکا نے، مَیں نے اور ہمارے ساتھ کی تمام ٹولی نے گھر چھوڑا تھا تب اُس کے بعد ان کی اور سارہ کی ایک طوفانی بحث یا جھگڑا ضرور ہوا ہوگا۔ میری آج سارہ سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے میں صرف اپنے طور پر خیالی گھوڑے ہی دوڑا سکتا تھا کہ کل رات سارہ کے گھر میں کیا ہوا ہوگا۔

جیوری نے اپنی کارروائی شروع کی۔ میرے خلاف الزامات کی فہرست پڑھ کر سنائی گئی جس میں اَب یونیورسٹی کی منفی شہرت کا سبب بننے کا الزام بھی شامل کیا جا چکا تھا۔ لیکن آج مجھے جیوری کسی عجلت میں دکھائی دے رہی تھی۔ میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب خصوصی

طور پر آج مجھے چھٹی والے دن پیشی کے لیے بلایا گیا تھا۔

نئے آنے والے بھاری بھرکم اور موٹی توند والے صاحب کا نام پارکر تھا۔ وہ لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج تھے، ان کے ساتھ خفیہ ایجنسی ایم۔ آئی۔ کے دو اہلکار بھی موجود تھے۔ پیٹر نے پھر سے اپنی رام کہانی سنائی۔ اس مرتبہ دونوں گواہوں نے بھی بیانات دیے۔ میرا بیان تو پہلے سے وہی تھا کہ مَیں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن جیوری نے میرا اعتراض رد کر دیا اور بالآخر فیصلہ سنا دیا کہ مجھے فوری طور پر یونیورسٹی کے اس ٹرم سمسٹر سے فارغ کیا جاتا ہے اور پیٹر کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ ہتک عزت کا دعویٰ کرنا چاہے یا اگر اُسے مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وہ پولیس سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔ شاید اسی لیے آج مجھے یہاں پولیس والے حضرات بھی نظر آ رہے تھے۔

پارکر اس تمام کارروائی کے دوران غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ مَیں نے سر آئزک سے پوچھا کہ کیا مجھے اس فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ یونیورسٹی کی حد تک تو فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ مَیں چاہوں تو لندن کی کسی عدالت میں اس فیصلے کے خلاف جا سکتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے دبے لفظوں میں یہ دھمکی بھی دی کہ انہوں نے پیٹر کو فی الحال پولیس میں میرے خلاف جانے سے اسی شرط پر روک رکھا ہے کہ مَیں اس فیصلے کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤں گا۔

جیوری نے فیصلہ سنا دیا تھا سر آئزک کا چہرہ فیصلہ سننے کے بعد بھی اُترا ہی رہا۔۔۔ شاید انہیں آنے والے حالات کا کچھ اندازہ تھا۔ وہ یونیورسٹی میں صرف میری کلاس عارضی طور پر ختم کرنے کا انجام دیکھ چکے تھے۔ وہ جیوری کے ساتھ فیصلہ سنانے کے بعد بھی بہت دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔

مَیں کمرے سے نکل آیا۔ میرا دھیان کسی اور طرف تھا کہ پیچھے سے موٹی توند والے پارکر نے مجھے پکارا۔ مَیں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وہ میرے قریب پہنچ چکا تھا اُسے ہر لمحہ چیونگم چبانے کی عادت لگتی تھی۔ اُس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"ہوں۔۔۔ تو تم ہو حمّاد۔۔۔ جس نے آج پورے لندن میں آگ لگا رکھی ہے۔۔۔ بہت خوب۔۔۔ آگ لگانے کی قوت رکھتے ہو۔۔۔ مَیں جیوری کی تمام

کارروائی کے دوران بہت غور سے تمھیں دیکھ رہا تھا، تمھارے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی نہیں تھی۔''

''مَیں جانتا تھا کہ یونیورسٹی انتظامیہ یہی فیصلہ کرے گی۔ فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔ آج صرف سنایا گیا ہے۔''

پارکر چیونگم چباتے ہوئے اپنی ڈھیلی پینٹ کے گیلس اوپر کھینچتے ہوئے بولا۔

''بہت خوب۔۔۔۔ مجھے تمھارا اعتماد واقعی بہت پسند آیا۔۔۔۔ کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہے کہ یونیورسٹی کے باقی اسٹوڈنٹس کو شہر کی سڑکوں پر لا کر جیوری کو اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دو گے۔ اگر ایسا ہے تو میں تمھیں اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ انتظامیہ نے کل سے یونیورسٹی کو پندرہ دن کے لیے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاکہ اسٹوڈنٹس کے کسی ممکن ری ایکشن سے بچا جا سکے۔''

پارکر نے خبر سنا کر پھر ماہر پولیس والوں کی طرح میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ حالانکہ وہ یہ سب نہایت غیر محسوس طریقے سے کر رہا تھا۔ مَیں نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔

''آپ بے فکر رہیے۔ اس یونیورسٹی کی اسی سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اسٹوڈنٹس کو دو ہفتے کی چھٹی بغیر کسی اطلاع کے مل رہی ہے۔ وہ سب اس چھٹی کو بہت خوشی سے پُر لطف انداز میں گزاریں گے۔''

مَیں آگے بڑھنے لگا۔ پارکر نے جلدی سے پھر مجھے پکارا۔

''آگے کا کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی کچھ سوچا نہیں۔ اپنے خلاف جھوٹے الزام کا سامنا کروں گا۔'' مَیں پھر آگے بڑھنے لگا۔ پارکر پھر بولا۔

''مَیں جانتا ہوں کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔''

مَیں رُک گیا۔ مَیں نے حیرت سے پارکر کی جانب دیکھا۔ وہ حسب معمول چیونگم چباتا رہا۔ ''آپ جانتے ہیں پھر بھی آپ میرے خلاف ہوتی انکوائری کے دوران چُپ چاپ خاموش بیٹھے رہے۔۔۔ کیوں۔۔۔؟؟؟''

''کیونکہ تمھارے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور ان لوگوں کے پاس گواہ کے طور پر

سارے ثبوت موجود تھے۔ تم نہیں جانتے، تم نے اور تمھاری دوست سارہ نے اس وقت لندن کی تمام انتظامیہ اور سارے خفیہ ڈیپارٹمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ساری پولیس کو ممکنہ ری ایکشن کی وجہ سے الرٹ کر دیا گیا ہے۔ اگر یونیورسٹی انتظامیہ ہمیں طلب نہ کرتی تب بھی لندن انتظامیہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ معاملہ اب اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے۔''

''لیکن آپ یہ کیسے جانتے ہیں کہ ان کا الزام جھوٹا ہے۔''

''تیس سال سے پولیس کے محکمے کی خاک چاٹ رہا ہوں برخوردار۔۔۔۔ اس خبیث لائبریرین کی شکل پر ہی لکھا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ یہ سب یونیورسٹی کے ڈین کی شہ پر ہو رہا ہے۔''

وہ واقعی پکا پولیس والا تھا۔ کچھ دیر میں ہی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔

''اس کے بعد کا دوسرا کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے یہ ذہن میں ضرور رکھنا کہ ان لوگوں نے اب تمھیں لندن سے ڈی پورٹ (علاقہ بدر) کرنے کا پورا منصوبہ تیار کر رکھا ہے۔ جو بھی قدم اُٹھانا بہت سوچ سمجھ کر اُٹھانا۔''

''آپ مجھے یہ بتایئے کہ پیٹر کی شکایت پر میرے خلاف پولیس کا ردعمل کیا ہوگا۔''

پارکر نے چونک کر میری طرف دیکھا۔۔۔۔

''میری توقع سے کہیں زیادہ ذہین ہو۔ عام حالات میں پولیس اُس کی تمھارے خلاف شکایت پر زیادہ سے زیادہ یہ عمل کرتی کہ تمھیں چند منٹ کے لیے قریبی اسٹیشن بلوا کر تم سے کوئی زبانی یا تحریری ضمانت لے لیتی اور تم دونوں کو مستقبل میں محتاط رہنے کی تنبیہہ کر کے جانے دیتی۔ کیونکہ پولیس کے محکمے میں اور کسی یونیورسٹی کے قانون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پولیس بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے صرف گواہوں کی شہادت پر کسی کو ملزم یا مجرم نہیں مان سکتی، اور گواہ بھی وہ خود الزام لگانے والے کے وفادار ملازم ہوں۔ لیکن اس دن کی تقریب اور تمھاری دوست کی اس تقریر کے بعد اب حالات وہ نہیں رہے۔ اب اس یہودی کا الزام ستر فیصد پہلے ہی درست مان لیا گیا ہے۔ لندن انتظامیہ بہت چوکنا ہو گئی ہے۔ رہی سہی کسر تشدد کے ان اکا دکا واقعات نے پوری کر دی ہے۔ ایسے موقع پر چاہے پولیس تمھارے خلاف کوئی ایکشن لے یا نہ لے۔ لیکن ساتھ وہ ہر حال میں تمھاری یونیورسٹی انتظامیہ کا ہی دے گی۔ اس

وقت تم یونیورسٹی اور پولیس دونوں کے لیے ایک سا خطرہ ہو۔"

پارکر نے تفصیل سے مجھے تمام صورت حال کا جائزہ کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اپنے آئندہ کسی بھی اقدام کے سلسلے میں آگاہ رکھوں گا۔ پارکر میرا کندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔ سارہ، ربیکا، جم وغیرہ میں سے کسی کو میری آج یہاں سر آئزک کے سامنے پیشی کا پتہ نہیں تھا ورنہ وہ سب کے سب اس وقت یہاں جمع ہوتے۔ میں نے دانستہ طور پر خود بھی انہیں اس اچانک کال کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں اس انکوائری کے نتیجے سے پہلے ہی سے بخوبی واقف تھا۔ بالآخر سر آئزک نے اپنا مقصد کسی نہ کسی طور حاصل کر ہی لیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے آگے آنے والے وقت اور حالات کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ کامران کو مَیں نے فون کر کے یونیورسٹی کے فیصلے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ آج ہی دو چار اچھے وکیلوں سے اس سلسلے میں بات کر لے گا۔ آج سر آئزک اور ان کے در پردہ یہودیوں کے امرا طبقے نے میرے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا تھا مجھے میرے خیالات کی سزا دی جا رہی تھی۔ مجھے ان کی نئی نسل کو سوچ کے راستے پر ڈالنے کی سزا دی جا رہی تھی۔ یہ سزا دینے والے صرف سر آئزک ہی نہیں تھے، ان کا تو صرف ایک چہرہ تھا جو مجھے دکھائی دے رہا تھا یا ان کا نمک خوار پیٹر۔۔۔۔ جس کا کاندھا ان لوگوں نے استعمال کیا تھا۔ اصل میں تو اس سازش کے پیچھے لندن کا ہر تنگ نظر اور رئیس یہودی شامل تھا موجود تھا۔ ایک معمولی سے لڑکے کی جرأت پر ان سب کا تو خون ہی کھول اُٹھا ہوگا جس نے وقت کے اس بہت سے بڑے سرمایہ دار طبقے سے ٹکر لینے کی جرأت کی تھی۔ وہ مجھے اب عبرت کی مثال بنا دینا چاہتے تھے۔ تاکہ ایسی جرأت پھر دوبارہ اور کوئی نہ کر سکے۔ لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ سارہ کی زبانی میرا پیغام لندن کے گلی کوچوں میں پھیل چکا تھا اور اَب یہ بات چل نکلی تھی۔ مجھے اس لمحے سارہ پر بے حد پیار آیا۔ کیا دُنیا میں سچ کا دامن تھامنے والی ایسی متوالی لڑکی کوئی اور ہو سکتی ہے۔۔۔؟

OO

چلتے چلتے

شام تک سب سے پہلے سر آئزک کے ذریعے سارہ کو اور پھر سارہ کے ذریعے ربیکا، جم ڈیوڈ، ٹینا اور جانے کس کس تک یہ بات پہنچ چکی تھی کہ مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ وہ سب کے سب کامران کے فلیٹ پر جمع ہونا چاہ رہے تھے لیکن مَیں جانتا تھا کہ یہاں کچھ ہی دیر میں وہ ہلڑ بازی ہوگی کہ جگہ کم پڑ جائے گی۔ اس لیے مَیں نے ربیکا کو کہا کہ وہ ان سب کو لے کر کامران کے ریسٹورنٹ پہنچ جائے۔ لیکن سارہ نے میری بات ماننے سے انکار کر دیا اور اُس نے مجھے گھر سے لے کر کامران کے ریسٹورنٹ جانے کا فیصلہ سنا دیا۔ مَیں جانتا تھا کہ سارہ سے مزید بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی ذہنی حالت کا بھی اندازہ تھا۔ لہٰذا میں چُپ ہی رہا۔ مَیں اپنی سفید جین کے اوپر نیوی بلیو سویٹر گلے سے نیچے کھینچ ہی رہا تھا کہ سارہ کی گاڑی کا ہارن بج اُٹھا۔ جلدی سے جوتے پیروں میں ڈالے اور نیچے پہنچا تو سارہ پریشان سی اپنی سفید بیٹل سمیت موجود تھی۔ اس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ روئی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے گہرے رنگ کا دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر لگا لیا حالانکہ دھوپ تو اب ڈھل چکی تھی۔ مَیں چُپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سڑک کے کونے پر اسپینش گٹار بجانے والی لڑکی جینی ابھی تک موجود تھی۔ اُس نے مجھے شاید سارہ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے گاڑی جیسے ہی اس کے قریب پہنچی وہ جلدی سے آگے بڑھ آئی۔ اس کے ہاتھ میں گلاب کی دو کلیاں تھیں جو اُس نے مجھے اور سارہ کو پیش کر دیں اور مسکرا کر بولی۔

"فار سینورا۔۔۔۔ ماو۔۔۔۔"

میں نے مسکرا کر اس سے پھول لے لیا اور جیب سے اُسے چند روپے نکال کر دینے کے لیے آگے بڑھائے، لیکن اُس نے مسکرا کر میرا ہاتھ روک دیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولی۔

"نہیں ۔۔۔ یہ میری طرف سے ہے ۔۔۔ آپ کے لیے بھی ۔۔۔ اور مادام کے لیے بھی ۔۔۔" سارہ نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"ہوں ۔۔۔ تمھارے چاہنے والوں کی گنتی پوری نہیں ہو پاتی ۔۔۔ جہاں جاتے ہو اپنا جادو بکھیر دیتے ہو ۔۔۔ اپنی گلی میں بھی کافی مقبول ہو ۔۔۔ ہاں ۔۔۔؟"

مَیں سارہ کی بات سُن کر مسکرا دیا۔

"تم ساتھ ہو نا ۔۔۔ اس لیے لوگ خصوصی اہمیت دے رہے ہیں ۔۔۔ یہ میرے نہیں ۔۔۔ تمھارے جادو کا اثر ہے سارہ میڈم۔"

سارہ میری بات سُن کر ہنس دی۔ اس کے چہرے پر چھایا غبار کچھ چھٹ سا گیا۔ ڈھلتی شام پھر سے روشن ہو گئی۔ سارہ نے رش کی وجہ سے گاڑی کی شہر کی مضافاتی سڑک کے راستے پر ڈال دیا۔ یہ راستہ درمیان شہر کی گلیوں والے راستے سے بہت لمبا تھا لیکن اس وقت دفتروں سے چھٹی کی وجہ سے سڑکوں پر اس قدر ہجوم تھا کہ ہم اس شہر سے باہر والے راستے سے کہیں جلدی ٹریفالگر اسکوائر تک پہنچ جاتے جہاں سے تیسری سڑک کے بہت بڑے اور سڑک سے بھی چوڑے فٹ پاتھ کے کونے پر کامران کا ریسٹورنٹ موجود تھا۔ اب ہماری گاڑی ٹیمز ریور کے پُل سے گزر رہی تھی۔ دُور سورج کی آخری کرنیں پُل کی بڑی بڑی برجیوں کی نوکیلی چوٹیوں کو چوم کر الوداع کہہ رہی تھیں۔ دریا میں پگھلے سونے کی لمبی لمبی سی تاریں تیر رہی تھیں۔ کار اس طویل پُل کو پار کر کے اب پل کے ساتھ دوڑتی، بل کھاتی، کالی لمبی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ سارہ نے کچھ دُور جا کر دریا کے کنارے گاڑی روک دی اور گاڑی سے نکل کر سڑک کی ڈھلان پر بنی لوہے کی اس لمبی سی پٹی کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی جو دریا کنارے سڑک کے ساتھ ساتھ دُور تک بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ سورج اب ڈوب چکا تھا لیکن شفق کی لالی اَب آسمان پر نارنجی رنگ بکھیر رہی تھی۔ یہ نارنجی رنگ جب دریا کنارے پڑی برف کی پٹی پر پڑتا تو مجھے اپنے محلے میں آنے والے گولے گنڈے والے کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی تو ایسے ہی سفید برف کا گولا بنا کر اس کے اوپر شیشے کی بوتلوں میں بھری لال، نیلی، پیلی اور نارنجی رنگ کی شربت انڈیل کر گولہ ہمارے حوالے کر دیتا تھا اور پھر ہم سب بچے دیر تک مزے لے لے کر وہ برف کا گولہ چُوستے رہتے تھے۔

سارہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑی خاموش دریا کے بہتے پانی کو دیکھتی رہی۔ اس نے اب بھی اپنی آنکھوں سے وہ گہرے رنگ کا کالا چشمہ نہیں اُتارا تھا۔ لیکن مَیں جانتا تھا کہ اس چشمے کے نیچے اس کی گھنی پلکیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ پھر بالآخر اس نے خود ہی یہ خاموشی توڑی۔

"پاپا نے اچھا نہیں کیا ۔۔۔ مَیں انہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔ انہوں نے میرا بھرم توڑ دیا ہے۔ وہ ایک کمزور شخص نکلے میڈی ۔۔۔ میں ۔۔۔ میں بالکل ٹوٹ گئی ہوں۔"

بالآخر اس کے صبر کا بند ٹوٹ گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ اس نے اپنے اندر بائیس سالوں سے جس باپ کا بُت سب سے اُونچی جگہ پر سجا کر رکھا ہوا تھا۔ شاید آج وہ بُت پاش پاش ہو گیا تھا۔ مَیں نے سارہ کی آنکھوں سے اس کا چشمہ اُتار دیا ۔۔۔ اپنی انگلیوں اور ہتھیلیوں سے اس کے بہتے آنسو صاف کیے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیے۔

"تم دنیا کی سب سے مضبوط لڑکی ہو مس آئزک ۔۔۔ تمھارے یہ بہتے آنسو تمھیں کمزور نہیں بنا سکتے۔ ابھی تمھیں زندگی میں ایسے اور بہت سے تجربات سے گزرنا ہوگا۔ اور اس وقت شاید مَیں یا تمھارے دوستوں میں سے بھی بہت سے تم سے دُور ہوں گے۔ اس لیے خود کو ابھی سے سنبھالو سارہ ۔۔۔ مَیں تمھیں یوں کمزور پڑتے نہیں دیکھ سکتا۔"

سارہ اب بھی سسک رہی تھی۔

"نہیں حماد ۔۔۔ مَیں اتنی طاقتور نہیں ہوں، مجھے اتنا بڑا مقام نہ دو اپنی نظروں میں ۔۔۔ اتنی بھاری ذمہ داری نہ ڈالو میرے کاندھوں پر ۔۔۔ مَیں تو بہت کمزور لڑکی ہوں ۔۔۔ نہیں نبھا پاؤں گی یہ سب کچھ ۔۔۔ نہیں نبھا پاؤں گی۔"

"تمھیں نبھانا ہوگا ۔۔۔ تم ہی نبھاؤ گی ۔۔۔ یہ مَیں جانتا ہوں۔"

مَیں نے زور سے سارہ کو کاندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"اور سر آئزک نے وہی کیا جو ایک جنگ میں کوئی دشمن دوسرے دشمن کے ساتھ کرتا ہے۔ ان سے کیسا گلہ ۔۔۔؟ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ یقین جانو مجھے ان سے کوئی ذاتی شکایت نہیں ہے۔"

سارہ چلا کر بول پڑی۔

''لیکن کیوں؟۔۔۔ایسی کیا جنگ ہے ان کی تم سے۔۔۔؟۔کیا دشمنی ہے۔۔۔؟ کیا ہے تمھارے پاس ایسا کہ سارا شہر تم سے خوف زدہ ہے۔۔۔مَیں آج تک اپنے آپ کو اپنی نسل کو عظیم سمجھتی رہی لیکن تم نے ایک جھٹکے میں ہی ہماری عظمت کے تمام احساسات کو تار تار کر دیا۔۔۔مَیں پاپا کو دنیا کا سب سے مضبوط آدمی سمجھتی تھی لیکن وہ تو سب سے زیادہ کمزور نکلے۔۔۔تم نے تو ہمیں صرف سچ کو کھوجنے کی دعوت دی تھی۔۔۔وہ سچ کیا ہے جس سے میرا مضبوط باپ بھی کتراتا ہے۔۔۔مجھے تو یہ معاملہ صرف ہالوکاسٹ تک کا نہیں لگتا۔۔۔مجھے بتاؤ حماد۔۔۔مَیں کیا کروں۔۔۔کس پر اعتبار کروں۔۔۔مجھے لگتا ہے مَیں سوچ سوچ کر پاگل ہو جاؤں گی۔۔۔میرے اندر میرے اپنے بنائے ہوئے آئیڈیلز ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے ہیں۔مَیں اندر سے مر رہی ہوں۔۔۔میرا اعتبار ۔۔۔میرا بھرم ٹوٹ رہا ہے۔۔۔مَیں کیا کروں۔۔۔کہاں جاؤں۔''

سارہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور اپنا درد کہتی رہی۔

''تم صرف اپنے دل پر اعتبار کرو۔۔۔جو تمھارا دل کہے۔۔۔وہی سچ ہے ۔۔۔کبھی کبھی فیصلہ دل پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔۔۔اب چلو۔۔۔وہاں ریسٹورنٹ میں سب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔تم جانتی ہو نا ربیکا کے دل پر کیسی چھُریاں چل رہی ہوں گی اس وقت۔''

سارہ مسکرا دی مَیں جانتا تھا کہ کس بات سے اس کا موڈ بہتر ہو سکتا ہے اور یہی میں چاہتا تھا۔میں نے اس کا سیاہ چشمہ اس کے بالوں میں سجا دیا۔ہم دونوں دُور اوپر سڑک کے کنارے کھڑی ہماری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔میں سارہ سے دو قدم آگے تھا۔اچانک سارہ نے رک کر مجھے آواز دی۔

''ہے میڈی۔۔۔''

میں نے پلٹ کر سارہ کو دیکھا۔

''کیا تمھیں یقین ہے کہ دل ٹھیک فیصلہ کرے گا۔مجھے کوئی دھوکا تو نہیں دے گا۔''اس کی بات سُن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نہیں۔۔۔تمھارا دل تمھیں کبھی دھوکا نہیں دے گا۔۔۔اتنی اچھی لڑکی کا دل کبھی دھوکے باز نہیں ہو سکتا۔''

میرا جواب سُن کر وہ بھی مسکرا دی۔ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور پھر سارہ نے نہ جانے کن شارٹ کٹ راستوں سے گاڑی نکالی کہ ہم آدھے گھنٹے میں کامران کے ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے تھے۔وہاں تو واقعی میلہ سا لگا ہوا تھا۔میری تقریباً پوری کلاس ہی موجود تھی اور چند دیگر سمسٹرز کے لڑکے لڑکیاں بھی وہاں رفتہ رفتہ پہنچ رہے تھے۔کامران ریسٹورنٹ کے اندر اور باہر کافی مصروف نظر آ رہا تھا۔ہم دونوں کو پہنچتے دیکھ کر وہیں دُور سے چلایا۔

''مسٹر حماد امجد رضا۔۔۔پانچ سو سینتیس پاؤنڈ کا بل بن چکا ہے۔براہِ مہربانی کاؤنٹر پر تشریف لے آئیے۔''

ربیکا نے فوراً اعلان کیا کہ وہ آج کا تمام بل خود دے گی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ کامران کبھی اس سے بل کا ایک پیسہ بھی نہیں لے گا۔ہم سب ریسٹورنٹ کے باہر فٹ پاتھ پر لگی کرسیوں پر ہی ٹک گئے۔اندھیرا ہو چکا تھا اور پندرھویں اسٹریٹ، جس پر کامران کا ریسٹورنٹ موجود تھا اب جگمگانے لگی تھی۔کافی کی خوشبو آس پاس بکھرنے لگی تھی۔جہاں دیدہ بوڑھے سگار سلگائے کبھی نہ سلجھنے والے مسئلوں پر بات کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر بنے ریسٹورانٹس میں لگی کرسیوں پر جمع ہو رہے تھے۔جلتے سگاروں کی مہک سے سماں دھواں دھار ہونے لگا تھا۔

کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں کہ اگر دن کے چوبیس پہروں میں شام کا پہر نہ ہوتا تو ہماری زندگی کتنی بے رنگ ہوتی۔۔۔ایک خوبصورت شام، دوستوں کا ساتھ چھلکتی خوشبوئیں ۔۔۔یہ سب کتنی بڑی نعمت ہیں۔۔۔ہماری زندگی میں کیسی کیسی نعمتیں ہیں جن کا ہم شکر تو دُور کی بات ہے ٹھیک سے کبھی احساس بھی نہیں کر پاتے۔۔۔آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ شاعروں نے دیوان کے دیوان صرف اس ایک شام پر کیوں لکھ مارے ہیں۔

میرے تمام کلاس فیلوز بے حد بپھرے ہوئے تھے۔جم کل صبح سے شہر کی مرکزی شاہراہوں پر مظاہرے کرنے کا شیڈول طے کر رہا تھا، ربیکا ایک میز پر چڑھی تقریر کر رہی تھی

کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے مجھے بے دخل کرنے کے بعد یونیورسٹی صرف اس لیے بند کر دی ہے تا کہ ان کے جھوٹ پر پردہ پڑا رہے۔ آس پاس کے فٹ پاتھ ریستورانوں کی میزوں پر بیٹھے بوڑھے بھی اب ربیکا کی تقریر دلچسپی سے سن رہے تھے اور عام اسٹوڈنٹس کے ساتھ گرمجوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ تمام طالب علموں نے غیر معینہ مدت کے لیے یونیورسٹی سے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سارہ اُن کو یہ سمجھانے میں لگی ہوئی تھی کہ انہیں جو بھی قدم اُٹھانا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور قانون کے دائرے میں رہ کر اٹھانا ہوگا تا کہ یونیورسٹی انتظامیہ کسی بات کا فائدہ نہ اٹھا سکے، لیکن اس وقت ان سب کے جذبات اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ وہ سارہ کی بات بمشکل ہی سمجھ پا رہے تھے۔ ابھی یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ مَیں نے نیلی بتی چھت پر سجائے تین لمبی سفید کاروں کو پندرہ ویں گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ یقیناً یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں جن کی آواز والے سائرن بند کیے گئے تھے۔ گاڑیاں ریستوران سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوگئیں۔ اگلی گاڑی میں سے پارکر اپنی پتلون کے گیلس کھینچتا ہوا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی دُور سے ہی اُس نے گرمجوشی سے ہاتھ ہلایا۔ دیگر لڑکے لڑکیوں نے کڑی نگاہوں سے ان سب سادہ وردی والے پولیس آفیسرز کو گھورا، اور لندن پولیس کے خلاف بھی نعرے بازی کی۔ مَیں نے ہاتھ کے اشارے سے ان سب کو روکا۔ پارکر چیونگم چباتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے اور سارہ سے ہاتھ ملایا ہم تینوں ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ اسٹوڈنٹس پھر سے اپنے پُرانے مشغلے میں جُت گئے۔ پارکر نے غور سے تمام طلبا اور ان کے جوش اور جذبے کو دیکھا۔

"ایک ہی دن میں یہ ہماری دوسری ملاقات ہے۔ اور مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ دونوں مرتبہ تم نے اپنے بے حد مضبوط ہونے کا مجھے احساس دلایا ہے۔ جس طرح سے تمھارے صرف ہاتھ کھڑے کرنے پر یہ سارا ہجوم چُپ ہو گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت پڑنے پر یہ تمھارے کہنے پر کسی دریا میں بھی بخوشی چھلانگ لگا دیں گے۔"

اتنے میں بیرا ہم سب کے لیے کافی کے کپ میز پر رکھ گیا۔ ساتھ ہی کچھ نمکین بسکٹ اور پیسٹریاں بھی تھیں۔ پارکر نے ایک پیسٹری اُٹھا کر منہ میں رکھی۔ سارہ حیرت سے اس کی اور میری بے تکلفی کو دیکھ رہی تھی۔ مَیں نے سارہ کا تعارف کروایا۔

"یہ مسٹر پارکر ہیں۔ لندن کی خفیہ پولیس کے سیکشن انچارج۔۔۔ اور یہ مس سارہ آئزک ہیں۔ میری ہم جماعت۔"

"میں ان سے واقف ہوں۔ بلکہ آج کی تاریخ میں لندن کی پولیس اور انتظامیہ میں شاید ہی کوئی بدقسمت ایسا ہو جو مس آئزک سے واقف نہ ہو۔"

"آپ بے فکر رہیں مسٹر پارکر۔۔۔ مَیں اور سارہ اسی لیے یہاں آئے ہیں ان سب کو کسی بھی غلط قدم اُٹھانے سے روک سکیں۔ لیکن آپ یہاں کیسے؟"

پارکر مسکرا دیا۔

"اب تو جہاں تم وہاں ہم۔۔۔ مجھے خصوصی طور پر تم پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تمھارے مداحوں کی تعداد دیکھ کر لگتا ہے کہ اوپر والوں کی پریشانی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے۔"

سارہ کے ہاتھ میں کافی کا کپ بہت دیر سے یونہی تھما ہوا تھا۔ کافی کی اُٹھتی بھاپ کے عقب سے اس کی وہ دو گہری آنکھیں جانے کس سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ پارکر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں مس آئزک۔۔۔ شاید اپنے دوست کے لیے۔"

سارہ نے چونک کر پارکر کو دیکھا۔

"حماد بے قصور ہے۔۔۔ اُسے ناکردہ گناہ کی سزا دی جا رہی ہے۔"

پارکر نے دوسری پیسٹری منہ میں ڈالی۔

"انقلابی کا سب سے بڑا گناہ، انقلاب کی ترغیب ہی ہوتا ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایسے گناہ گاروں کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ حاکم کے نزدیک لوگوں کی سوچ بدلنے سے بڑا گناہ بھلا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور حماد بھی اسی جرم کا مجرم ہے۔"

"اگر حماد کا ٹرم پیپر کسی انقلاب کی ترغیب تھا تو مَیں بھی تو اس میں برابر کی شریک ہوں۔ مَیں نے بھی وہی گناہ کیا ہے۔ پھر مجھے کیوں سزا نہیں دی جا رہی۔۔۔؟"

"سزا تو آپ کو بھی دی جا رہی ہے مس پارکر۔۔۔ آپ کے دوست کو آپ سے دُور کر کے۔۔۔ آپ کے چہرے پر یہ بے چینی، یہ اُداسی بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی نا۔"

جانے پارکر نے یہ بات دانستہ کی تھی یا نادانستہ طور پر اس کے منہ سے یہ سچ نکل گیا تھا۔

سارہ پھر وہاں بیٹھ نہیں پائی کیونکہ شاید وہ اپنی اندرونی حالت پارکر پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ معذرت کر کے وہاں سے اُٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد پارکر نے میری جانب دیکھا۔

''تم بہت خوش قسمت ہو مسٹر حماد۔۔۔ تمھیں سارہ جیسی دوست کا ساتھ ملا ہے۔۔۔ ملاوٹ اور بے ایمانی کی اس دُنیا میں ایسے سچے رشتے اور سچے جذبے کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مَیں تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ پیٹر نے باقاعدہ تحریری طور پر تمھارے خلاف درخواست جمع کروادی ہے۔ لیکن مَیں نے چیف کو یقین دلایا ہے کہ صبح تم سے ملاقات کے بعد میرے تم سے متعلق تمام خدشات دُور ہو گئے ہیں لہٰذا تمھیں باقاعدہ بلوا کر تم سے جواب لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہماری اطلاع کے مطابق لندن کے مضافات میں اور قرب وجوار کی یہودی بستیوں میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ یہودی تمھاری یہاں موجودگی کو اپنی نئی نسل کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ ان کے ایک خاص نمائندے آئزک کی بیٹی بھی تمھارے ساتھ وفاداری کا بھرم رکھنے والوں میں سب سے آگے کھڑی ہے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک بڑا چیلنج اور بڑی تضحیک کی بات ہے۔ فی الحال لندن انتظامیہ نے معاملات کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ یہودی طبقہ تشدد اور توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار کر کے اس معاملے کو بگاڑنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ سارہ کے تمھارے ساتھ ہونے کی وجہ سے شاید وہ براہِ راست تو تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔۔۔ لیکن مجھے آس پاس تمھاری نسل کے مزدور اور عام محنت کش طبقے کے نقصان کا بے حد خطرہ ہے۔ وہ ان غریب لوگوں پر اپنی بھڑاس اس رات کی طرح آسانی سے نکال سکتے ہیں۔''

مجھے پارکر کی بات نے بے حد پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ میری وجہ سے کوئی دوسرا غریب مسلمان سزا کیوں بھگتے۔ پارکر ٹھیک کہہ رہا تھا۔ انہوں نے سارہ کی تقریر والی شام بھی اخبارات نکلنے کے بعد رات کو اکا دکا علاقوں میں وہاں کے رہائشی مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کی تھی اور چند جگہوں پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔ یہ آگ دھیرے دھیرے مزید بھڑک بھی سکتی تھی۔ لندن انتظامیہ اور پولیس کی تشویش بے جا نہ تھی۔ مَیں نے پارکر سے ہی سوال کیا۔

''آپ کے خیال میں ان کے اس غصے کا راستہ روکنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

میں اُسی طرف آ رہا تھا۔ قانونی طور پر تمھاری پوزیشن بہت مضبوط ہے کیونکہ تم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا جس کا بہانہ لے کر تم پر ہاتھ ڈالا جا سکے۔ بلکہ لندن پولیس کے لیے تم باہر رہ کر اتنے خطرناک نہیں ہو جتنا اندر جا کر ہو جاؤ گے۔ کوئی بھی اچھا وکیل گرفتاری سے قبل بھی تمھاری ضمانت منظور کروا سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان خطوط پر سوچ ہی نہیں رہے۔ لیکن مَیں اس وقت لندن انتظامیہ کی طرف سے تمھارے پاس ایک رضا کارانہ اپیل لے کر آیا ہوں۔

''رضا کارانہ اپیل۔۔۔؟'' مَیں نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں۔۔۔ مَیں انتظامیہ کی طرف سے تم سے یہ اپیل کرنے آیا ہوں کہ اس سے پہلے کہ یہ چنگاری فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں بھڑک اُٹھے۔۔۔ تم کچھ عرصے کے لیے لندن چھوڑ دو۔ خود اپنی مرضی سے۔''

میرے سر میں دھما کا سا ہوا۔

''لندن چھوڑ دوں۔۔۔؟ لیکن کیوں۔۔۔ اور اس سے فائدہ کیا ہوگا؟''

''بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ بھڑکے ہوئے یہودیوں کو فساد کا کوئی بہانہ نہیں مل پائے گا۔ وہ تم کو ہی اصل خطرہ سمجھتے ہیں۔ تمھارے جانے کے بعد ان کے اندر کا خوف اور دشمنی ٹھنڈی پڑ جائے گی۔۔۔ ویسے بھی یونیورسٹی نے تمھیں فی الحال واپس داخلے کی کوئی بھی سفارش رد کر دی ہے۔ تم اگر چاہو تو لندن سے باہر رہ کر بھی یونیورسٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتے ہو۔ یہاں رہو گے تو تمھارے ساتھی طلبا دھیرے دھیرے بھڑک کر لندن کی سڑکوں پر آ جائیں گے اور اس کا نقصان دوسرے لوگوں کو ہوگا۔ مَیں جانتا ہوں کہ تمھارا مقصد طلبا کی طاقت کو منفی انداز میں استعمال کرنا نہیں ہے کیونکہ اگر تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ کب کی یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا ہوتا۔ لیکن میرا یقین کرو۔۔۔ تمھاری لندن میں موجودگی بہت سے بے گناہوں اور معصوم انسانوں کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میری بات پر غور کرنا۔۔۔ مجھے تمھارے جواب کا انتظار رہے گا۔''

پارکر مجھے گہری سوچ میں چھوڑ کر وہاں سے اُٹھ گیا۔ سارہ بہت دیر سے دُور بیٹھی ہم دونوں کو بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ پارکر کے جاتے ہی وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی

کہ کیا معاملہ تھا۔ میں نے پارکر کی تمام بات ''الف'' سے لے کر ''ی'' تک اُسے سنا دی۔

سارہ نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں ۔۔۔۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ جو بھی ہوگا ہم سب مل کر اس کا سامنا کریں گے۔ مَیں جانتا تھا اس وقت سارہ کو کچھ بھی سمجھانا بہت مشکل ہوگا۔ اس لیے میں چپ رہا، وہاں ربیکا بار بار ایک میز پر چڑھی میرا نام پکار رہی تھی کہ میں آ کر اپنے ''زریں خیالات'' کا اظہار کروں، مَیں نے ان سب کے درمیان جا کر انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا کہ فی الحال ہمارے پاس قانون اور عدالت کا راستہ موجود ہے اور کھلا ہے لہٰذا اس وقت احتجاج کو موخر کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ جب میں نے ان سب سے کہا کہ میرے لیے یونیورسٹی کی ڈگری سے کہیں زیادہ اہم ان سب کی دوستی ہے۔ محبت ہے جو مجھے آج حاصل ہے تو سب ہی افسردہ ہو گئے۔ ربیکا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ مَیں نے جم کو خصوصی طور پر علیحدگی میں لے جا کر اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس سے وعدہ لیا کہ وہ خود کو بھی اور اپنے ساتھ تمام دوسروں کو بھی قابو میں رکھے گا۔ جم کو سمجھانا واقعی ایک مشکل کام تھا لیکن جب میں نے اُسے پارکر کی بتائی ہوئی ساری باتیں کہیں اور اسے سمجھایا کہ ہمارے اس احتجاج اور میڈیا پبلسٹی کو ہماری مخالف پارٹی معصوم لوگوں پر تشدد کرنے کے خلاف استعمال کرے گی تو اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا۔ عجیب جذباتی نوجوان تھا یہ جم بھی۔ اسے دیکھ کر اور اس سے مل کر مجھے ہمیشہ عباد کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ بھی ایسا ہی تھا، سر پھرا سا، دوستوں کی خاطر سب کچھ لٹا دینے والا۔ جاتے ہوئے جم نے بہت دیر تک مجھے گلے لگائے رکھا، سب ہی فرداً فرداً مجھ سے رخصت ہوئے۔ ربیکا نے جاتے ہوئے جانے سارہ کے کان میں مجھے دیکھ کر کیا کہا کہ سارہ ہنس پڑی۔ ربیکا بھی ہم سے رخصت ہوگئی۔ جاتے جاتے اس نے اچانک میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر میرے ماتھے کو چوم لیا، اور نم پلکوں کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ کسی انسان کی معراج اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان اُسے ٹوٹ کر چاہے۔ اپنے دن اور رات اس کے نام کر دے ۔۔۔۔ آج مجھے ایک لمحے میں ہی خدائی کا مطلب سمجھ میں آ گیا تھا ۔۔۔ جب ایک انسان کا پیار آپ کو اس احساس سے دوچار کر سکتا ہے تو ازل سے لے کر ابد تک آنے والوں انسانوں کی بندگی کا احساس کیا ہوتا ہوگا۔ آج مَیں نے جانا تھا کہ

خدا کو بندگی اس قدر پسند کیوں ہے۔

واپسی پر میں نے آتے ہوئے گاڑی میں سارہ سے پوچھا کہ ربیکا نے اُسے جاتے ہوئے کان میں کیا کہا تھا۔ سارہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کہہ رہی تھی یہاں سے سیدھے گھر ہی میڈی کو ڈراپ کرنا ۔۔۔۔ کہیں گھومنے نہ نکل جانا۔''

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

''پھر تم نے کیا کہا۔''

''میں نے اُس سے کہا کہ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ ایسا موقع ہاتھ سے جانے دوں۔'' ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ سارہ نے ہائیڈ پارک سے دائیں کو مڑنے والی چوڑی سڑک پر گاڑی موڑ لی۔ دُور پکاڈلی سرکس کے بڑے بڑے جھولوں کی روشنیاں جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ مَیں نے سوالیہ نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا۔

سارہ مسکرائی۔

''رات کے دس بجے ایک اچھی میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم سفر کو گھر چھوڑنے سے پہلے رات کے کھانے کا ضرور پوچھے۔ یہاں میری پسند کا ایک ریستوران ہے کیا تم میرے ساتھ وہاں ڈنر کرنا پسند کرو گے؟''

''ہاں ۔۔۔۔ ضرور لیکن اس شرط پر کہ بل مَیں ادا کروں گا۔ دراصل آتے ہوئے میں کامران کا بٹوہ اُٹھا کر لے آیا تھا۔ اسی طرح واپس کر دوں گا تو اس کے دل کو بہت ٹھیس لگے گی۔''

سارہ ہنس دی اور گاڑی ایک لمبا سا موڑ کاٹ کر دھیمی روشنیوں والے اس ریسٹورنٹ کے باہر آ کر کھڑی ہوگئی۔ سارہ کی پسند بھی عام ہو نہیں سکتی تھی۔ مجھے ہال میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوگیا تھا۔ نہایت نفاست سے دُور دُور لگی ہوئی مدھم روشنیوں سے جگمگاتی میزوں والے اس طویل و عریض ہال میں جس کے ایک جانب لکڑی کا بہت بڑا سا فرش (ڈانس فلور) اور بار بھی موجود تھا۔ عام لوگ نہیں آتے ہوں گے۔ سارہ کو وہاں کا عملہ شاید اچھی طرح جانتا تھا۔ تبھی انہوں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا پُرتپاک استقبال کیا اور بھی مس

آئزک کہتے کہتے تھک نہیں رہے تھے۔ سارہ نے ہال کی ایک جانب لگی خوبصورت سی میز بیٹھنے کے لیے پسند کی۔ ہال میں ہلکے سُروں میں میرے لڑکپن کا پسندیدہ گانا ''پچھلے کرسمس میں نے تمھیں اپنا دل دے بیٹھا تھا'' کی دھن بج رہی تھی۔ چند جوڑے فلور پر ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنے محبوب کے شانوں پر سر رکھے جھوم رہے تھے۔ مغربی موسیقی اگر ہلکے سُروں میں ہو تو کبھی کبھی مشرقی موسیقی سے بھی زیادہ کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ جانے کیوں مجھے چیختے چنگھاڑتے گانے اور موسیقی کبھی بھی نہیں بھائی تھی۔ ہماری میز پر رکھی دو شمعیں روشن کر دی گئی تھیں اور اُن کی لو میں سارہ کا کندن رنگ مزید دمکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بال بکھر بکھر سے جاتے جنھیں وہ پھر سے سنوارنے کی تگ ودو سے تھک سی گئی تھی۔ بے خیالی میں اس کی مجھ پر نظر پڑی تو اپنی اس معصوم سی حرکت پر خود ہی مسکرا دی۔ اس کی ستارہ آنکھیں بار بار نم ہونے کی کوشش کرتیں لیکن وہ بڑی صفائی سے اُس نمی کا راستہ روک لیتی تھی۔ بہت دیر تک ہم یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مَیں نے ہی خاموشی کو توڑا۔

''ایک اچھی میزبان کا فرض صرف کھانا کھلانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اچھی اچھی باتیں کر کے اپنے ہم راہی کا دل بہلانا بھی ہوتا ہے مس سارہ آئزک۔''

''تم ہی کچھ بولو نا۔۔۔ میں تم جیسی باتیں کہاں کر سکتی ہوں۔۔۔ مجھے تو صرف تمھیں سننا اچھا لگتا ہے۔ تمھارے ہونٹوں سے سُنی ہوئی ہر بات نئی لگتی ہے، خوبصورت لگتی ہے۔''

''یہ میری باتوں کا نہیں۔۔۔ تمھاری خوبصورت ساعت کا احساس ہے جو تمھیں میری عام سی باتیں بھی شاعری میں ڈھلی لگتی ہیں۔''

''تم کبھی کسی بات کا بھی کریڈٹ کیوں نہیں لینا چاہتے۔۔۔ اقرار کر لینا دل کو بہت سی نئی الجھنوں سے بچا دیتا ہے۔ کیا سمجھے مسٹر میڈی۔۔۔؟ مان لینا ہی سکون کا باعث ہوتا ہے۔''

آج سارہ کے لہجے میں کوئی نئی بات تھی۔۔۔ کچھ نیا پن تھا۔۔۔

''نہیں۔۔۔ مَیں اقرار سے بچ نہیں رہا۔۔۔ نہ ہی کسی بات کا کریڈٹ لینے سے

دامن بچا رہا ہوں۔ لیکن سچ یہی ہے کہ میرے اندر آج اگر تمھیں کوئی بھی خوبی نظر آئی ہے۔۔۔ میری ذات میری شخصیت۔۔۔ میری باتوں میں کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے تو اس کی وجہ میں نہیں۔۔۔ بلکہ ایمان ہے۔۔۔ اس کے بخشے ہوئے پیار کا احساس ہے، پیار انسان کو پیارا بنا دیتا ہے سارہ۔۔۔ اُس کے اندر سے تمام بُرائیاں نکال دیتا ہے۔۔۔ محبت انسان کے لہجے کا زہر چُوس لیتی ہے۔۔۔ اس کی باتوں میں مصری گھول دیتی ہے ۔۔۔ آنکھوں سے شہد ٹپکا دیتی ہے۔۔۔ محبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی۔۔۔ پری زاد بنا دیتی ہے۔''

سارہ غور سے میری طرف دیکھتی رہی۔۔۔ میری باتیں جیسے اپنی آنکھوں سے سُن رہی ہو۔۔۔ جذب کر رہی ہو۔۔۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''شاید مَیں بھی انسان نہیں رہی حماد۔۔۔ شاید میں بھی پری زاد بنتی جا رہی ہوں۔''

مَیں نے چونک کر سارہ کو دیکھا، اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور پلکوں کی شبنم گر کر سارے ماحول پر اوس کی بارش کرنے والی تھی۔

''ہاں حماد۔۔۔ مَیں نے خود پر بے حد قابو پانے کی کوشش کی۔۔۔ بہت روکا خود کو ۔۔۔ بہت لڑی ہوں خود سے۔۔۔ لیکن پھر بھی خود کو روک نہیں پائی۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے حماد۔۔۔ مَیں نے نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کا یہ میٹھا زہر چکھ لیا ہے حماد۔۔۔ پورا پیالہ حلق سے نیچے انڈیل لیا ہے حماد۔۔۔ مَیں کیا کروں۔۔۔ بہت بے بس ہو گئی ہوں۔۔۔ بہت لاچار ہو گئی ہوں میں۔۔۔''

اس لمحے میرے سارے لفظ ہی جیسے کہیں گم ہو گئے تھے۔ مَیں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن کچھ بول ہی نہیں پایا۔ سارہ کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور میز پر رکھی گلاب کی اِک پنکھڑی پر پڑ گئے۔ وہ بڑی ہمت کر کے پھر بولی۔ اس کی نظریں اَب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

''مَیں جانتی ہوں۔۔۔ تمھارے دل کے اندر صرف اِک خوش نصیب کا ہی بسیرا ہے۔ وہ جو تمھاری روح کی گہرائیوں تک تمھارے اندر بسی ہوئی ہے۔ تم نے کبھی کسی سے یہ راز نہیں چھپایا کہ ایمان کی محبت تمھارے خون کے ذرّوں میں شامل ہے۔ کتنی سچی ہے تمھاری محبت۔۔۔ لیکن اس کے باوجود میرا دل کیوں نہیں مانتا حماد۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیوں

میں اس دل کے ہاتھوں اس قدر بے بس ہوگئی ہوں کہ خود میرا مجھ پر، میرے دن رات پر، میری روح پر اختیار نہیں رہا۔۔۔۔ میرے لفظ میرے نہیں رہے۔ میری ساری شخصیت میری نہیں رہی۔۔۔ اُس محبت نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے حماد۔۔۔۔ اس سے کہو مجھے میرا آپ واپس لوٹا دے۔۔۔۔ میری سانسیں مجھے واپس سونپ دے۔''

میں سارہ کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ لفظ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ ہی پھسلتے جا رہے تھے۔ یہ سارہ نہیں۔۔۔۔ سارہ کے اندر کی لڑکی بول رہی تھی۔ سارہ تو بہت خاموش بہت کم گو لڑکی تھی۔ یہ تو پھر اُسی محبت کا ایک اور تازیانہ تھا جو اب اس معصوم لڑکی کی روح کو کچوکے لگا رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ محبت کے اس صحرا کی پیاس کب بجھے گی اور کتنے بے بسوں کی، لاچاروں کی روح کو اپنی ریت میں جذب کرے گا یہ صحرا؟ ازل سے انسانوں کے دلوں کے ساتھ یہ کھیل کھیل رہی ہے محبت۔ جانے کتنے جوان دل اس کی پیاس کی بھینٹ چڑھ چکے ہوں گے اب تک۔۔۔؟ لیکن اس کی حرص پھر بھی نہیں مٹتی۔ اب بھی ہر لمحہ ہر گھڑی کوئی نہ کوئی کہیں نہ کہیں کسی کی محبت میں مبتلا ہو رہا ہوتا ہے۔ بسمل کی طرح تڑپ رہا ہوتا ہے اور محبت دُور کھڑی ان روح نکلتے دلوں کی یہ تڑپ اور یہ بے بسی دیکھتی رہی ہے۔

میں سارہ سے کچھ نہ کہہ پایا۔ کہتا بھی تو کیا کہتا؟ بس میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔ وہ میز کی دوسری جانب یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ جلتی شمعوں کی روشنی میں اس کی بھیگی آنکھیں جگمگاتی رہیں۔ ہال میں بیٹھے سازندوں نے اسٹیو ونڈر کا نغمہ چھیڑ ''ہیلو۔۔۔۔ کیا تم میری ہی راہ دیکھ رہے ہو۔

میں تمہاری آنکھوں میں دیکھ سکتا ہوں
میں تمہاری مسکراہٹ میں کھوج سکتا ہوں
کہ تم تنہا ہو۔۔۔۔
اور کہیں کوئی تمہاری محبت میں مبتلا ہو رہا ہے۔''

اس نغمے کی دھن پر رقص کرتے جوڑوں کے قدم دھیرے دھیرے تھرک رہے تھے۔ پورے ہال کی مدھم روشنی میں دل کو چھو جانے والی محبت کا راج تھا۔ خوشبو تھی، رنگ تھے اور نور تھا۔ سارہ چپ چاپ بیٹھی میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسی ایک پل کو جی رہی تھی۔

سمیٹ رہی تھی۔ اپنی عمر کی نقدی میں جمع کر رہی تھی کہ زندگی گزارنے کے لیے عمر کی نقدی میں ایسا ایک پل بھی بہت ہوتا ہے۔ تمام عمر خرچ کرتے رہو، عمر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس پل کی پونجی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں نے دھیرے سے سارہ سے پوچھا۔

''مجھے بتاؤ۔۔۔ تمہارے اس درد کو ختم کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری زندگی، میری ساری عمر پر تمہارا حق ہے۔ تم جو چاہو گی ویسا ہی ہوگا۔''

سارہ دھیمے سے مسکرائی۔

''کاش محبت کا ہونا نہ ہونا بھی ہمارے بس میں ہوتا۔ کاش میرے پاس وقت کو پلٹنے کی طاقت ہوتی تو میں تمہیں تمہاری پہلی محبت سے پہلے ملنے کی کوشش کرتی۔ کاش جو عظمت تمہارے دل میں مجھ سے پہلے ایمان کی ہے۔ اس کی سب سے پہلی حق دار میں ہوتی۔ کاش میری محبت میں یہ ''کاش'' نام کا کوئی لفظ ہی نہ ہوتا۔ لیکن اس محبت کا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کی ابتدا ہی کاش سے ہوتی ہے۔ تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ تم نے اپنی پوری زندگی پر مجھے اختیار دے دیا ہے۔ اس سے زیادہ بڑی نعمت، اس سے زیادہ بڑی مہربانی اور انعام کیا ہوگا۔ میری اس ایک زندگی کے لیے تو تمہارا یہ اقرار ہی کافی ہے۔ بس ایک وعدہ کرو مجھ سے، میں جانتی ہوں ایمان کی یاد تمہارے دل سے تاابد نہیں مٹ پائے گی۔ لیکن جب کبھی تم کسی اور کو اپنی اس ابدی محبت کا حصے دار بنانا چاہو گے، تو میرا حق سب سے پہلے ہوگا۔ وعدہ کرو مجھ سے حماد۔۔۔۔ مجھے میرے ہونے کا بھرم دے دو، میرے وجود کی تصدیق کر دو۔''

میں نے سارہ کی نازک انگلیاں اپنی ہتھیلی میں تھام لیں۔

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

سارہ نے میرے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔ انہیں اپنی بند آنکھوں کے پپوٹوں پر بہت دیر تک جوڑے رکھا، جیسے کسی مسیحائی کی تاثیر کو اپنی بند آنکھوں سے اپنے پورے جسم میں، اپنی روح میں دھیرے دھیرے پکار رہی ہو، سیراب کر رہی ہو۔

سازندوں نے جارج مائیکل کا نغمہ چھیڑا۔

''لاپرواہ سرگوشیاں
میری سب سے اچھی دوست ہیں۔۔۔''

سارہ نے جیسے اپنی آخری خواہش ظاہر کی۔

''میرے ساتھ ایک بار رقص کرو گے۔۔۔۔؟''

سارہ کے معصوم انداز پر میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہم دونوں اُٹھ کر لکڑی کے گول فرش کی جانب بڑھ گئے۔ سارہ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اُس کا دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر بھی، ہم دونوں ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر کھڑے نغمے کی دھن پر اپنے قدم فرش پر رکھتے رہے۔ سازندوں کے سربراہ نے جو ایک لمبا نیگرو تھا، اپنا ہیٹ اُتار کر مجھے سلام پیش کیا۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ اَب جو نغمہ وہ اور اس کا گروپ مل کر بجائیں گے وہ صرف میرے اور سارہ کے لیے ہوگا۔ پھر لمبے نیگرو نے اپنے ساتھیوں کو کچھ اشارہ کیا اور نغمے کی دھن بدل گئی۔

(بیک اسٹریٹ بوائز) ایک مشہور بینڈ کا نغمہ گونجا۔

''یہ صرف لفظ ہی تو ہیں

جو میرے پاس ہیں، صرف لفظ۔۔۔۔

جن سے میں تمھارا دل

چرائے جا رہا ہوں۔''

ہم دونوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ڈانس فلور پر گھومتی ہوئی گول روشنی صرف مجھ پر اور سارہ پر آ کر رُک گئی تھی اور آس پاس کے سبھی رقص کرتے جوڑے لکڑی کے گول فرش کے دائرے میں کناروں پر کھڑے جانے کب سے صرف مجھے اور سارہ کو ہی دیکھ رہے تھے، سارہ کے رقص کا انداز بھی اسی کی طرح باوقار تھا۔ اس کے قدم عجلت میں نہیں اُٹھتے تھے جیسے بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھنے کی جگہ کا انتخاب کر رہی ہو۔ نغمے کی دھن ختم ہونے کے بعد جب آس پاس سے تالیوں کا شور اُٹھا تو ہم نے دیکھا کہ پورا ہال ہماری طرف ہی متوجہ ہے اور صرف ہم ہی روشنی کے گول دائرے میں کھڑے ہیں۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ہنس دی۔ اس کی ہنسی سے لگا جیسے تیز بارش کے دوران کالی گھٹا ایک دم چھٹ گئی ہو اور آسمان پر بادلوں کے درمیان سے اچانک سورج نکل آیا ہو۔ سب لوگ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ سارہ کے چہرے پر چھایا غبار بھی شفق کی میٹھی سُرخی میں بدل چکا تھا۔ یہ محبت بھی

پل پل میں کیسے کرشمے دکھاتی ہے، کیسے کیسے روپ بدلتی ہے۔

گھر واپسی پر ہم دونوں خاموش تھے۔ آج سارہ کو میری طرف سے اُسی بھرم کی ضرورت تھی جو اُس رات چرچ سے واپسی پر مجھے سارہ کی جانب سے درکار تھا۔

محبت اپنے اظہار کے پل جس قدر بے باک ہوتی ہے۔ وہ پل گزر جانے کے بعد اس سے کئی گنا زیادہ شرمیلی ہو جاتی ہے۔ سارہ کا بھی اس وقت وہی حال تھا۔ ہماری گاڑی لندن کی سنسان سڑکوں سے ہوتی ہوئی کامران کے فلیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔

سارہ کے گلے کا سکارف بار بار لہرا رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ میں نے دانستہ اُسے مخل نہیں کیا۔ کبھی کبھی ہمیں کسی کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ گاڑی کامران کے اپارٹمنٹ کے نیچے آ کر رک گئی۔ سارہ نے میری جانب دیکھے بغیر کہا۔

''آج کی رات میری زندگی کی سب سے حسین رات تھی حمادؔ۔۔۔۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔'' میں گاڑی سے نیچے اُتر آیا۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے ہال کے دروازے پر کھڑے دربان نے ہمیں گلاب کی ایک ایک کلی پیش کی تھی جو ہوٹل کے خوبصورت مونوگرام والے کپڑے کے چھوٹے سے رومال میں لپٹی ہوئی تھیں۔ گاڑی سے اُترتے ہوئے میری کلی وہیں انڈر ڈیش بورڈ پر پڑی رہ گئی تھی۔ سارہ نے گاڑی میں لگا قلم نکال کر اس رومال پر دن، تاریخ اور وقت لکھ کر اُسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

''میں اُسے نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ رہی ہوں۔۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔''

''گھر پہنچ کر مجھے ایک فون ضرور کر دینا، رات کافی بیت چکی ہے اور شہر میں تمھارے مداحوں کی تعداد بھی کافی ہے۔''

سارہ نے سر ہلایا۔ میں گاڑی سے دو قدم پیچھے ہٹا تاکہ وہ گاڑی آگے بڑھا سکے۔ سارہ نے اپنے گلے سے لپٹا سکارف کھولا اور گاڑی سے نیچے اُتر کر اُسے میرے گلے میں باندھ دیا۔

''یہ تمھارے ساتھ رہے گا تو ہمیشہ میری یاد دلائے گا۔''

سارہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور اس نے کار آگے بڑھا دی۔ میں اُسے گلی کے موڑ سے

مڑتے وقت تک دیکھتا رہا۔ ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں نے میرے وجود کو جھنجھنا دیا اور میرے گلے میں بندھا سارہ کا سکارف لہراتا رہا۔ یہ صرف ایک سکارف ہی نہیں تھا۔ یہ سارہ کے وجود کی خوشبو تھی۔ جو میرے گلے سے سکارف کی صورت میں لپٹی ہوئی تھی اور تمام ماحول پر دھیرے دھیرے چھا رہی تھی۔ دُور کسی گھنٹہ گھر نے رات کے سناٹے میں دو بجنے کا اعلان کیا۔ مَیں شکستہ قدموں سے اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

OO

الوداع

اگلے دو دن بہت ہی ہنگامہ خیز گزرے۔ جم کے بے حد کنٹرول کرنے کے باوجود چند اسٹوڈنٹس نے اچانک یونیورسٹی بند کرنے پر خوب ہنگامہ آرائی کی۔ ایک جلوس تو باقاعدہ سر آئزک اور جیوری کے خلاف نکالا گیا۔ اخبارات نے واقعات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور یہودیوں کے زیر اثر اخبارات نے تو سیاہ پروپیگنڈہ کی حد ہی کر دی۔ ان اخبارات نے میرے ٹرم پیپر کو یہودیوں کی مقدس تاریخ پر ایک حملہ قرار دیا۔ اور ان اخبارات کی ہرزہ سرائیوں کی وجہ سے تشدد کے واقعات میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہونے لگا۔

پارکر اس دوران مسلسل مجھ سے رابطے میں رہا اور لگاتار اپنی رضا کارانہ پیش کش کے بارے میں میرا جواب جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دن بھی مَیں اور کامران شام کو اکٹھے ہی تھے جب اس کا اپارٹمنٹ کے نمبر پر فون آیا تھا۔

''ٹھیک ہے مسٹر پارکر۔۔۔۔ میں لندن چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرے چلے جانے سے تشدد کی یہ لہر واقعی تھم جائے گی۔''

''مجھے پورا یقین ہے، ان کی اصل دشمنی تم سے ہے۔ یہ مزدور طبقہ بے چارہ ان کا کیا بگاڑ پائے گا۔ اور پھر میڈیا میں ان کا تاثر بھی ان واقعات کی وجہ سے بُری طرح خراب ہو رہا ہے۔ تمہارے چلے جانے کے بعد ان کے پاس کوئی وجہ نہیں رہ جائے گی لڑنے کی۔''

''ٹھیک ہے سر۔۔۔ مَیں تین دن بعد کی پہلی فلائٹ سے لندن چھوڑ دوں گا۔ آپ چاہیں تو اخبارات اور میڈیا کے ذریعے اس خبر کو ابھی سے شہر میں پھیلا دیں۔ مَیں اب ان کے ہاتھوں مزید کسی بے گناہ کا نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

دوسری جانب سے کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر پارکر کے گہرے سے سانس لینے کی آواز اُبھری۔

"مَیں جانتا تھا تم آخر کار یہی فیصلہ کرو گے۔ میں نے صرف اپنے اسی یقین پر ابھی تک لندن پولیس کو تمھارے خلاف کسی غلط الزام پر کوئی جھوٹی کارروائی کرنے سے روکے رکھا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کے لیے بہت سے ایسے لوگوں کی بھی سننا پڑی جن سے عام حالات میں میں بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ تم واقعی ایک بہادر لڑکے ہو۔ یہ لوگ تمھیں تو یہاں نکلنے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جو نظریہ تم بیج کی صورت میں ان کی نئی نسل کے دماغ میں بو گئے ہو۔ وہ اس نظریے کو کبھی اپنی آنے والی نسلوں کے دماغ سے نہیں نکال پائیں گے ۔۔۔ ہمیشہ خوش رہو۔"

پارکر نے فون رکھ دیا۔ کامران نے پریشانی سے میری طرف دیکھا۔

"تو کیا واقعی تم نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابھی سارے راستے بند نہیں ہوئے میڈی۔ مَیں نے شہر کے بہترین وکیلوں سے بات کی ہے۔ ہم آخری وقت تک ان سے لڑیں گے۔"

"مَیں نے قانونی لڑائی سے ہاتھ کب روکے ہیں یار۔ وہ جنگ تو تم یہاں میری غیر موجودگی میں بھی ضرور لڑو گے۔ لیکن فی الحال میرا منظر سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔ میری وجہ سے بہت سے معصوم لوگ مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ ان کا میرا ہم مذہب ہونا ہی سب سے بڑا جرم بن گیا ہے۔"

کامران کا غصہ اپنی جگہ بجا تھا اور پھر شام تک ٹی۔ وی اور اخبارات کے ذریعے میرے سبھی دوستوں کو بھی میرے اس فیصلے کی خبر ہو گئی۔ سب سے پہلے سارہ اور ربیکا پہنچیں۔ ربیکا نے تو آتے ہی آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔ تم نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ ہم تمھیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ اس روز ائیر پورٹ جانے والے تمام راستوں کا گھیراؤ کریں گے۔ سڑکوں پر لیٹ جائیں گے۔"

"تم کوئی اچھی سی صاف سڑک دیکھ کر لیٹنا۔۔۔ ورنہ صبح جو تم تین چار گھنٹے اپنے میک اپ پر لگاتی ہو وہ سب ضائع ہو جائیں گے۔"

ربیکا غصے میں بھی ہنس پڑی۔ لیکن پھر دوبارہ چلا کر بولی۔

"یہ مذاق کی بات نہیں ہے مسٹر میڈی۔۔۔۔ تم پر ہمارا ابھی کچھ حق ہے اور میں اسی حق کا سہارا لے کر کہتی ہوں کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔"

سارہ چُپ چاپ کھڑی تھی کیونکہ اُسے میرے فیصلے کی وجہ معلوم تھی۔ اس دن پارکر سے ہوئی تمام گفتگو اور پھر شہر کے واقعات پر شروع سے ہی اُس کی نظر تھی۔ لیکن اس کے انداز سے بھی صاف ظاہر تھا کہ اُسے میرے فیصلے سے سب جانتے ہوئے بھی بے حد دھچکا لگا ہے۔

ہم سب اس وقت کامران کے ریستوران کے باہر والے فٹ پاتھ پر لگی میزوں پر ہی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں جم، ڈیوڈ اور ٹینا وغیرہ بھی آ گئے۔ مَیں نے ان سب کے جذبات کو بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ انہیں اپنے لندن چھوڑنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی کہا کہ مَیں ہمیشہ کے لیے واپس نہیں جا رہا۔ ان سب سے رشتہ میرے خون میں شامل ہو چکا ہے اور اب چاہے مَیں دنیا کے کسی کونے میں بھی رہوں۔ میرا دل ان سب کے ساتھ ہی دھڑکے گا۔

ربیکا کے آنسو بار بار چھلک جاتے تھے۔ مَیں نے ماحول کو کچھ بدلنے کے لیے ربیکا پر چوٹ کی کہ کچھ لوگ دوستوں کو صرف نمکین آنسوؤں کے گلاس پر ہی ٹرخا کر رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہی منعقد کر دیں۔ ربیکا بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی اور اُس نے ہم سب کو، اپنی پوری کلاس کو اگلے دن اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ ان کا دل رکھنے کے لیے مَیں نے وہیں سے ان کے سامنے ہی فون پر اپنے وکلا کو چند ہدایات دیں کہ میرا کیس کس طرح سے عدالت میں پیش کرنا ہو گا۔ سارہ اس تمام دوران بالکل گم صم سی اور خاموش بیٹھی رہی۔ جانے اس کے ذہن میں کیا کشمکش سی چل رہی تھی۔

رات گئے وہ سب مجھ سے رخصت ہو گئے، سارہ بھی اپنی سفید بیٹل کی جانب بڑھ گئی۔ مَیں آج کامران کے ساتھ آیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ واپسی کا ارادہ بھی تھا۔ سارہ کے قدموں کی ہچکچاہٹ واضح تھی۔ کامران جو میرے ساتھ ہی میز پر بیٹھا تھا اُس نے خود ہی سارہ کی مشکل آسان کر دی اور سارہ سے چلّا کر کہنے لگا۔

"مس آئزک۔۔۔۔ اگر آپ میرے حال پر رحم کریں اور میرے اس جذباتی

دوست کو گھر چھوڑتی جائیں تو میں اپنا کچھ کام دھندہ کرلوں۔ اس کے باپ کے پاس تو اسے ورثے میں دینے کے لیے کافی دولت ہے جب کہ میرا باپ میرے لیے صرف دُعائیں چھوڑ گیا ہے۔'' سارہ کامران کی بات سُن کر مسکرا دی۔

''میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔''

کامران نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔

''جاؤ بیٹے حماد۔۔۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔۔۔ کیسے جان و جگر قسم کے دوست سے پالا پڑا تھا۔ حالانکہ میں جانتا ہوں وہ گاڑی کے قریب کھڑا میرا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن میں نے تمھیں یہ چانس بخش دیا ہے۔ جاؤ عیش کرو۔''

میں نے بھی اُٹھتے ہوئے کامران کے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

''بلی کے خواب میں چھیچھڑے۔۔۔''

کامران کا منہ بن گیا میں آ کر سارہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سارہ میری اور کامران کی نوک جھونک دُور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''تمھارا دوست کیا کہہ رہا تھا میڈی۔''

میں نے سارہ کو کامران کی بات بتائی۔ وہ سُن کر مسکرا دی۔

''تمھارا دوست واقعی دوستی کے قابل ہے۔ میں واقعی اکیلے آتے ہوئے ہچکچا رہی تھی لیکن جانے کیوں تمھیں ساتھ چلنے کا بھی نہیں کہہ پا رہی تھی۔ کامران نے میری مشکل حل کر دی۔۔۔ تم نے اتنے بہت سے اچھے لوگ اپنے آس پاس کیسے جمع کر رکھے ہیں؟ ہمیں تو ڈھونڈنے سے بھی ایک نہیں ملتا۔''

میں سارہ کا اشارہ سمجھ کر مسکرا دیا۔

''جس کے گرد یہ سب لوگ جمع ہیں۔ وہ تو خود تمھارے ساتھ ہے۔ پھر یہ گلہ کیسا؟''

سارہ بھی میرا جواب سُن کر مسکرا دی۔ لیکن پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر اُداسی کے وہی پُرانے بادل چھا گئے۔

''تو تم جا رہے ہو ہاں۔۔۔ ہم سب کو تنہا چھوڑ کر۔''

''میں ہمیشہ تمھارے ساتھ ہی تو ہوں۔ ہر لمحہ تمھاری دسترس میں۔''

سارہ چُپ رہی۔ جیسے کوئی گہری سوچ اس کے اندر جنگ چھیڑے ہوئے ہو پھر اُس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں بہت دنوں سے وہ وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی ہوں جس نے اتنے بہت سے لوگوں کو تم سے خوفزدہ کر رکھا ہے۔ لیکن ہر بار میری سوچ خالی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئی ہے۔ میں نے توریت اور انجیل میں بھی کافی سر کھپایا لیکن تمھارے پیغام تک نہیں پہنچ پائی۔ وہ کیا بات ہے جو تمھیں ہم سب میں ممتاز کرتی ہے۔ خصوصی بناتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے جو تمھارے اندر فخر اور غرور کا اس قدر مضبوط احساس جگاتی ہے کہ میرے پاپا جیسے مضبوط اور بڑے قد والے انسان بھی تمھارے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ ایسے سازشی بونے جو ایک دراز قد شہزادے کو سینکڑوں کی تعداد میں مل کر گرانے کی اور اس کی مُشکیں کسنے کی فکر میں ہوں۔ لیکن ہر بار منہ کی کھا رہے ہوں۔ بولو۔۔۔ تم میں ایسا کیا ہے میڈی؟''

''سچ کہوں تو مجھ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے فخر کرنے کے لیے۔ ہاں اگر میرا مذہب ہی ان کی پریشانی کی وجہ ہے تو یہ مذہب تو میرے سب ہم مذہبوں کا غرور ہے۔ میں نے تو آج تک اس مذہب کا ایک حق بھی ٹھیک طرح سے ادا نہیں کیا۔ سچ پوچھو تو میں اپنے مذہب کے نام پر خود ایک دھبہ ہوں۔ میرا کوئی بھی تو عمل اس سے مطابقت نہیں رکھتا، اور ایک بات اور جو تم خود جانتی ہو کہ میں تو ایمان کی وجہ سے ہمیشہ اس مذہب کو اپنا مخالف۔۔۔۔ اپنا دشمن سمجھتا رہا ہوں۔۔۔۔ میں یہاں آنے تک یہی سمجھتا رہا کہ اس مذہب نے ہی مولوی علیم کی صورت میں میری ایمان کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ یہ مذہب مجھے دوسروں میں اتنا ممتاز کر دے گا۔ میرا قد اتنا بڑھا دے گا۔ دشمنوں اور میرے مخالفوں کو مجھ سے اتنا خوف زدہ کر دے گا۔ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تو کبھی اس مذہب کو اپنے لیے باعث افتخار نہیں سمجھا۔ ان سب لوگوں کی مخالفت نے اسے میرے لیے باعث افتخار بنا دیا۔

''سچ کہوں تو یہاں آنے سے پہلے میں ''ہالوکاسٹ'' کے نام سے بھی واقف نہیں تھا۔ نہ ہی میرے دل میں کبھی کسی فلسطینی مسلمان کے لیے کوئی درد ہی جاگا تھا۔ اور شاید اگر میرے راستے میں یہاں اس قدر کانٹوں کے جال نہ بچھائے جاتے تو میں کبھی اس ٹرم پیپر کی تحقیق میں نہ پڑتا۔ میں بھی عام نوجوانوں کی طرح اسے ایک واقعہ سمجھتا رہتا جس کے سچ یا جھوٹ کو

جاننے کی زحمت بھی کبھی گوارا نہ کرتا، مجھے اس راہ پر ڈالنے والے بھی اصل میں سر آئزک ہی ہیں۔ اگر میرے اندر کوئی جذبہ قابل فخر، قابل غرور ہے تو اسے جگانے میں سب سے بڑا ہاتھ بھی انہی کا ہے۔ لیکن وہ مزید کس سچ سے خوف زدہ ہیں یہ تو میں بھی نہیں جان پایا ابھی تک۔"

"اسی سچ اسی پیغام کی تو میں بھی متلاشی ہوں۔ کیا تم اس کھوج میں میری مدد نہیں کرو گے حماد۔۔۔"

میں غور سے سارہ کی بات سن رہا تھا۔ ایسی کیا بات ہوسکتی ہے۔۔۔؟ ایسا کون سا پیغام ہوسکتا ہے۔ اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی الوداعی کرنیں اونچی اونچی عمارتوں کی چوٹیوں اور گنبدوں پر سنہری قلعی پھیر کر واپس پلٹنے کی فکر میں تھی۔ اچانک ایک اونچے گنبد کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہم اس سنٹرل لندن کے علاقے سے گزر رہے تھے جہاں ایشیائی باشندوں کی بہت بڑی تعداد رہائش پذیر تھی۔ میں نے سارہ کو گاڑی سڑک کے کنارے پر لگانے کا کہا۔ ہم دونوں گاڑی سے اُتر آئے، سامنے ہی وہ عمارت موجود تھی جس کے گنبد پر چمکتی سنہری دھوپ نے میرے دماغ کی کھڑکی بھی روشن کر دی تھی۔ یہ سنٹرل لندن کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ سارہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"شاید میں تمھیں اس پیغام کا کچھ حصہ ابھی اسی وقت پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں اس عمارت میں جانا ہوگا اور اس عمارت میں داخلے کے کچھ آداب ہیں۔ اگر تم میرے ساتھ ان آداب کو دہرا سکو تو۔۔۔؟

سارہ چُپ چاپ میرے پیچھے چل پڑی۔ مسجد کے صحن میں ہی بہت سے گرم ٹھنڈے پانی کے نل لگے ہوئے تھے۔ سارہ نے میری طرف دیکھ دیکھ کر پانی اپنے ہاتھوں پر چہرے پر اور کہنیوں پر بہایا۔ اور وضو کر کے مسجد کے صحن میں ہی ایک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ میں اندر سے قرآن اُٹھا لایا۔ شاید ہمارے مولوی صاحب نے جب تیرہ برس کی عمر میں مجھے ختم قرآن کی مبارک باد دی تھی۔ اس کے بعد آج میں نے اس کتاب کو تھاما تھا۔ ہاں البتہ جب مولوی علیم، سنّی کو درس دینے کے لیے ہمارے گھر آتے تھے تو میں اپنے مطلب کے لیے ان کے آس پاس بیٹھا رہتا تھا اور یوں میرے کانوں میں ان کے مخصوص لہجے اور تلفظ گونجتا رہتا

تھا۔

میں نے سورۃ رحمٰن کھولی اور سارہ کو پڑھ پڑھ کر اس کا ترجمہ سنانے لگا۔

"تو تم اپنے ربّ کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔۔۔۔۔"

میں پڑھتا گیا اور سارہ غور سے سنتی گئی۔ پھر جب میری نظریں اٹھیں تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ دلوں پر لگا زنگ آنسوؤں کی صورت میں زار و قطار بہہ رہا تھا۔ میں خود بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک لمحے میں ہی جانے کتنے چہرے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ مولوی علیم، ریلوے اسٹیشن پر ملنے والے صوفی رحمت اللہ، عبداللہ اور جانے کون کون۔ جو اس دنیا میں اپنی آمد کا حق ادا کر رہے تھے۔ اور میں۔۔۔ میں تو اپنے جینے کا ٹھیک سے شکر بھی ادا نہیں کر پایا تھا کبھی۔ ہماری اس دنیا میں آمد کا مقصد کیا تھا۔۔۔ اور ہم اپنی زندگی کن مشاغل میں بسر کرتے رہتے ہیں۔ روز اک نیا دھبہ اپنے پہلے ہی سے بے تحاشا داغ دار دامن پر سجا لیتے ہیں۔ پھر بھی کتنے بے خبر کتنے خوش رہتے ہیں۔ واپسی پر سارا راستہ اس کی آنکھیں بھیگی رہیں اور میں بھی خاموش رہا۔۔۔ رات کو جب سارہ نے مجھے کامران کے فلیٹ پر ڈراپ کیا تو وہ بے انتہا رونے کے بعد اب پُر سکون تھی میں نہیں جانتا تھا کبھی کبھی الوداع کہنا کس قدر مشکل ثابت ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے اس رات سارہ سے بچھڑتے ہوئے ہوا۔ سارہ چلی گئی لیکن میں ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اک عجیب سی بے چینی میرے رگ و پے میں سمانے لگی تھی۔

OO

تجدید ایمان

اگلی شام ربیکا کی پارٹی پر اس کے گھر سبھی دوست موجود تھے۔ میری ساری کلاس موجود تھی، سوائے سارہ کے۔ ربیکا نے ہر وہ جگہ جہاں سارہ کے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ رابطہ کر کے دیکھ لیا تھا لیکن سارہ کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اس کے سارے فون نمبر بھی آزما لیے گئے لیکن سب بے سود رہا۔ ربیکا نے کئی مرتبہ سارہ کے گھر بھی فون کیا لیکن گھر پر کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک پُرانے نوکر نے جو ربیکا کو اچھی طرح جانتا تھا صرف اتنا بتایا کہ سارہ میڈیم کا سر آئزک کے ساتھ آج صبح بہت جھگڑا ہوا اور پھر نہ جانے وہ کہاں چلی گئیں۔ نوکر نے یہ بھی بتایا کہ سارہ کی مما بھی اُسی کی تلاش میں دن کو گھر سے نکل گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں لوٹیں۔ سر آئزک کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ سرِ شام ہی اپنے دفتر چلے گئے تھے اور اب بھی یونیورسٹی میں ہی موجود ہیں۔

ربیکا نے پریشانی سے یہ ساری اطلاعات مجھے پارٹی ہال کے ایک کونے میں لے جا کر بتائیں۔ واقعی بات تو فکر کی تھی۔ میں بھی پریشان ہو گیا۔ آخر سارہ اس طرح سب کو بنا بتائے کہاں جا سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر میں وہ یہاں آ ہی جائے۔ مَیں اور ربیکا اسی اُمید پر گھڑیاں گنتے رہے۔ ہم دونوں ہی اس پارٹی کو چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے تھے۔ ربیکا اس دعوت کی میزبان تھی اور میں وہ تھا جس کے اعزاز میں یہ سب لوگ یہاں جمع ہوئے تھے۔ لیکن ہم دونوں ہی کا من اب اس محفل میں نہیں لگ رہا تھا۔ میری ساری کلاس میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہاں جمع ہوئی تھی۔ دوسرے سمسٹرز سے بھی بہت سے لڑکے لڑکیاں تھیں۔ ربیکا کی شہرت اور دوستی یونیورسٹی کے کونے کونے میں بکھری ہوئی تھی۔ ہم دونوں درمیانی وقفوں میں بھی سارہ کی تلاش میں نمبر گھماتے رہے۔ کامران جو ریستوران میں تھا اور بعد میں یہاں پارٹی میں ہماری طرف آنے والا تھا اُسے میں نے فون کر کے خصوصی تاکید کی کہ وہ یہاں

آنے سے پہلے سارہ کے گھر سے ضرور ہوتا آئے۔ لیکن اُس نے بھی آ کر یہی بتایا کہ سارہ کی کوئی خبر نہیں ہے۔

آخر خدا خدا کر کے مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ سب ہی نے مجھے فرداً فرداً جاتے ہوئے گلے لگا کر اپنی پوری حمایت اور سہارے کا یقین دلایا۔ جم، ڈیوڈ اور ٹینا تو رو ہی پڑے۔ کیسے عجیب رشتے تھے یہ۔ میں ان سب کا کچھ بھی نہیں تھا لیکن آج وہ سب میرے، سب سے زیادہ اپنے تھے۔ میرے ساتھ طوفان میں جم کر کھڑے تھے۔ آندھیوں کا رُخ موڑنے کی ہمت رکھتے تھے۔ آج مجھے احساس ہو رہا تھا کہ جنگیں جذبے سے جیتی جاتی ہیں ایسے جان نثار ساتھ ہوں تو کسی کو کیا غم۔ سب نے مجھے یقین دلایا کہ مَیں بہت جلد پھر سے ان کے درمیان ہوں گا۔ سب ہی میرے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ ان سب کے خلوص کو دیکھ کر جانے کیوں میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ یہ دل کا پیمانہ بھی کیسا عجیب ہوتا ہے۔ سارے جہاں کی نفرت سہہ جاتا ہے لیکن چند اپنوں کی محبت پا کر چھلک اُٹھتا ہے۔ سب ہی لوگوں نے ربیکا کا اس شاندار پارٹی دینے پر شکریہ ادا کیا۔ واقعی ربیکا نے کوئی کسر بھی تو نہیں چھوڑی تھی۔ اس کا محل نما مکان آج پوری طرح سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف باوردی بیرے ہاتھوں میں مشروبات کی ٹرے تھامے سرِ شام ہی ہال میں اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کھانے پینے اور موسیقی کا ایسا شاندار انتظام مَیں نے کم ہی کہیں دیکھا تھا۔ ربیکا نے ہال کے باہر موجود سوئمنگ پول کے کنارے پر باربی کیو اور سازندوں کا بھی انتظام کر رکھا تھا۔ سارا ہال اور باہر پول کی جانب روشنیوں کا سیلاب تھا۔ خوشبوئیں تھیں، قہقہے تھے۔ لیکن سارہ کی غیر موجودگی نے سب ہی رنگ پھیکے کر دیے تھے۔ جم وغیرہ بھی جاتے وقت تک سارہ ہی کے بارے میں پوچھتے رہے۔

آخر کار ہال میں صرف میں ربیکا اور کامران رہ گئے۔ کامران کو مَیں نے دوبارہ سارہ کی خبر لینے کے لیے بھیجنے کا سوچا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ اب تک تو اُسے گھر واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہم ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ سارہ کے خاص نوکر نے جو اس پارٹی کا چیف بٹلر بھی تھا، آ کر ہمیں ہال میں خبر دی کہ کوئی مسٹر آئزک آئے ہیں اور ربیکا سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ مسٹر آئزک اور اس وقت آدھی رات کو

وہ ربیکا کے گھر کیا لینے آئے تھے۔ ربیکا نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا کہا۔ ہم تینوں نے تشویش سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میری اور سر آئزک کی نظر ایک دوسرے پر پڑی لیکن انہوں نے جلدی سے ربیکا سے پوچھا۔

''اس وقت آنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل سارہ ابھی تک گھر واپس نہیں آئی۔ مَیں نے سوچا شاید وہ یہاں ہو۔۔۔۔ اُس کا فون بھی بند مل رہا ہے۔''

ربیکا نے سر آئزک کو بتایا کہ ہم خود سارہ کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور شام سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اور اس وقت بھی دوبارہ اس کی تلاش میں نکلنے کی تیاری کر رہے تھے کہ آپ آ گئے۔

سر آئزک نے ربیکا سے درخواست کی کہ اگر سارہ کے بارے میں کوئی خبر ملے تو انہیں ضرور خبر کرے۔ ربیکا نے سر ہلایا۔

سر آئزک پھر وہاں نہیں رُکے۔ انہوں نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔ راستے میں ہال سے نکلتے ہوئے ان کی مجھ سے چند لمحوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ انہوں نے کڑی نظروں سے مجھے گھورا ان کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی۔

''مَیں تم کو اپنی بیٹی چھیننے نہیں دوں گا۔ آخری جیت میری ہی ہوگی۔''

''میرا مقصد کبھی آپ سے آپ کی بیٹی کو چھیننا نہیں تھا۔ آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے اُسے کھو دیا ہے۔ البتہ ہم اُسے ڈھونڈ لیں گے۔ اور آخری جیت کا فیصلہ اگر ہم آخری جنگ پر ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا ورنہ لوگ کہیں گے کہ ایک شاگرد اپنے استاد کے راستے میں حائل ہوگیا۔''

سر آئزک نے مجھ پر ایک آخری نگاہ ڈالی اور وہاں سے باہر نکل گئے۔ مَیں نے کامران سے کہا کہ وہ مشرق کی جانب سارہ کو ممکنہ جگہوں پر تلاش کرے جب کہ مَیں نے مغرب کی جانب ان جگہوں کو ٹٹولنے کا ارادہ کیا جو سارہ آتے جاتے مجھے اپنی پسندیدہ بتاتی رہی تھی۔ میرے دل میں عجیب عجیب سے وسوسے جنم لے رہے تھے۔ اس شہر میں اس وقت سارہ کے درپردہ دشمنوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ کامران چلا گیا۔ ربیکا نے گاڑی کی چابی میرے

حوالے کر دی لیکن پھر اُس سے بھی نہیں رہا گیا۔ وہ سارہ کی بچپن کی دوست تھی اور بہت سی ایسی جگہوں سے واقف تھیں جن کے بارے میں مَیں بھی نہیں جانتا تھا۔ ہم دونوں گاڑی نکال کر لندن کی سنسان سڑکوں پر سارہ کو ڈھونڈنے نکل گئے۔ سب سے پہلے ربیکا نے سارہ کا اسکول اور پھر کالج کا رُخ کیا لیکن دونوں جگہوں پر ہمیں مایوسی ہوئی۔ اب میری بے چینی اور پریشانی اپنی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ مَیں نے اپنے دل میں گڑگڑا کر خدا کو پکارا۔ ہاں۔۔۔۔ اسی خدا کو جسے مَیں ایمان کی موت کے بعد سے بالکل ہی بھول چکا تھا۔ وہی خدا جس سے مَیں دل میں ناراض تھا۔ جس کو مَیں ایمان کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ اسی خدا سے میں نے گڑگڑا کر دُعا مانگی کہ یا خدا اس معصوم لڑکی کی حفاظت کرنا۔ ہم سب زندگی میں چند مرتبہ ہی خدا کو سچے دل سے یاد کرتے ہیں اور پورے خلوص سے اس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ اس رات میری دُعا کا وہ لمحہ بھی شاید انہی چند سچے لمحوں میں سے ایک تھا۔ ابھی میں نے دل ہی دل میں دُعا ختم ہی کی تھی کہ میرا موبائل فون بج اُٹھا۔ فون کی اسکرین پر سارہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ مَیں نے جلدی سے فون آن کیا۔

''کہاں ہو تم۔۔۔۔ تمہیں کچھ احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان ہیں تمہارے لیے۔۔۔۔ آدھی رات کو مَیں اور ربیکا لندن کی سڑکوں پر تمہاری تلاش میں گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے کیا۔۔۔۔؟

میں نے چند لمحوں میں ہی اپنی ساری پریشانی غصے کی صورت میں سارہ پر نکال دی۔ وہ چُپ چاپ میری بات سنتی رہی۔

''مَیں جانتی ہوں میرے اس رویے سے تمہیں اور باقی سب کو کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی۔۔۔۔ لیکن مَیں مجبور تھی۔ زندگی بدلنے والے چند فیصلے ایسے ہوتے ہیں جنھیں کرنے کے لیے انسان کو تنہا ہی سب کچھ جھیلنا ہوتا ہے۔ بہر حال۔۔۔۔ مَیں جو پتہ تمہیں بتا رہی ہوں۔ تم ربیکا کے ساتھ ابھی اسی وقت وہاں چلے آؤ۔ مَیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

سارہ نے پتہ بتا کر فون کاٹ دیا۔ جو جگہ اُس نے بتائی تھی وہاں ہم دونوں پہلے بھی جا چکے تھے لیکن اس وقت اس جگہ کا نام سنتے ہی میرا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ جیسے چند لمحوں میں اچھل کر باہر نکل جائے گا۔ بڑی مشکل سے میں نے ظاہری طور پر اپنی کیفیت پر قابو پایا

اور ربیکا کو گاڑی موڑ کر سارہ کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف چلنے کو کہا۔ حیرت ربیکا کے چہرے سے بھی عیاں تھی لیکن میری حالت کے پیشِ نظر وہ چپ ہی رہی۔ کچھ ہی دیر میں ہم سنٹرل لندن کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ ہمیں سارہ کی سفید بیٹل دُور ہی سے اندھیری سڑک کے کنارے کھڑی نظر آ گئی۔ سارہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی پُلیا پر کھڑی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ''فرکوٹ'' پہن رکھا تھا جس کے کالر اُس نے سردی سے بچنے کے لیے اوپر اُٹھا رکھے تھے، دور سے ہمیں سارہ کے کوئی اور بھی کھڑا نظر آیا۔ ربیکا نے گاڑی سڑک کی دوسری جانب روکی اور ہم دونوں اُتر کر تیزی سے سارہ کی طرف لپکے۔ سارہ کے ساتھ اس کی مما کو کھڑے دیکھ کر ہمیں حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ربیکا جاتے ہی سارہ سے لپٹ گئی۔ سارہ نے تھپک تھپک کر اُسے تسلی دی اور بولی۔

''مَیں اس طرح تم سب کو پریشان کرنے کی معذرت چاہتی ہوں۔ مما کو بھی مَیں نے آدھی رات کو ڈسٹرب کیا ہے لیکن میرے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔''

مسز آئزک کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ بیٹی کے ساتھ مل کر بہت دیر تک روتی رہی ہیں اور جو بھی طوفان تھا وہ ہمارے آنے سے پہلے ہی گزر چکا تھا۔ اب ان دونوں کے چہروں پر سکون ہی سکون تھا۔ مسز آئزک نے سارہ کے گالوں کو پیار سے تھپکا اور مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ مَیں کچھ حیران سا ان کی جانب بڑھ گیا اور انہوں نے پیار سے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کر کے انہیں سنوارا اور بولیں۔

''تم ایک سچے اور پیارے لڑکے ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میری بیٹی نے ایک سچے اور بہادر انسان سے دوستی کی ہے۔ میری دُعائیں ہمیشہ سارہ کے اور تمھارے ساتھ ہیں۔''

مَیں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سارہ کی جانب دیکھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار یا پونے پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک فضا میں اک ارتعاش سا بکھرا اور مؤذن کی اذان گونجی ''اللہ بڑا ہے۔۔۔ اللہ بڑا ہے۔۔۔''

مجھے سارہ نے سنٹرل لندن کی اسی بڑی جامع مسجد کے سامنے بلایا تھا جہاں ایک دن پہلے مَیں اور سارہ آئے تھے اور ہم دونوں کے دلوں پر لگا کچھ زنگ دُھلا تھا۔ سارہ میری حیرت دیکھ کر مسکرائی۔

''مَیں نے سچائی کا پیغام سُن لیا ہے حماد۔۔۔ اَب میرا راستہ بہت صاف ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں برتری اور احساسِ فخر کی کھوج میں ہوں۔ آج میری کھوج مکمل ہوگئی ہے۔ تمھاری بدولت مجھے اپنی وہ منزل نظر آ گئی ہے جو آگ کے دریا کے اس پار ہمیشہ سے موجود تھی لیکن میری نظروں سے اوجھل رہی۔ اَب مَیں نے اس آگ کے دریا کو پار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور میری عظیم ماں نے بھی مجھے اس کی اجازت دے دی ہے۔ میرے ساتھ کھڑے ہو کر میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مما اپنی وفا، اپنی مجبوریوں کی وجہ سے میرے ساتھ اس دریا کے پار نہیں چل سکتیں۔ لیکن میرے لیے ان کا، تمھارا، ربیکا کا ساتھ ہی بہت ہے۔''

ربیکا پھٹی پھٹی نظروں سے سارہ کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ اذان ختم ہوگئی تھی۔ سارہ نے میرا اور ربیکا کا ہاتھ تھاما۔

''چلو۔۔۔ سچ کے راستے پر چلنے میں دیر کیسی۔۔۔؟''

ہم سب خواب کے سے عالم میں مسجد میں داخل ہوگئے۔ وہاں پیش امام جو شاید انگریزی نژاد ہی تھا اور جس کے چہرے کے گرد نور کا اک عجیب سا ہالہ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہم سب کا استقبال کیا۔ شاید سارہ پہلے ہی انہیں سب بتا چکی تھی۔ اُسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے مولوی علیم الدین کی یاد آ گئی۔ کیا سبھی اللہ والوں کی شکلیں ایک سی ہی ہوتی ہیں؟ انہوں نے ہم سب کو عزت کے ساتھ بڑے گنبد کے نیچے بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے چند دُعائیں پڑھیں اور پھر سارہ سے کہا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے پہلا کلمہ دُہرائے۔

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔۔۔''

کبوتروں کی ایک ڈار جو غول کی صورت میں صحن میں دانا چگ رہی تھی۔ ایک تیز آواز کے ساتھ فضا میں اُڑی جیسے انہوں نے سارہ کو سلامی پیش کی ہو۔ پھر فضا ساکت ہوگئی۔ پھر دوسرا کلمہ، پھر تیسرا۔۔۔ چوتھا، پانچواں، چھٹا۔۔۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب مَیں نے اپنے مطلب کے لیے اور مولوی علیم کی قربت حاصل کرنے کے لیے یہ سارے چھ کے چھ کلمے یاد کیے تھے۔ مجھے لگا جیسے اس انگریزی نژاد گورے پیش امام کی جگہ مولوی علیم ہمارے سامنے بیٹھے ہوں۔ ساتھ ہی دیکھا تو عبداللہ بھی

بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مَیں نے جلدی سے پلٹ کر ربیکا کی جانب دیکھا تو وہاں بھی صوفی رحمت اللہ ہنستے ہوئے نظر آئے جیسے کہہ رہے ہوں "میاں۔۔۔۔ہم تو مسجد کی کھڑکی سے صرف باہر جھانکتے ہی رہے۔ تم نے تو اسے کھڑکی سے اندر مسجد میں ہی بلا لیا۔"

سارہ نے دُعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اس کی دیکھا دیکھی ربیکا نے بھی گلے میں پڑا اسکارف اپنے سر پہ ڈال لیا تھا اور مؤدب بیٹھی ہوئی تھی۔ امام صاحب نے سارہ کو اور ہم سب کو مبارک باد دی کہ اب سارہ حق کے راستے کی اک مسافر تھی۔

سارہ کی مما کے آنسو تھم نہیں پا رہے تھے۔ سارہ نے انہیں گلے لگا کر بے حد پیار کیا۔ ربیکا بھی بھیگی پلکیں لیے انہیں تھپکتی رہی۔ مَیں نے مسز آئزک کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کہ اس وقت انہیں تسلی دینے کا اس سے بہتر ذریعہ مجھے اور کچھ دوسرا نظر نہ آیا۔

مسز آئزک۔۔۔۔جینی فر آئزک۔۔۔۔کتنی عظیم عورت تھی۔ کیسا عجب رشتہ تھا ان دو ماں بیٹی کا، سہیلیوں سے بھی بڑھ کر، جیسے یک جان دو قالب ہوں۔ دُنیا کی کون سی ماں ہوگی جو یوں آدھی رات کو اپنی بیٹی کو اپنا مذہب بدلتے وقت حوصلہ دینے کے لیے گھر سے چلی آئے۔ اپنے شوہر کی برسوں کی رفاقت اور اپنے گھر اور اپنے ازدواجی رشتے کو بھی خطرے میں ڈال کر، واقعی یہ سب بہت خاص لوگ تھے۔ سارہ، اس کی مما۔۔۔۔ان کا درجہ کچھ الگ ہی تھا۔ ان کی مٹی جس سے یہ لوگ بنائے گئے تھے ضرور کچھ خاص رہی ہوگی۔

امام صاحب نے وہ جذباتی لمحے گزر جانے کے بعد ہم سے پوچھا۔

"خاتون کا نام سارہ ہی ٹھیک ہے یا آپ کوئی دوسرا نام رکھنا چاہیں گے؟"

مسز آئزک نے سارہ کی جانب اور سارہ نے میری جانب دیکھا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکل گیا۔

"نہیں ہم سارہ کا نام بدل رہے ہیں۔"

"بہت بہتر۔ نیا نام بھی تجویز کر دیجئے سب کے سامنے۔"

"ایمان۔"

سارہ نے اور ربیکا نے بیک وقت چونک کر میری جانب دیکھا۔

"جی۔۔۔۔سارہ کا نیا نام مَیں "ایمان" تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض

نہ ہو۔"

سارہ نے خوشی سے لرزتی آواز کے ساتھ کہا۔

"مَیں اس نام کو اپنے لیے اعزاز سمجھتی ہوں۔"

امام صاحب نے دُعا کی اور پُرانی سارہ اور نئی ایمان کے سَر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ ربیکا نے بھی جلدی سے اپنا سر آگے کر دیا۔ امام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پھر اُس نے ربیکا اور میرے سر پر بھی ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ کالی رات کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اور یہ صبح بھی کیسی عجیب صبح تھی۔ اتنا سفید اُجالا مَیں نے آج تک اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دودھیا سفید اُجالا۔

ہم سب مسجد سے باہر نکل آئے۔ ایمان نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ہم اپنی گاڑیوں کے قریب پہنچے۔ لندن کی مخصوص صبح کی دُھند نے سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ بمشکل ہمیں قریب کھڑی سفید بیٹل نظر آئی۔ ایمان نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا اور مسکرائی۔

"میں نہیں جانتی کہ مَیں کبھی تمہاری محبت پا سکوں گی یا نہیں۔۔۔۔لیکن دیکھو۔۔۔۔میں نے تمہارے خدا کو پا لیا ہے۔"

مَیں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُس کے ماتھے کا بوسہ لیا اور مسز آئزک کے ہاتھ میں ایمان کا نازک ہاتھ تھمایا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے قیمتی امانت ہے جسے مَیں آپ کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھیے گا۔"

مسز آئزک مسکرائیں۔

"بے فکر رہو لڑکے۔۔۔۔تمہاری امانت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ اُسے نقصان پہنچانے والی کسی بھی چیز کو پہلے میرے جسم اور میری رُوح کے پار ہونا پڑے گا۔"

ربیکا نے آگے بڑھ کر ایمان کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر وہ بھی اس کا ماتھا چوم کر بولی۔ "آج تم سب سے جیت گئی ہو۔ مجھے فخر ہے کہ مَیں تمہاری دوست ہوں۔"

میں جانتا تھا کہ ایمان کے راستے میں آگے کیسے کیسے پُرخار راستے، کیسی کیسی اُلجھنیں

اور تکالیف اور کتنے انگارے بچھے ہوئے تھے لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے اور وہ ہر مشکل کے سامنے ڈٹ جانا جانتی ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں نے مولوی علیم تک پہنچنے کے لیے بھی مذہب کا سہارا لیا تھا۔ مذہب کو ایمان کے گھر جانے کے لیے ایک سیڑھی کے طور پر استعمال کیا تھا لیکن میرے اندر شائد کھوٹ تھا۔ لیکن اس سچی لڑکی نے مذہب کو مجھ تک پہنچنے کا ایک ذریعہ یا میرے دل میں اُترنے کی صرف ایک سیڑھی نہیں سمجھا۔ بلکہ اس نے جو بھی کیا سچے دل سے کیا۔ اس کی کسی محبت میں کوئی منافقت نہیں تھی۔ نہ ہی میری محبت میں اور نہ ہی خدا کی محبت میں۔۔۔۔۔ وہ دونوں محبتوں میں سچی تھی۔

ہم چاروں لوگ صبح کی شدید دھند میں ایک دوسرے سے وداع ہو کر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ایمان کی نظریں جاتے وقت تک میرا ہی طواف کرتی رہیں۔ وہ جانتی تھی کہ اگلے دن میری واپسی کی فلائٹ ہے اور اَب چند گھڑیاں ہی باقی رہ گئی ہیں جس کے بعد ہم جُدا ہو جائیں گے اور کون جانے یہ جُدائی پھر کتنی صدیوں پر محیط ہوگی۔۔۔۔

میں اور ربیکا دیر تک ایمان کی سفید بیٹل کو لندن کی گہری دُھند میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔ جیسے دھواں، دھواں میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ پھر ربیکا نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

OO

کبھی الوداع نہ کہنا

جب میں اور کامران لندن ہیتھرو ائیر پورٹ کے لیے نکلے تو اسی وقت بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ائیر پورٹ پر پہنچتے پہنچتے یہ بوندا باندی شدید بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ میں راستے بھر گاڑی میں اس دن کے اخبارات پڑھتا رہا جنھوں نے سارہ کے قبول اسلام کی خبریں بڑی بڑی سُرخیوں کی صورت میں چھاپی تھیں۔ یہودی زیر اثر اخبارات نے اسے ایک جذباتی لڑکی کی اپنی محبت کے لیے مذہب کی قربانی سے تعبیر کیا تھا۔ اور پہلے کی سارہ اور آج کی ایمان کے لیے بہت سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ محبت کے چند متوالے اخبارات نے اسے محبت کی جیت قرار دیا تھا اور سر آئزک کی تمام اخبارات میں شدید سبکی کے حوالے دیے گئے تھے۔ سر آئزک نے ایمان کو اپنی وراثت اور جائداد سے عاق کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ایک انٹرویو میں انہوں نے ایمان کو 30 دن کی مہلت دی تھی کہ اگر وہ اب بھی اپنی غلطی کا ''اعتراف'' کر کے تائب ہو جائے تو وہ اُسے دوبارہ اپنی ولدیت اور وراثت کا حق بخشنے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں مجھ پر اپنی بیٹی کو بھڑکانے اور اُسے ''راہِ راست'' سے بھٹکانے کا بھی الزام لگایا تھا۔ اخبارات میں میرے لندن چھوڑ کر جانے کی خبریں بھی موجود تھیں۔ ایمان کا تمام اخبارات میں صرف ایک ہی جملہ بطور بیان لگایا گیا تھا کیونکہ شاید اس نے اخباری نمائندوں اور میڈیا کے سامنے کچھ بولنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ: سچ کانٹوں سے بھرا اک بے حد دشوار راستہ ہے اور محبت، ہمیں ان کانٹوں بھری راہ پر چلنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔''

جیسے ہی ہم ائیر پورٹ کی پارکنگ میں رُکے تو گاڑی سے اُترتے ہی مجھے اپنے شناسا سا چہروں کا بے پناہ ہجوم نظر آیا۔ سب سے پہلے ربیکا بارش میں بھیگتی دوڑ کر میری طرف آئی آتے ہی میرا ہاتھ تھام کر کھینچتی ہوئی مجھے بھیڑ سے دُور لے گئی۔ بارش ہم دونوں کے وجود کو

بھگو رہی تھی۔

"چند لمحے یہاں میرے پاس کھڑے رہو۔ مَیں تمھارے وجود کو اپنی آنکھوں کے ذریعے اپنے دل میں اُتار کر اس کی شبیہہ کو قید کر لینا چاہتی ہوں۔ تا کہ تنہائی میں جب کبھی مَیں اپنے دل میں جھانکوں تو بس تم ہی تم مجھے نظر آؤ۔"

مَیں نے اس کی دیوانگی میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا حالانکہ دوسری طرف کھڑے جم، ڈیوڈ، ٹینا اور باقی لوگ چلّا رہے تھے۔ ربیکا چند لمحے مجھے یونہی نظروں نظروں میں نہارتی رہی۔ مجھے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر پھر سے چارلی چپلن کا مشہور قول یاد آ گیا۔

"مجھے بارشوں میں چلنا اچھا لگتا ہے، کیونکہ تب کوئی میرے بہتے آنسو نہیں دیکھ پاتا۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی بھیگی لٹیں بکھرا دیں۔ ربیکا آج مسکرانے کی کوشش میں مزید روہانسی ہو گئی۔ مَیں نے اس سے ایمان کا پوچھا۔ تب اسے ہوش آیا اور اُس نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"جانے وہ کہاں رہ گئی ہے۔ اب تک تو اُسے آ جانا چاہیے تھا۔"

ہیتھرو ائیر پورٹ کے کھلے احاطے میں بورڈنگ سے پہلے بنی ہوئی لمبی راہداریوں میں میرے سبھی دوست، میرے تمام کلاس فیلوز بارش سے بے نیاز مجھے الوداع کہنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ائیر پورٹ کا عملہ حیرت سے ان کے لہراتے ہاتھوں اور ان میں پکڑے پھولوں کے خوبصورت گلدستوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ کون سی اہم شخصیت، کون سی وی۔ آئی۔ پی ہستی ہے جس کے جانے کی اطلاع انہیں پہلے سے نہیں کی گئی۔ وہ نادان یہ نہیں جانتے تھے کہ "محبت" میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ خود بخود آپ کو دنیا کی سب سے اہم ہستی، سب سے بڑا وی۔ آئی۔ پی بنا دیتی ہے۔ میری نظریں ایمان کو تلاش کر رہی تھیں لیکن ابھی تک اس کا کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ مَیں نے سب ہی دوستوں سے فرداً فرداً مل لیا اتنے میں اچانک مجھے دُور سے پارکر کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ بورڈنگ کا اعلان ہو چکا تھا اور مَیں اندر شیشے کے دروازے سے ہال میں مسافروں کو قطار میں آگے بڑھتا دیکھ سکتا تھا۔ پارکر کی گاڑی کے پیچھے پولیس کی دو اور نیلی بتی والی گاڑیاں بھی تیزی سے ائیر پورٹ کے احاطے میں داخل ہو گئیں۔ پارکر اپنی گاڑی میں سے حسبِ معمول چیونگم چباتے ہوئے برآمد ہوا۔

اور پھر مَیں نے دیکھا کہ ایمان اور اس کی مما بھی اس کی گاڑی میں سے اُتریں۔ ایمان تیزی سے میری طرف بڑھی۔ اور قریب آ کر میرے ہاتھ تھام کر بولی۔

"ہمارے راستے میں بہت سی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں حماد۔۔۔۔ لیکن دیکھو مَیں پھر بھی تمھیں الوداع کہنے یہاں تک پہنچ گئی ہوں۔"

"مَیں جانتا تھا تم ضرور آؤ گی۔"

مسز آئزک نے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوما اور میرے سَر پر ہاتھ رکھ کر دُعا دی۔ پارکر بھی ہنستے ہوئے آگے بڑھا اور مجھے گلے سے لگا کر بولا۔

"جا رہے ہو باغی نوجوان۔۔۔۔ مَیں جانتا تھا۔۔۔۔ جاتے جاتے بھی آخری بازی تم اپنے نام ہی کر جاؤ گے۔" غالباً اس کا اشارہ ایمان کی طرف تھا۔

"آپ میری دوست کو ان مشکل حالات میں بھی یہاں تک لے کر آئے۔ مَیں اس کے لیے ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

"اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں دوست۔ مسٹر آئزک اور ان کے ساتھیوں نے شہر میں ہمارا ہر راستہ روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن آج پارکر نے بھی سوچ رکھا تھا کہ زندگی میں ایک کام تو ایسا ضرور کر جاؤں گا کہ جس کا حوالہ دے کر، جسے یاد کر کے میری گردن بھی فخر سے بلند ہو جائے۔"

پارکر نے دوبارہ مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ اس سے مل کر مَیں ایمان کی طرف بڑھ گیا جو ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ لیے چپ چاپ ایک طرف کھڑی تھی۔ مَیں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ میں پکڑے پھولوں کو دیکھا۔

"یہ پھول تم میرے لیے ہی لائی ہو یا واپسی پر مسٹر پارکر کو پیش کرنے کا ارادہ ہے۔"

ایمان مسکرا دی۔

"نہیں۔۔۔۔ یہ پھول تمھارے ہی لیے ہیں۔۔۔۔ لیکن یہ مَیں تمھیں آج نہیں دوں گی۔۔۔۔ یہ اس دن کے لیے ہیں جب میں اسی ائیر پورٹ پر اسی جگہ تمھاری واپسی پر تمھیں لینے آؤں گی۔ چاہے اس پل کے آنے میں کتنی ہی صدیاں کیوں نہ بیت جائیں۔ مَیں اُس پل کا انتظار کروں گی۔ اور جب تم واپس آؤ گے تو تب مَیں یہ گلدستہ تمھیں دوں گی

----اور دیکھ لینا----تب بھی یہ پھول میرے انتظار کی طرح تازہ ہوں گے----یہ کلیاں کبھی نہیں مرجھائیں گی----کبھی نہیں۔"

ایمان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ جدائی کا زہر پھر سے اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ شاید محبت کی تخلیق ہی جُدائی کے لیے---جدائی کے باعث ہوئی ہوگی---جُدائی نہ ہوتی تو شاید محبت بھی وجود میں نہ آتی---جیسے بندگی نہ ہوتی---تو بندہ بھی، کبھی جنم نہ لیتا؟"

ایمان کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ اندر سے اَب باقاعدہ بورڈنگ لیڈی میرا نام پکارنے لگی تھی۔ ایمان نے نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔

"جا رہے ہو---؟"

"اُس کے اس انداز پر میرا دل جیسے ڈوب سا گیا۔"

"نہیں---مَیں ہمیشہ تمھارے ساتھ ہوں---تمھارے بہت قریب---"

مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بال بکھیر دیے۔ ایمان ہلکے سے مسکرا دی۔ پھر مَیں نے پلٹ کر اس کی جانب نہیں دیکھا اور تیزی سے بورڈنگ لاؤنج میں داخل ہوگیا۔ گہرے رنگ کا کالا چشمہ اس وقت بھی میرے بہت کام آیا۔ جسے مَیں نے عجلت میں اپنی آنکھوں پر پہن لیا۔

"مجھے بارشوں میں چلنا اچھا لگتا ہے کیونکہ ایسے میں لوگ میرے آنسو---"

مَیں نے دُور جا کر پلٹ کر آخری مرتبہ دیکھا۔ سب سے آگے شیشے کی دیوار کے پاس ایمان، کامران پھر ربیکا، مسز آئزک، پارکر، جم، ڈیوڈ، ٹینا اور پھر جانے کون کون کھڑا میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا یہ لوگ میرے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔ کون کہتا ہے مَیں یہاں اکیلا تھا۔ کون کہتا ہے مَیں خالی ہاتھ لندن سے واپس جا رہا تھا۔ مَیں نے یہاں کا ایک ایک رشتہ دُنیا جہاں کی دولت سے مہنگا پایا تھا۔ آج تو مَیں خود کو دُنیا کا سب سے امیر شخص محسوس کر رہا تھا۔

آخری مرتبہ پلٹنے سے پہلے مَیں نے ان سب کی جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ایمان کی آنکھوں سے ٹپکتے دو آنسو میں یہاں سے بھی کھڑے ہو کر اپنے دل کی زمین پر ٹپکتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر مَیں پلٹا اور مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔ جہاز نے جلد ہی ٹیک

آف کر لیا۔ مَیں جہاز کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھا نیچے بھیگتے ہُوئے لندن کو دھند میں تحلیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جہاز کی کھڑکی پر بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ برس کر اس کی دھندلی اسکرین پر راستے سے بناتی ہوئی نیچے خلاؤں میں کہاں غائب ہو جاتی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے چھ مہینے قبل جب مَیں لندن پہنچا تھا اُس دن بھی ایسی ہی بارش ہو رہی تھی اور آج جب میں نے اس شہر کو الوداع کہنا تھا تب بھی بارش میری ساتھی تھی۔

"یہ بارشیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں، کبھی تو ساری عمر بھی موسلا دھار برستی رہیں، تب بھی انسان کا اندر بھگو نہیں پاتیں، اور کبھی ہر پل ہمارے من کو جل تھل کیے رکھتی ہیں۔ لیکن باہر والوں کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔"

مَیں نے آخری مرتبہ سفید دھوئیں جیسی دھند میں غائب ہوتے لندن کو دیکھا اور پھر تھک کر اپنی آنکھیں موند لیں---جانے کیوں اس لمحے مجھے اپنی اک پسندیدہ نظم کے چند بول بے تحاشا یاد آ رہے تھے۔

"مَیں نے پوچھا کیسے ہو؟
بدلے ہو یا ویسے ہو؟
روپ وہی انداز وہی
یا پھر اس میں کوئی کمی؟
ہجر کا کچھ احساس تو ہوگا
کوئی تمھارے پاس تو ہوگا؟
مَیں بچھڑا یہ مجبوری تھی
کب منظور مجھے دُوری تھی
ساتھ ہمارا کب چھوٹا ہے
رُوح کا رشتہ کب ٹوٹا ہے
آنکھ سے جو آنسو بہتے ہیں
تم کو خبر ہے کیا کہتے ہیں

مَیں نے کہا آواز تمھاری
آج بھی ہے ہمراز ہماری
پھول وفا کے کِھل جائیں گے
اِک دن ہم پھر مل جائیں گے"

☆A☆S☆I☆F☆